مقالاتِ محمد علی

حصّہ دُوم

از

رئیس احمد جعفری

اِدارہ اشاعتِ اُردو
حیدرآباد دکن
قیمت تین روپیہ بارہ آنہ

تعداد طبع ایک ہزار

دسمبر ۱۹۴۳ء

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس الیکٹرکل پرنٹرز و پبلیشرز حیدرآباد دکن

مقالاتِ محمد علی

حصّہ دوم

در جہاں خورشید نو زائیدہ ام — رسم و آئینِ فلک نادیدہ ام

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست — یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست

نا امید ہستم ز یاران قدیم — طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نغمۂ من از جہانِ دیگر است — ایں جرس را کاروانِ دیگر است

برقہا خوابیدہ در جانِ من است — کوہ و صحرا بابِ جولانِ من است

ہیچ کس رازے کہ من گفتم نہ گفت

ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نہ سفت

(اقبال)

فہرست مضامین

ریاستی ہند

نابھ کا بدقسمت مہاراجہ ۱۹

مہاراجہ نابھ پر ایک نیا ظلم ۳۲

مہارانی نابھ کا انتقال ۴۰

ڈاکٹر کیچلو کا اخراج ۵۳

سامراج دشمنی

ایشیاٹک بل ۶۷

برطانیہ کے سامراجی تعلقات ۸۹

چین اور ہندوستان ۹۸

گاندھی جی کانگریس اور مسلمان

واقعہ کوہاٹ ۱۰۵

ہندو مسلم تعلقات اور خلافت کا مسلک ۱۳۷

یوپی پولیٹیکل کانفرنس ۱۴۷

کانگریس کے سابق صدر ۱۷۲

کانگریس کی تعمیر میں مسلمانوں کا حصہ ۱۷۷

سیاسیات بین الملی

مسئلہ نیابت ۱۸۷

قول حق ۲۰۸

شخصیات

بی اماں ۲۲۸

سید رشید رضا ۲۳۳

فعل فیصل ۲۵۳

غازی امان اللہ خاں ۲۶۵

فکر و نظر

تلخ تجربے ۲۸۷

اسمبلی میں ایک حادثہ ۲۹۹

قائل

جعفری صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ آج مقالات محمد علی کا حصہ دوم آپ کی خدمت میں ادارہ اشاعت اردو کیجانب سے پیش ہے۔ اگر توفیق ایزدی شامل رہی تو جلد ہی ہم حصہ سوم و چہارم بھی پیش خدمت کر سکیں گے۔

محمد علی اپنے دور کا یکتا سیاستدان تھا۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اپنے دور کی تاریخ کا بڑا حصہ وہ خود قلمبند کر گیا۔ اور یہ مسلمان قوم کی بدقسمتی تھی کہ وہ ابتک پورے طور پر ان جواہر ریزوں سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ ادارہ اشاعت اردو کو فخر ہے کہ اس نے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی۔ محمد علی کے کارنامے رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔ وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔

ضرورت تھی کہ ان کارناموں کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لئے خود محمد علی کی لکھی ہوئی تاریخ بھی اگر تمام و کمال نہیں تو جستہ جستہ پیش کی جائے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مقالات محمد علی کی اشاعت کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ مقالات کے مرتب اور سیرت محمد علی کے مصنف رئیس احمد جعفری کی زیر تصنیف کتاب "حیات شوکت علی" بھی شایع کریں۔

محمد اقبال سلیم گاہندری

محمد علی

نئے فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کا بانی

رسالت مآبؐ کے دنیا سے پردہ فرماتے ہی مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ میں ضبطِ اخبار و آثار کا خیال پیدا ہوا جب تک خلافت راشدہ کا دور رہا راویوں کی جرح و تعدیل خالص اصلاحی نقطہ نظر سے ہوتی رہی، صرف وہی حدیثیں شایع و ذائع ہو سکیں جو خلیفۂ وقت اور امیر المومنین اور اسکے مشیران با تدبیر کی محک اور معیار پر پوری اترتی تھیں۔

لیکن اموی اور عباسی دور میں اخبار رسول کو بھی لوگوں نے آلۂ کار بنانے کی کوشش کی۔ ان حدیثوں کی اشاعت بالواسطہ یا بلا واسطہ روکی گئی جن میں اہل بیت اطہار کے فضائل و مناقب مذکور تھے۔ ان حدیثوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جن سے اموی اور عباسی سلاطین کے فضائل و مناقب اور محامد و محاسن آشکار ہوتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ صحیح اور صحیح تر حدیثوں کو چھوڑ کر غلط اور ایجاد بندہ حدیثوں کی ترویج شروع ہو گئی۔

اسلام میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہا ہے جو ملوک و سلاطین کے اثرات سے آزاد رہا ہے۔ جسکی نگاہ میں تاج خسروی اور دربار سلطانی کی کوئی وقعت

نہ تھی جو سیم وزر کے انباروں کو پائے استحقار سے ٹھکراتا تھا۔ جو جاہ و دولت کی ہوس سے آزاد تھا۔ جسکے پیش نظر ذاتی سربلندیاں کبھی نہیں رہیں۔ جو بے مایہ تھا، تباہ حال تھا، فاقہ مست تھا۔ لیکن حق اور صداقت کو اس نے اپنا طرۂ امتیاز بنائے رکھا۔ وہ کبھی زرداروں اور تونگروں کے "عتبات عالیات" پر جبیں سا نہیں ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے مصلحت اور موقع دیکھ کر حق کو چھپایا ہو۔ حالات اور ماحول کا اندازہ کر کے باطل سے مصالحت کی ہو۔ یہی وہ گروہ تھا جو فوراً میدان میں آیا اور اس نے راویان حدیث پر جرح و تعدیل کا کام شروع کر دیا۔ اور فن اسماء الرجال کی ابتدا کر دی۔ اس جماعت نے ہر اس شخص کو پرکھا اور جانچا جس نے زندگی بھر میں ایک دفعہ بھی کوئی حدیث روایت کی تھی۔ پھر اپنی پرکھ اور جانچ میں جیسا پایا بے کم و کاست اسے ظاہر کر دیا۔ ایک آدمی متقی ہے پرہیزگار ہے۔ عابد شب زندہ دار ہے صائم الدہر ہے۔ لیکن اسکا حافظہ کمزور ہے، اسکی حدیث قبول کرنے سے احتیاط کی۔ ایک دوسرا شخص ہے جو عقائد کے لحاظ سے گمراہ ہے۔ خیالات کے اعتبار سے اصلاح طلب ہے لیکن کبھی جھوٹ نہیں بولتا حافظہ کا یہ عالم ہے کہ جو سنتا ہے یاد رکھتا ہے اسکی روایت کو وہی مرتبہ دیا جس کی وہ مستحق تھی۔

آپ تذکرۃ الحفاظ ملاحظہ فرمائیے جس میں راویان حدیث کا تذکرہ یعنی سوانح حیات موجود ہے۔ آپ میزان الاعتدال کا مطالعہ فرمائیے جو راویان حدیث کی انسائکلوپیڈیا ہے۔ آپ امام بخاری کی تاریخ صغیر اور تاریخ کبیر کی ورق گردانی کیجئے۔ آپ کو معلوم ہوگا فن جرح و تعدیل کے اماموں اور فن اسماء الرجال

کی تدوین کرنے والوں نے حق و صداقت، غیر جانبداری اور بے لوثی کی وہ مثال قائم کی ہے۔ عہد حاضرہ میں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے آپ کو ایسے رواۃ ملیں گے جنکی جلالت علم فضل و کمال۔ زہد و تقدس سے آپ مرعوب ہیں لیکن اسماء الرجال کے نکتہ شناسوں کے ہاں انکی روایت کی کوئی اہمیت نہیں۔ پھر آپ کو ایسے راویان اخبار بھی دکھائی دیں گے جن کے عقیدہ پر عمل پر، خیالات پر۔ اسماء الرجال کا فن کار نکتہ چینی کرتا ہے۔ جنکی گمراہیوں کو بر سر عام بیان کرتا ہے۔ جنکی غلط روی کا پردہ فاش کرتا ہے لیکن اپنے دربار سے "ثقہ" کی سند بھی عطا فرما دی ہے۔

ایسا کیوں تھا؟ صرف اس لئے کہ یہ گروہ نہ کسی کا دوست تھا نہ دشمن، نہ حامی نہ مخالف، نہ یار غار۔ نہ اعدعدو۔ یہ صرف سچائی اور راستی کا طلب گار تھا جو اسکے معیار پر پورا اترا، اسکی تعدیل کر دی۔ جو معیار پر پورا نہیں اترا اسکو اپنی مبنی بر حق جرح سے "مجروح" کر دیا۔ وہ اسکا دوست تھا جو اسکے معیار پر پورا اترتا تھا۔ اسکا مخالف تھا جو اسکے معیار سے گرا ہوا تھا اس نے کبھی شخصیت پر غور نہیں کیا۔ ہمیشہ ماہیت، کیفیت اور حقیقت اپنے سامنے رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسماء الرجال کی کتابوں میں بعض وہ بزرگ مجروح نظر آتے ہیں جنکی جلالت کے عوام و خواص حتیٰ کہ خود واضعان اسماء الرجال معترف تھے اور بعض وہ اصحاب تعدیل سے نوازے جاتے ہیں جنکی عقیدہ کے لحاظ سے دینی غلط روی ایک عام حقیقت ہے اور جسے خود واضعان اسماء الرجال بھی جانتے تھے ان کے پیش نظر یہ تھا کہ حدیث رسول صلعم جو ہم تک

پہونچے وہ شرائط کے مطابق ہو۔ جو اسکی صحت کو غیر مشکوک کر دے۔ اسی لئے یہ
ایک لمحہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ کون مجروح ہو رہا ہے اور کس کی تعدیل ہو رہی ہے

من و تو گر فنا شدیم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

بڑے سے بڑا شخص مجروح ہو جائے۔ بڑے سے بڑا شخص عدل کے
معیار پر پورا اترتا ہو، وہ بے رو رعایت اسے ظاہر کر دیں گے اب یہ حدیث و
خبر سے دلچسپی رکھنے والے کا کام ہے کہ اسماء الرجال کی جرح و تعدیل کو سامنے
رکھ کر حدیثوں کو جانچے اور اسی معیار پر ان کے ردّ و قبول کا فیصلہ کرے۔
یہی حال محمد علی کا تھا!

محمد علی دین کا فدائی، محمدؐ کا پرستار، علیؑ کا جاں نثار اور ملّتِ اسلامیہ
کا خدمت گزار تھا۔ دین و ملت کی خدمت کے راستہ میں جسے کھرا پاتا تھا
اسکا اعتراف کرتا تھا جس میں کوتاہی دیکھتا تھا اُسے بے نقاب کرتا تھا۔
جس طرح علماء اسماء الرجال میں سے ہر عالم کی رائے ہر راوی کے بارے میں
قابل قبول اور قابل احتجاج و استناد نہیں ہے اسی طرح اسلامی ہند کی ہر
شخصیت کے بارے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ محمد علی کی رائے حرف آخر
کی حیثیت رکھتی ہو لیکن جس طرح علمائے اسماء الرجال کی حسن نیت پر کوئی
شبہ نہیں کیا جا سکتا، بالکل اسی طرح محمد علی کی جرح و تعدیل تمام تر دیانت
اور سچائی پر (ان کے نقطۂ نظر سے) مبنی تھی۔ آپ انکی رائے، ان کا فیصلہ انکا
معیار۔ انکی جرح۔ انکی تعدیل قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ آپ کو اس کا پورا

حق ہے لیکن آپ کو یہ ہرگز حق نہیں ہے کہ آپ محمد علی کی نیت پر شبہ کریں!
اس نے اپنی زندگی میں اس کمزوری کا مظاہرہ کبھی ہونے ہی نہیں دیا۔
محمد علی گاندھی جی کو "باپو"، کہا کرتا تھا۔ شوکت علی کو اسی طرح چاہتا تھا جسطرح مجنوں لیلی کو۔ عبدالماجد دریابادی سے اسکی دوستی شیفتگی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ مولینا سید سلیمان ندوی کی جلالت شان کا وہ پورا پورا معترف تھا۔ مولینا حسین احمد اسکی نظر میں فرشتہ تھے، مفتی کفایت اللہ، اور مولینا احمد سعید کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اس نے کبھی انکار نہیں کیا، علامہ اقبال کا وہ شیدائی تھا۔ اقبال کا شعر اسکے سازیات پر مضراب کا کام کرتا تھا۔ وہ اسے اپنا استاد، مرشد، رہنما۔ سب کچھ مانتا تھا لیکن تعلقات کی ان گراں باریوں کے باوجود محبت، ربط۔ خلوص اور انس کی فراوانی کے باوجود جب ضرورت ہوئی اس نے اپنے بزرگوں دوستوں اور ساتھیوں کو "مجروح" کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ علانیہ بھی اور نجی صحبتوں میں بھی ہمدرد اور کامریڈ کے کالموں میں بھی اور پبلک پلیٹ فارم پر بھی گاندھی جی پر اس نے ایک سے زائد بار اس زمانہ میں جرح کی جب وہ انہیں ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی شوکت علی کو وہ ہمیشہ اپنا محبوب بنائے رہا۔ لیکن اس محبوب پر بھی اس کے ترکش سے جرح کے تیر چلے۔ عبدالماجد دریابادی کا شمار ہمیشہ اسکے مخلص ترین اور عزیز ترین دوستوں میں رہا لیکن جرح کا وار ان پر بھی ہوا۔ مولینا سید سلیمان ندوی پر محبت اور تعلق خاطر کے باوجود اس نے سخت و شدید جرح کی مولینا

احمد سعید مولینا عبدالحلیم صدیقی رفیق کار تھے معتمد علیہ تھے لیکن محمد علی کی جرح سے یہ بھی نہ بچ سکے۔ اقبال کے ایک ایک شعر کو محمد علی پڑھتا تھا اور روتا تھا۔ روتا تھا اور رُلاتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا کہ اسکے نقطۂ نظر سے اقبال نے کوئی چوک کی ہو اور محمد علی نے اُسے معاف کر دیا ہو۔

ڈاکٹر کچلو سے بلگام خلافت کانفرنس کے بعد جو بگڑی تو پھر کبھی نہیں بنی۔ مولینا ظفر علی خاں سے تو شاید ہی کبھی بنی ہو۔ مسٹر جناح سے ہمیشہ نوک جھونک ہوتی رہی مولینا ابو الکلام سے بھی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ موتی لال کی شخصیت اور محمد علی کی طبیعت میں برابر تصادم ہوتا رہا۔ مالوی جی کی مہا سبھائیت محمد علی کو ہمیشہ کھٹکتی رہی لیکن جب کبھی وقت آیا تو محمد علی نے ذاتی ناخوشگواریوں کو ملی معاملات پر ترجیح نہیں دی انہیں مخالفوں کو اس نے نوازا ان کی تائید کی۔ ان کا ساتھ دیا متعدد پہلوؤں سے جن پر وہ جرح کرتا رہا تھا۔ انہی کی بعض پہلوؤں سے اس نے تعدیل بھی کی اور ہرگز نہ سوچا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ مخالفین کس طرح اپنا برجستہ "مطلع عرض" کریں گے اور پھر ایک غیر طرحی مشاعرہ کا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔

لالہ لاجپت رائے جب تک زندہ رہے محمد علی کی مخالفت کے لئے وقف رہے ان کا انگریزی اخبار "پیپل" ہمیشہ محمد علی کے لئے نئی نئی گالیاں ایجاد کرتا رہا۔ کامریڈ میں جب محمد علی نے اپنی مالی کمزوری کا ذکر کیا اور اپنی علالت کا رونا رویا تو ہمدرد اخباروں نے ہمدردانہ مضامین لکھے مخالف اخبارات خاموش رہے۔ ذمہ دار غیر مسلم معاصرین میں پیپل وہ تنہا اخبار تھا جس نے

بڑی شقاوت سے محمد علی کی بیماری اور فلاکت کا مذاق اُڑایا۔ انکی غریبی اور مفلسی پر قہقہہ لگایا۔ ان کے مضحکہ خیز کارٹون بنائے اور چھاپے۔ محمد علی نے بھی لالہ جی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ لیکن اس سخت و شدید ناقابل مفاہمت اور گہری مخالفت کے باوجود ۱۹۲۸ء میں یورپ سے جب محمد علی واپس آئے اور انہیں اطلاع ملی کہ سائمن کمیشن کے احتجاجی مظاہرہ میں پولیس کی لاٹھیاں کھاکر لالہ لاجپت رائے بیمار ہوئے اور کچھ روز بعد وفات پا گئے۔ تو انہوں نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ انکی محبّ وطن کا اعتراف کیا۔ اور انکی موت کو "قابل رشک" قرار دیا۔ اس طرح کے متعدد واقعات ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی موافقت اور مخالفت میں ممکن ہے کبھی کبھی حد سے باہر نکل جاتے ہوں۔ لیکن جرح و تعدیل میں وہ کبھی حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے بدترین دشمن کی خوبیوں کا اعتراف ———— برملا اعتراف ———— کرنے میں کبھی نہیں ھچکچائے۔ وہ اپنے بہترین دوستوں کی کمزوریوں کو فاش کرنے میں کبھی نہیں جھجکے! یہی ان کا فن جرح و تعدیل تھا۔ یہی فن اسماء الرجال ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اپنے دور میں اس فن کے موجد اور خاتم محمد علی نہیں تھے۔

محمد علی ایک جنگجو سپاہی تھا۔ ایک پرجوش مجاہد تھا۔ ایک بلند پرواز انشا پرداز تھا۔ ایک بلند آہنگ خطیب تھا۔ ایک بہترین صحافی تھا۔

یاروں کی مجلس میں یار شاطر، اغیار کے مجمع میں خوش گفتار مخالف، یہی وجہ تھی کہ دوست بھی اس سے ملکر خوش ہوتے تھے اور مخالف بھی۔ وہ جہاں پہنچ جاتا چھا جاتا تھا اُسے دیکھ کر دوستوں کے چہرے وفور مسرت سے کھل جاتے تھے۔ دشمنوں کے چہرے تمازت آفتاب سے تمتما جاتے تھے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اسکی گل افشانیٔ گفتار کو اسی اشتیاق سے دشمن بھی سننے لگتے تھے جو دوستوں کا حصہ تھی۔

محمد علی کی ساری زندگی آئینہ کی طرح صاف و شفاف تھی کہیں کسی داغ دھبے، چھائیں، کا نشان بھی نہ تھا اسی آئینہ میں وہ دوسروں کو دیکھتا تھا۔ جس کا چہرہ روشن نظر آیا اسکی تنویر محمد علی کا ورد وظیفہ بنجاتی تھی۔ جسکے روئے زیبا پر چھائیں نظر آئی، یا دھبہ دکھائی دیا، محمد علی کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اسے دور کر دیا جائے اور دور نہ ہو تو اسکا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہ کیا جائے۔

محمد علی نہ کسی کا دوست تھا نہ دشمن۔ موافق تھا نہ مخالف اسکی دوستی اور دشمنی اللہ کے لئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسکے بدترین دشمن اسکے بہترین دوست بن گئے۔ اور بہترین دوست اسکے بدترین دشمن بن گئے۔ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بنانے میں اسے کبھی تامل نہ ہوتا تھا۔ وہ صحیح معنی میں "نان پارٹی" آدمی تھا۔ اسکی کوئی پارٹی نہیں تھی وہ حق کا ساتھی تھا اور حق کو جس جماعت کے ساتھ وابستہ دیکھتا تھا اسی کا ہو رہتا تھا۔ لوگ حق کے ساتھ چلتے ہیں۔ حق کسی کے

ساتھ نہیں چلتا۔ جو لوگ حق کے ساتھ چلتے تھے محمد علی ان کے ساتھ چلنے لگتا تھا۔ جو حق سے روگرداں ہو جاتے تھے محمد علی ان کا دشمن بن جاتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اسکے چہیتے دوست تھے لیکن انہیں اس نے اپنا مخالف بنالیا۔

سر علی محمد خاں مہاراجہ محمود آباد اسکے مربیوں میں تھے۔ لیکن ان سے لڑ پڑا۔ آغاخان نے عرصہ تک کامریڈ کی سرپرستی کی لیکن ان پر اس نے وار کیا۔ اسلئے نہیں کہ وہ غدار و محسن کش تھا۔ صرف اسلئے کہ وہ حق کے مقابلہ میں کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اسکے لغت میں مداہنت، اور مسامحت کے الفاظ ہی نہیں تھے۔ وہ اسکا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ خود جسے حق سمجھتا ہو اسے چھوڑ دے۔ اسکے مذہب میں یہ گناہ کبیرہ تھا اور جان بوجھ کر وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کبھی نہیں ہوا۔ وہ زندگی بھر حق کے لئے چوٹ کھا کھا کر دوسروں سے لڑتا رہا۔ آج وہ جنّت میں ہے اور جب حشر بپا ہوگا تو اپنا یہ شعر وہ پڑھ رہا ہوگا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

رئیس احمد جعفری
دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء

ریاست ہند

فہرست مضامین

۱	نابھ کا بدقسمت مہاراجہ	۱۹
۲	مہاراجہ نابھ پر ایک نیا ظلم	۳۲
۳	مہارانی نابھ کا انتقال	۴۰
۴	ڈاکٹر کچلو کا اندور سے اخراج	۵۳

نابھ کا بدقسمت مہاراجہ

(ہمدرد۔ ۱۱ر فروری ۱۹۲۵ء)

مہاراجہ نابھ، ایک آزاد خیال، والی ریاست تھے۔ اسی جرم میں انہیں گدّی سے دست بردار ہونا پڑا

محمد علی ریاستوں، اور والیان ریاست سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے نہ ان سے کچھ زیادہ انہیں حسن ظن تھا لیکن اس معاملہ میں انہوں نے پبلک طور پر مہاراجہ کا ساتھ دیا، صرف اس لئے کہ وہ ایک غیور، اور خود دار والی ریاست کی قدر کرتے تھے۔

اس مضمون سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ والیان ریاست اپنے تمام عہدناموں کے باوجود، حکومت کے آگے کس طرح بے بس ہو جاتے ہیں۔

مؤلف)

آج ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا کہ نابھ کے مہاراجہ نے اپنی گدّی چھوڑ دی حکومت کی طرف سے اس کا اعلان کر دیا گیا کہ وہ گدی سے دست بردار ہو گئے۔ حکومت کہتی ہے

کہ وہ اپنی خواہش سے دست بردار ہوئے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں زبردستی دست بردار ہونا پڑا۔ بہرحال اس وقت ہم اس قصہ کو ازسرنو شروع کرنا نہیں چاہتے۔ اسوقت تو ہم مہاراجہ صاحب کے ایک ذاتی معاملہ پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ جنکی اشاعت کی ذمہ داری خود مہاراجہ صاحب کی تحریک پر لی ہے۔

مہاراجہ صاحب نابھہ، مہاراجہ بھی ہیں اور ہز ہائنس بھی، لیکن آج نابھہ میں ایک انگریز افسر نظم ونسق کا ذمہ دار ہے، اور مہاراجہ صاحب ڈیرہ دون میں مقیم ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ آج مہاراجہ صاحب کسی معنی میں بھی مہاراجہ نہیں ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مصائب و آلام، افکار اور پریشانیوں کے آج بھی راجہ نہیں بلکہ مہاراجہ ہیں۔ دوسری پریشانیاں کیا کم تھیں کہ ان کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ اور وہ پریشانی خود اپنی لڑکی کی شادی کے متعلق ہے جو انکی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔

یہ واقعہ نہ صرف حیرت انگیز ہے بلکہ عبرت انگیز بھی ہے، یہ شادی جس طرح سے ہوئی اس سے معلوم ہو گیا کہ مہاراجہ صاحب کس طرح ان معمولی حقوق سے بھی محروم ہو گئے جو ایک معمولی باپ کو اپنی اولاد پر حاصل ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم یہ بیان کئے دیتے ہیں کہ ہم کو ان واقعات کی کیونکر اطلاع ہوئی اور ہم نے اس سلسلہ میں کیا کیا۔

کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ مہاراجہ صاحب کا ایک آدمی ہمارے

پاس آیا۔ اور اس نے ہمیں چند تار اشاعت کے لئے دیئے۔

متعدد وجوہ سے ہم دیسی ریاستوں اور والیانِ ریاست کے معاملات میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں ہمیں اور بھی زیادہ تامل تھا اس لئے کہ یہ ایک نہایت نازک معاملہ تھا اور اس کا تعلق نہ صرف مہاراجہ صاحب نابھہ اور حکومت سے تھا۔ بلکہ اسکا تعلق دو خواتین سے بھی تھا۔ یعنی بڑی مہارانی نابھہ، مہاراجہ نابھہ کی دختر، اس کے بعد اسکا تعلق مہاراجہ کلسیہ سے ہے جنکی شادی مہاراجہ نابھہ کی لڑکی سے ہو گئی۔ لیکن اسکے باوجود بحیثیت اخبار نویس کے ہمارا یہ فرض ہو گیا کہ اس معاملہ کو نظر انداز نہ کریں۔

ایک مہاراجہ جس کے سر پر رنج و الم کے کانٹوں کا تاج رکھا ہوا ہے جب اسکی طرف سے ہم سے خواہش کی گئی، تو ہمیں یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ ہمارے دل نے انکی ہمنوائی کی۔ اور ہم نے چاہا کہ جس طرح ممکن ہو اس معاملہ میں کوئی بہتر صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن اسکے باوجود ہم نے صرف جذبات کی حکومت قبول نہیں کی۔ اور ہم نے پیامبر سے کہا کہ جو کاغذات ہمیں دئے گئے ہیں ان پر مہاراجہ صاحب کی تصدیق اور دستخط ثبت ہونے چاہئیں۔ اس طرح ہمیں اس معاملہ پر غور و خوض کرنیکا مزید موقع بہم پہنچ گیا۔

پیامبر موٹر میں دہرہ دون گیا۔ اور اسیطرح واپس آیا تو وہ دو اور تار لایا۔ جو ہم کل ہمدرد میں شایع کر چکے ہیں۔

ہز ہائنس نے اپنی تحریر میں لکھا ہے کہ بعض باتیں ممکن ہے کہ "لغو" معلوم ہوں، بیشک یہ سچ ہے کہ بہت سی چیزیں بظاہر لغو معلوم ہوتی ہیں لیکن جہاں تک

راجاؤں، اور بادشاہوں کا تعلق ہے، بہت سی لغو باتیں وقوع پذیر ہو جاتی
ہیں۔ لیکن یہ بھی ہمیں بتا دینا چاہیئے کہ جب ہم یہ کہہ رہے ہیں تو ہم مہاراجہ صاحب
کلسیہ پر کوئی حملہ نہیں کرنا چاہتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کے متعلق تو ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ پہلے دن جب
مہاراجہ صاحب کا یہ پیامبر ہمارے پاس آیا تو ہم نے اس سے یہ کہہ دیا تھا کہ
ہم اس حق کو اپنے لئے محفوظ رکھیں گے کہ ہم اس معاملہ میں کیونکر قدم اٹھائیں
اور غالباً ہم سارے معاملہ کو ہز اکسلنسی وائسرائے کے علم میں لائیں گے۔ اور کوشش
کریں گے کہ یہ معاملہ شایع ہوئے بغیر آپس میں خوش اسلوبی سے طے ہو جائے۔

جب ہز ہائینس کا پیامبر شادی ہونے کی صبح سے ایک دن قبل صبح کو ہمارے
پاس واپس آیا، تو اس نے ہم سے کہا کہ مہاراجہ کو اس طریقہ کار پر بالکل اعتراض نہیں
ہے۔ معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے، اور اس بات کا خیال کرکے کہ چند گھنٹوں کے
اندر وائسرائے بیکانیر روانہ ہونے والے ہیں، ہم نے فوراً وائسرائے کے پرائیویٹ
سکرٹری کو ٹیلیفون کیا۔ اور ان سے ملاقات کا وقت مقرر کیا۔

سر جوفری ڈی۔ مونٹ مرنس، چھٹی پر گئے ہوئے ہیں، اور مسٹر میگ انکی
جگہ کام کر رہے ہیں۔ جب ہم ان سے ملے تو وہ نہایت اخلاق سے پیش آئے اور
انہوں نے تاروں کو نہایت غور سے پڑھا۔ جن کا تبادلہ، مہاراجہ صاحب نابہ اور
دیوان ٹیک چند کمشنر انبالہ کے درمیان ہوا ہے۔

دیوان ٹیک چند کے متعلق ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ وہ انبالہ کے کمشنر
ہونے کی حیثیت سے ریاست کلسیہ کے پولٹیکل ایجنٹ بھی ہیں، اسکے بعد مسٹر

ہیگ نے تھوڑی دیر ہم سے صورتِ حالات پر گفتگو کی۔ پھر آپ نے ہم سے کہا کہ ہم حکومتِ ہند کے پولیٹیکل سکریٹری سے ملیں جن کا یہ فرض ہے کہ وہ اس قسم کے معاملہ کو وایسرائے کے علم میں لائیں۔ چنانچہ ہم اُن سے ملے۔ آنریبل لفٹنٹ کرنل پیٹرسن جو اسوقت کونسل آف اسٹیٹ کے جلسے میں شریک تھے، اپنے ہمراہ دیوان ٹیک چند کو بھی لائے۔ اور ہم سے اس معاملہ پر گفتگو ہوئی۔ ہم اس گفتگو کو شایع کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اس پر اکتفا کریں گے کہ دیوان ٹیک چند ہمیں اس امر میں مطمئن نہ کر سکے کہ اس معاملہ میں ان کا دخل دینا کسی طرح بھی ضروری تھا، اور انکی مداخلت بالکل غیر سرکاری اور نجی تھی

ہم نے ان سے کہا کہ وہ اس معاملہ میں اپنا بیان دیں۔ پہلے تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس پر غور کروں گا۔ اسکے بعد انہوں نے انکار کر دیا۔ جب آخری مرتبہ انہوں نے ہماری اس دعوت کو مسترد کیا ہے تو پھر اُن سے ٹیلیفون پر کافی گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف اس سے پریشان نہیں ہیں کہ ہم اس مسئلہ پر کیا رائے زنی کریں گے، بلکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ کچھ شایع بھی نہ ہو لیکن خیر اگر کچھ شایع ہونا ضروری ہے تو صرف تار شایع ہو جائیں۔ وہ آخر تک بیان دینے سے انکاری ہی رہے۔ اسوقت بھی جب ان کو یہ بتا دیا گیا کہ اگر آپ بیان نہ دیں گے تو پبلک کا فیصلہ اور خود ہماری رائے زنی ممکن ہے کہ ان کے خلاف پڑے بہرحال آخر میں وہ یہ کہنے لگے کہ اگر آپ نے میری مداخلت پر مخالفانہ رائے زنی کی تو میں بیان شایع کروں گا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان ٹیک چند ازالۂ مرض کی بہ نسبت مرض کو

روکنے پر کم یقین رکھتے ہیں۔

ہم ان کے اس رویہ پر نظر ڈالنے سے قبل یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ کرنل پیٹرسن نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اس معاملہ کے فائل دیکھنے کے بعد میں اس معاملہ کو وائسرائے کے سامنے پیش کر دونگا۔ بشرطیکہ انکی روانگی سے قبل اسکا وقت مل گیا لیکن بعد میں انہوں نے اطلاع دی کہ حکومت ہند کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس معاملہ میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی۔

ہم ان تمام واقعات سے جو کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ جسکی تصدیق ان تاروں سے بھی ہوتی ہے جو ہم نے شایع کئے ہیں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انبالہ کے کمشنر مارچ ۱۹۲۳ء سے جبکہ گدی سے دست بردار ہونے، یا اُتارے جانے سے قبل مہاراجہ نابھہ دہلی میں تھے، اس رشتہ کے قایم کرنے کی تگ و دو میں تھے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حکومت ہند یا وائسرائے نے نابھہ کے بدقسمت راجہ کے اس قسم کے بالکل خانگی معاملات میں کسی قسم کی شہ دی ہے یا نہیں۔ لیکن شاہ انگلستان کے قایم مقام اور کمشنر انبالہ کے درمیان ایک وسیع سرکاری تعلق ہے۔ اس لئے ہم دیوان صاحب کے اس ارشاد کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ شادی جو جمعہ کی صبح کو دہلی میں ہوئی اسکا انتظام نج کے طور پر نابھہ کی بڑی مہارانی اور رانی کلسیہ نے کیا تھا۔ اور اس میں نہ تو سرکاری ہاتھ تھے اور نہ سرکاری مدد، اور نہ کسی قسم کی سرکاری مداخلت کا اس میں شائبہ تھا۔

جہانتک ہم کو علم ہے یہ صحیح ہے کہ گورنر پنجاب نے عدم شرکت کے لئے پہلے سے طے شدہ مصروفیتوں کا عذر کیا۔ اور اسوقت تک اس رشتہ کے سلسلہ کی کسی

تقریب میں شرکت نہیں کی اور نہ غالباً وہ کلسیہ میں جو تقریبات ہونیوالی ہیں ان میں شرکت کریں گے۔ ہمکو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ منتظم نابھہ نے سخت احکام جاری کر دیئے ہیں کہ نابھہ کا کوئی ملازم اس تقریب میں شریک نہ ہو۔

سیاسی زبان میں حکومت کا رویہ اس معاملہ میں بالکل صحیح ہے اس میں کہیں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔ سوائے اس ایک سقم کے یعنی کمشنر انبالہ اور پولٹیکل ایجنٹ کلسیہ کی جدوجہد جس کے متعلق وہ کوئی بیان بھی نہیں دیتے۔

لیکن اس میں تو ذرہ بھی شک نہیں کہ مہاراجہ صاحب نابھہ نہایت ہوشیاری سے دیوان ٹیک چند کو اپنا "مہربان اور دوست" کہتے ہیں، معزول یا سبکدوش مہاراجہ جس ادب و احترام کو ایک کمشنر تک کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اسکے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ اس معاملہ میں بھی ان کے ساتھ نہایت "جابرانہ اور ظالمانہ" رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

اسوقت ہم صرف اسی قدر کہنے پر اکتفا کریں گے جس کے کہنے پر ہم مجبور ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت مہاراجہ صاحب نابھہ کی جو کچھ حالت ہے اسکو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بالکل غیر قدرتی نہیں ہے کہ وہ اس قسم کے معاملہ میں ایک سرکاری افسر کی اس مداخلت کو "جابرانہ اور ظالمانہ" قرار دیں خواہ "جابرانہ اور ظالمانہ" روش اختیار کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔ لیکن کم از کم ایک بات تو صاف ہے کہ مہاراجہ نابھہ ہرگز اسکے لئے آمادہ نہیں تھے کہ اپنی لڑکی مہاراجہ صاحب پٹیالہ کے رنڈوے داماد کو دیں۔ اور یہ یقیناً ظلم ہے کہ کوئی سرکاری افسر اس رشتہ کے سلسلہ میں ان سے شرکت کی خواہش کرے۔

دیوان ٹیک چند نے مہاراجہ نابھ کے دوسرے تار کا جواب نہیں دیا۔ اور اسکے علاوہ وہ اپنے اس تار کے متعلق جو آپ نے ۲ فروری کو مہاراجہ صاحب نابھ کو دیا تھا کوئی بیان دینے سے بھی ہچکچاتے ہیں۔ اسوقت پبلک کے پاس ان کا صرف ایک بیان ہے اور وہ تار ہے۔ اور اسوقت صرف یہی ہماری رائے زنی کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ اس تار میں دیوان صاحب فرماتے ہیں کہ انہیں مہاراجہ صاحب کے تار سے نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ مایوسی بھی ہوئی مایوسی کا یہ اظہار، اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو اس رشتہ میں کافی دلچسپی تھی۔

لیکن ہم اس پر کبھی زور نہیں دیتے بلکہ ہم اس بات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ آیا واقعی مہاراجہ نے اس رشتہ کے متعلق اپنی منظوری دی یا نہیں جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ہز ہائنیس راجہ صاحب کلسیہ نے مہاراجہ صاحب پٹیالہ کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ایسی حالت میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ مہاراجہ صاحب نابھ ان سے اپنی لڑکی کا رشتہ کرنے پر کبھی بھی آمادہ نہیں ہو سکتے تھے شادی کے لیے جس مقام کا انتخاب کیا گیا وہ بھی قابل غور ہے۔ اور مہاراجہ صاحب اپنے انکار کی تصدیق خاص اس بات سے بھی چاہتے ہیں کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ یہ شادی نہ تو کلسیہ میں ہوئی ہے اور نہ نابھ میں۔ اور اس کے بعد یہ دہرہ دون میں بھی نہیں ہوئی جہاں بڑی مہارانی خود رہیں اسوقت تک مقیم تھیں جب سے کہ مہاراجہ نابھ اپنی ریاست کو چھوڑنے کے بعد وہاں مقیم ہیں۔ بلکہ اس واقعہ کے ساتھ کہ شادی دہلی میں ہوتی ہے۔

مہاراجہ صاحب اس بیان کو شامل کرتے ہیں کہ بڑی مہارانی اور انکی لڑکی نے مہاراجہ صاحب پر یہ ظاہر کیا کہ ہم لوگ تبدیل آب و ہوا کے لیئے دہلی جا رہے ہیں۔ تو ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ شادی کے متعلق مہاراجہ صاحب کی صریح طور پر رضامندی حاصل نہیں کی گئی تھی۔

پہلے تار میں مہاراجہ صاحب صاف کہتے ہیں کہ اس شادی کو میں پسند نہیں کرتا۔ اور آپ یہ بھی بتاتے ہیں کہ دیوان ٹیک چند میرے خیالات کا پورے طور پر علم رکھتے ہیں۔

اس تار کے جواب میں دیوان صاحب یہ نہیں کہتے کہ میں نے مہاراجہ صاحب کی منظوری حاصل کر لی تھی، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ "مہارانی صاحبہ نے منظوری لے لی ہے" اور یہ بھی کہتے ہیں کہ "جب میں گزشتہ ایام میں مہاراجہ صاحب سے ملا تھا تو اس پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ عدم شرکت کے لئے علالت کا عذر کیا تھا" یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی۔ اسکے علاوہ مہاراجہ صاحب نے فوراً بذریعہ تار مطلع کیا کہ اگر میری منظوری کے متعلق کسی غلط فہمی کے ماتحت یہ شادی ہو رہی ہے تو آپ دونوں مہارانیوں کو مطلع کریں کہ نہ تو یہ شادی مجھے منظور ہے اور نہ اسے پسند کرتا ہوں۔"

ہمارے نزدیک تو اس تار کے بعد سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے، لیکن مہاراجہ صاحب اسی پر اکتفا نہیں کرتے، اور اپنے تار میں دیوان ٹیک چند کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں کہ اُن سے ملاقات کے وقت مہاراجہ صاحب نے اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ دیوان ٹیک چند نے

دہرہ دون میں اسی کا ذکر چھیڑا تو میں نے اپنے اس اعتراض کا اعادہ کیا جو میں نے ۱۹۲۳ء میں کیا تھا۔ اگر مہاراجہ صاحب کا یہ بیان صحیح ہے تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ مہاراجہ صاحب کو اس رشتہ پر اسوقت بھی اعتراض تھا۔ جب پہلی مرتبہ دیوان ٹیک چند نے اس کا ذکر ان کے سامنے کیا تھا۔ اور ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم اس سب کو دیوان صاحب کے ۲۔ فروری کے تار کی وجہ سے نظر انداز کر دیں۔

غالباً یہ کہا جائیگا جیسا کہ متعدد سرکاری افسران نے ہم سے کہا بھی ہے کہ اگر مہاراجہ صاحب نابھہ نے اس شادی کے لئے منظوری نہیں دی تھی اور وہ اس رشتہ کو ناپسند کرتے تھے تو انہوں نے ایک باپ کی حیثیت سے اس شادی کے ہونے میں رکاوٹ کیوں نہ پیدا کی۔ خیر اگر انہوں نے پہلے سے یہ نہیں کیا تھا یا نہ کر سکتے تھے، تو بھی اب سے پہلے کیوں سلسلہ جنبانی نہ کی۔ ان دونوں سوالات کا جواب آسانی سے ایک ساتھ دیا جا سکتا ہے۔

کوئی شخص جو انکی اس تحریر کو پڑھیگا جو ہم نے شایع کی ہے وہ یہی خیال کرے گا کہ دو سال تک مصائب و آلام کے پہاڑ کے نیچے دب جانے کے بعد ان میں نہ جرأت باقی ہے نہ جوش و خروش موجود ہے" اسکے علاوہ آپ کی جو برائے نام حیثیت والی ملک ہونے کی ہے اس سے بھی انکو چند دقتوں کا سامنا ہے۔ اگرچہ وہ اس کے متعلق قانونی کارروائی کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ اسے والیان ریاست اپنے وقار کے خلاف تصور کرتے ہیں اس لیئے ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ یہ قدم نہ اُٹھایا جائے۔ رہا اپیل کرنیکا مسئلہ تو اندازہ کیجیئے کہ آخر کون شخص ایسا ہے جسکو

مہاراجہ کے تلخ تجربات ہو چکے ہوں اور پھر وہ اپیل کرنے کی جرأت کرے لیکن اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ چھ ہفتہ قبل جب مہارانی اور ان کی لڑکی دہرہ دون سے آئی ہیں تو اسوقت جیسا کہ انہوں نے دیوان صاحب کو تار میں بھی لکھا ہے انکو یہ بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ تبدیل آب وہوا کے لئے دہلی جارہے ہیں۔ لیکن شادی کے منصوبے ہو چکے تھے اور مہاراجہ صاحب بے خبر تھے سب سے پہلے ان کو یہ اطلاع ۱۶ر فروری کو ہونے والی ہے۔ دیوان ٹیک چند کے اس خط سے ہوئی جس میں آپ کو شادی میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس ستم ظریفی کو دیکھئے کہ ایک سرکاری افسر اور ایک غیر آدمی، دلہن کے باپ کو شادی میں شرکت کے لئے مدعو کرتا ہے۔

اندازہ کیجئے کہ اس باپ کے دل پر جو اپنی لڑکی کی مہاراجہ صاحب کلسیہ کے ساتھ شادی کے خلاف ہے۔ اس دعوت نامہ کا کیا اثر پڑا ہوگا۔ بہر حال اس اطلاع کے ملنے پر مہاراجہ صاحب نے دعوت نامہ کا بذریعہ تار جواب دیا اور فوراً ہمارے پاس آدمی بھیجا۔ اگر مہاراجہ صاحب کے بیانات غلط نہیں ہیں تو اسکی ذمہ داری مہاراجہ صاحب پر نہیں ہے کہ انہوں نے آخر وقت میں اس معاملہ میں کارروائی کی۔ بلکہ اسکی تمامتر ذمہ داری اُن لوگوں پر ہے جنہوں نے شادی کا مقام، اور تاریخ مقرر کی، اور اسکا اہتمام کیا کہ مہاراجہ صاحب کو اس رشتہ کے خلاف آواز بلند کرنیکا کم سے کم موقع ملسکے

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بڑی مہارانی صاحبہ اور شاہزادی نابھ کو شادی ہونے سے قبل یہ معلوم تھا کہ مہاراجہ صاحب اس رشتہ کو پسند نہیں کرتے اور وہ اس کے

خلاف ہیں۔

اس موقع پر ہمیں یہ بتا دینا چاہئے کہ ہمیں باوثوق ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ نہ صرف بڑی مہارانی صاحبہ کو نہ معلوم کن وجوہ سے اس رشتہ کی زبردست خواہش تھی، بلکہ خود دلہن بھی جسکی عمر گو اسوقت تک پورے ۱۸ برس کی نہیں ہوئی ہے، باوجود اپنے باپ کی مخالفت کے، اور ان اندیشوں کے، جوان کے باپ کے پیش نظر تھے، شادی ہو جانے پر تلی ہوئی تھیں۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ ہم دلہن کی ماں اور باپ کے درمیان حَکَم بنیں، اور نہ یہ ہمارا فرض ہے کہ دلہن اور دلہن کے باپ کے معاملات میں دخل دیں۔ ہمارا تعلق تو اس سے ہے کہ خود مہاراجہ صاحب نے ہم سے ان تاروں کی اشاعت کی خواہش کی اور ہم انکو شایع کرنے پر مجبور ہوئے۔

اس کے علاوہ بحیثیت اخبار نویس کے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ ہم تمام معاملہ پر رائے زنی کریں۔ لیکن یہ فرض کوئی خوشگوار فرض نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا فرض ہے جسکی ادائیگی میں ہمیں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

اب جبکہ شادی ہوگئی ہے۔ ہماری تمنّا یہ ہے کہ مہاراجہ صاحب کے جو اندیشے اور خطرات ہیں وہ صحیح ثابت نہ ہوں۔ اور یہ شادی دولہا اور دلہن دونوں کے لئے مبارک ثابت ہو۔ ہمیں مہاراجہ صاحب نابھہ کے ساتھ ان حالات کی وجہ سے جن میں یہ شادی ہوئی ہے پوری پوری ہمدردی ہے۔ مہاراجہ صاحب کی طرح ہمیں بھی افسوس ہے کہ کمشنر انبالہ اس سلسلہ میں جدوجہد کرتے رہے۔ اور انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو اس قدر عجیب حماقت پر ختم کیا کہ دلہن کی ماں کی طرف سے دلہن کے بدقسمت باپ کو شادی میں شرکت کی دعوت دی۔

اگر حکومت اس معاملہ سے اس قدر بے تعلق ہے۔ جیسا کہ ہمیں اس جواب سے یقین دلایا جاتا ہے جو وائسرائے کی طرف سے پولٹیکل سیکریٹری نے دیا تو بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ اس معاملہ کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ حکومت کو سوچنا ہے کہ کمشنر انبالہ نے اس سلسلہ میں جو جدوجہد کی ہے اور اس سے مہاراجہ صاحب نابھ کو جو صدمہ ہوا ہے اسکی تلافی کے سلسلے میں اسے کیا کرنا چاہئے۔

کمشنر صاحب انبالہ نے ایک بدقسمت مہاراجہ کے خانگی معاملات میں اپنی ٹانگ پھنسا کر جو کچھ کیا وہ یقیناً مہاراجہ صاحب نابھ کے لئے تکلیف دہ ہے، یہ ہم تارکین موالات کا کام نہیں ہے کہ ہم حکومت کو مشورہ دیں کہ اس سلسلہ میں کمشنر صاحب انبالہ سے کیا معاملہ کرنا چاہئے لیکن ایک بات ضرور صاف ہے کہ حکومت کے ارکین کو اس قسم کے خانگی معاملات میں مداخلت نہ کرنی چاہئے۔

مہاراجہ صاحب نابھہ پر ایک نیا ظلم

(ہمدرد - ۱۹ - اکتوبر ۱۹۲۷ء)

محمد علی راجوں، نوابوں، بادشاہوں کے سخت مخالف تھے لیکن ظلم وہ کسی پر نہیں دیکھ سکتے تھے - مہاراجہ نابھہ پر جب ظلم ہوا تو وہ انکی حمایت پر بھی کمربستہ ہو گئے .... مولف)

ہندو مسلمانوں کے درمیان جو امور متنازعہ فیہ ہیں ان کے انفصال کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی - اس میں اس قدر منہمک رہا، کہ نہ اخبارات پڑھنے ہی کی فرصت ملی - نہ "ہمدرد" کے لئے کچھ لکھنے کی - اسی زمانہ میں شاہد مرحوم بھی بمبئی سے دہلی آئے اور پیشتر اسکے کہ چچا کو ان جھگڑوں سے فرصت ملے اور وہ بھی دہلی آئیں اور ان کی تیمارداری کریں وہ بقول خود "سو گئے"، لیکن اس عدیم الفرصتی کی حالت میں بھی ایک دن میری یہ حالت ہو گئی کہ بے اختیار شملہ چھوڑ کر مسوری جانے کو جی چاہا - اگر

دوسرے ہی دن سردار سر دول سنگھ کو لیشر شملہ میں نہ مل گئے ہوتے تو مجھے یہاں رہنا دوبھر ہو جاتا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ایک نہایت معتبر و موثوق ذریعہ سے میں نے سنا کہ

(۱) بڑی مہارانی صاحبہ نابھہ کے انتقال کے متعلق شبہہ کیا گیا کہ ان کی موت زہر خورانی کے باعث واقع ہوئی۔

(۲) اس بنا پر ان کے جسم کا بعد الموت امتحان کرایا گیا۔

(۳) ان کے معدہ میں سے سرکاری ممتحن کیمیاوی کو سنکھیا ملی۔

(۴) ان کی ایک پرانی خادمہ کو پولیس نے حوالات میں رکھا۔ اور بالآخر اس نے ایک بیان لکھوایا جس میں سب کچھ اقبال کر لیا۔

(۵) انسپکٹر جنرل پولیس مسوری پر آئے ہوئے تحقیقات کر رہے ہیں اور

(۶) مہاراجہ صاحب نابھہ کے رنگون بھیجے جانے کے متعلق حکومت غور کر رہی ہے

میں جب آواخر اگست ۱۹۲۳ء میں قید سے رہا کئے جانے کے لئے بیجاپور جیل سے جہانسی جیل اسپیشل ٹرین میں لایا جا رہا تھا تو میرے محافظ یورپین پولیس انسپکٹروں نے اپنا ٹائمز آف انڈیا کا مصور ہفتہ وار پرچہ مجھے دکھایا تھا۔ یہ پہلا اخبار تھا (علاوہ "مدینہ" کے ایک پرچہ کے) جو کراچی جیل چھوڑنے کے بعد سے میں نے اسوقت تک دیکھا تھا مجھے اسوقت تک مہاراجہ صاحبان نابھہ و پٹیالہ کے قضیہ نامرضیہ کا متعلق علم نہ تھا۔ اس لئے جب اس پرچے میں میں نے مہاراجہ صاحب نابھہ کی معزولی کے متعلق کچھ پڑھا تو معاً میں نے قیاس کیا کہ آخر کار حکومت نے ان کو ان کی آزاد خیالی کا صلہ مرحمت فرما دیا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ اسوقت سے جبکہ ان کے والد ماجد حیات تھے اور وہ "ٹکا صاحب" یا ولی عہد ہی تھے، اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ اور باوجود ایک والی ملک

کے وارث تخت و تاج ہونے کے مسٹر گوکھلے آنجہانی کے رفیق کار تھے اور کونسل میں
اس طرح تقریر فرماتے تھے کہ گویا کوئی کانگریسی سور ما بول رہا ہے۔ حکومت، اور وہ
بھی سر مائیکل اڈوائر جیسے، ہندوستان اور آزادی کے دشمن کی حکومت ان سے سخت
بیزار تھی؟ عین اسوقت جبکہ جنگ عمومی میں برطانیہ کی جان پر آبنی تھی اور ہر طرف حلیف
اور کمک کی تلاش تھی۔ اور کون تھا جسکو برطانیہ نے جرمنی اور اس کے حلیفوں کے
خلاف نہ اُبھارا۔ اور جس سے برطانیہ نے مدد نہ لی۔ اسی وقت نئے مہاراجہ صاحب
نابھہ اور سابق "ٹکا صاحب" کی پیش کردہ فوجی امداد کو سر مائیکل اڈوائر کے کہنے سے
حکومت ہند نے قبول کرنیسے انکار کر دیا۔ اس لئے مجھے مطلق تعجب نہ ہوا۔ جب میں نے
اس پرچہ میں دیکھا کہ مہاراجہ صاحب نابھہ معزول کر دئے گئے۔ جب مجھے اپنے محافظوں
کی زبانی معلوم ہوا کہ اس معزولی سے پہلے مہاراجہ صاحب نابھہ و مہاراجہ صاحب پٹیالہ
کے درمیان ایک قضیہ تھا۔ اور اسے حکومت نے اس طرح چکایا کہ مہاراجہ صاحب نابھہ
کو معزول کر دیا۔ تب البتہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے حیرت ہوئی لیکن بس تھوڑی ہی
دیر کے لئے۔ اس لئے کہ میں اس حکومت کی رگ و پے سے واقف ہوں
اور خوب جانتا ہوں کہ وہ کس قدر دوسروں ہی کے کندھوں پر رکھ کر بندوق
چھوڑنے کی خوگر ہے۔ اگر لارڈ منٹو کے زمانے میں پٹیالہ پر جس کے سابق مہاراجہ
سے تو حکومت ہمیشہ ہی ناراض رہی تھی آئی ہوئی آفت اس طرح نہ ٹلی ہوتی کہ
لاٹ صاحب نے مہاراجہ صاحب کے محل میں دعوت نہ کھائی، بلکہ اپنے اسپیشل
ہی میں خاصہ تناول فرمایا، اور ریاست پٹیالہ کے چند عہدہ داروں کو موقوف کرادیا
اور اگر کہیں نوبت خود مہاراجہ صاحب کی معزولی تک پہنچ گئی ہوتی تو یقیناً یہ حکومت

اسوقت بھی اسکا اعتراف نہ کرتی کہ یہ کارروائی اس نے از خود کی ہے۔ بلکہ کسی نہ کسی اور ریاست ہی کے کندھے پر وہ بندوق بھی رکھ کر چھوڑی گئی ہوتی، اور کوشش تو اسی کی کیجاتی کہ دور کیوں جایا جائے۔ گھرہی میں پھوٹ کا اظہار کیا جائے اور کسی "پبلکین اسٹیٹ"، ہی کی حمایت کو اپنے عتاب کا بہانہ بنایا جائے۔

(۳)

حال ہی میں خود ریاست پٹیالہ نے مہاراجہ صاحب نابھ کے منوسلین میں سے سردار دیوان سنگھ صاحب کے خلاف ایک مقدمہ چلانا چاہا جس کے سلسلہ میں ان کے مکان اور دفتر کی دہلی میں تلاشی لی گئی۔ اور مجسٹریٹ کے روبرو ایکسٹریڈیشن (EXTRADITION) کی درخواست پیش ہوئی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ کوئی نہایت اہم اور تازہ ترین واقعہ ہے۔ بالخصوص جبکہ معلوم ہوا کہ حکومت ہند کے سابق ڈائرکٹر معلومات ("مجہولات" زیادہ صحیح ہوگا) مسٹر رشبروک ولیمس صاحب ریاست پٹیالہ کے موجودہ وزیر خارجہ نے تمام ریاستوں سے دریافت کرایا تھا کہ دیوان سنگھ صاحب کے خلاف آپ کے ہاں تو کچھ مواد نہیں پک رہا ہے۔ لیکن چند دن بعد معلوم ہوا کہ دس بارہ برس سے بھی زیادہ عرصہ کی بات ہے، اور کسی بنئے کے تین سو روپے کے متعلق سوال درپیش ہے کہ وہ قرضہ تھا اور ادا ہو گیا، یا استحصال بالجبر، یا فریب، یا اسی قسم کا کوئی جرم سرزد ہوا تھا۔ ابھی شملہ آکر اخبارات میں دیکھا کہ حکومت نے ریاست پٹیالہ کی ایکسٹریڈیشن کی درخواست رد کردی،

اس میں تو کسیکو کچھ شبہ بھی ہو کہ واقعی معاملہ کسی بنئے اور دیوان سنگھ صاحب ہی کا تھا، یا یہ بھی پٹیالہ اور نابھ کی جنگ ہیں، دو دو ہاتھ کی "اسکرمش"،

(SKIRMISH) تھی، لیکن مہاراجہ صاحب نابھ کی معزولی کے متعلق مجھے اتنا سا بھی شبہ نہ تھا کہ وہ پٹیالہ اور نابھ کی جنگ کا نتیجہ تھی، یا خود حکومت کے عتاب کا۔

بہر حال جھانسی جیل سے چھوڑے جانے کے بعد ہی میں نے واقعات دریافت کئے اور چھوٹی رانی صاحبہ کے والد ماجد اور چھوٹے بھائی سے جو مسٹر نائڈو کی طرح حیدر آبادی اور حضور نظام کی رعایا ہیں، سروجنی دیوی (بھارت ماتا) کے توسط سے دہلی میں اسپیشل کانگریس کے موقع پر نیاز حاصل ہوا۔ نیز سردار منگل سنگھ، اور دوسرے اکالی لیڈروں سے بھی اطلاعات ملیں جنکی بنا پر دہلی کے اسپیشل سیشن میں مہاراجہ صاحب کی معزولی کے خلاف رزولیوشن پاس کرایا گیا۔ اواخر اکتوبر ۱۹۲۳ء میں شوکت صاحب بھی چھوٹ گئے تھے۔

نومبر میں ہم سب امرتسر گئے اور سول نافرمانی کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی اور جب ہم نے دیکھا کہ نہ موتی لال جی اس طرف مائل ہیں نہ لالہ جی ادھر آنے کا خیال کر سکتے ہیں تو بادل ناخواستہ اکالی بھائیوں سے جنہوں نے اس وقت امرتسر میں ایک دل ہلا دینے والا، مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا جلوس نکالا تھا۔ کہدیا گیا کہ مجبوری ہے۔ تاہم میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کوکناڈا میں صاف صاف ظاہر کردیا تھا کہ مہاراجہ صاحب نابھ معصوم نہ سہی، گنہگار ہی سہی۔ لیکن انکی معزولی ان کے کسی قصور کے باعث عمل میں نہیں آئی ہے، بلکہ انکی خوبیوں ہی کی بنا پر واقع ہوئی ہے۔

ابتدائے ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ صاحب نابھ کی صاحبزادی صاحبہ کا عقد راجہ صاحب کلسیہ کے ساتھ جن کا پہلا عقد مہاراجہ صاحب پٹیالہ کی صاحبزادی

صاحبہ سے ہوا تھا، ہو نہ ہوا لاتھا کہ مہاراجہ صاحب نابھ کا ایک نوازشنامہ میرے
پاس مسز نائیڈو کے بھائی کی معرفت اس مضمون کا پہنچا کہ یہ تعلق میری مرضی
کے سراسر خلاف ہے۔ آپ سے ہو سکے تو اسے رکوائیے، ورنہ میرا مراسلہ شایع کر دیجئے

اس سلسلہ میں مجھے معلوم ہوا کہ بڑی مہارانی صاحبہ آنجہانی ایک عرصہ سے
مہاراجہ صاحب سے علیحدہ رہا کرتی تھیں اور تعلقات میں کشیدگی تھی۔ اور انکے
والد سردار گرو پال سنگھ مان کو مہاراجہ صاحب نابھ اپنے ہواخواہوں میں نہیں
سمجھتے تھے۔ بلکہ پٹیالہ اور نابھ کے قضیۂ نامرضیہ میں اپنے ان خسر کو پٹیالہ ہی کا طرفدار
سمجھتے تھے۔ اور بڑی صاحبزادی کے اس عقد کو جسے حکومت نے روکنے سے صاف انکار
کر دیا۔ اور جو اسی زمانہ میں راجہ صاحب کلسیہ سے ہوا تھا۔ اسی بنا پر پٹیالہ اور
نابھ کی جنگ کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتے تھے۔

بہر حال یہ پہلا موقع تھا کہ میری مہاراجہ صاحب نابھ سے خط و کتابت
ہوئی۔ چند ماہ بعد مہاراجہ صاحب نے مجھے دہرہ دون آنے کی دعوت دی۔ مگر میں
اسوقت نہ جا سکا۔ البتہ ستمبر ۱۹۲۵ء میں میں چند گھنٹہ کے لئے دہرہ دون گیا اور
مہاراجہ صاحب اور چھوٹی مہارانی صاحبہ سے نیاز حاصل کیا۔ اسکے بعد دہلی میں اس
سال کی ابتداء میں پھر ملاقات کا موقع ملا۔ اور تفصیلی گفتگوئیں ہوئیں۔ گزشتہ
دو سال میں مہاراجہ صاحب کے اعزا اور متوسلین مجھ سے ملتے رہے اور میں ان تمام
واقعات سے واقف ہوتا رہا جو اس عرصہ میں پیش آئے۔ مجھے کئی بار معلوم ہوا کہ
مہاراجہ صاحب کو خود اپنی جان خطرہ میں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جسوقت میں نے
یہ سنا۔ اور ایک نہایت مقتدر کرم فرما کی زبانی جنکی معلومات کا ذریعہ یقیناً

نہایت ہی موثق خیال کیا جائیگا کہ بڑی مہارانی صاحبہ کا انتقال زہر خورانی کے باعث ہوا۔ اور حکومت کے ممتحن کیمیاوی کو امتحان کرنے پر معلوم ہوا کہ معدہ میں سنکھیا موجود ہے۔ اور خود انسپکٹر جنرل پولیس تحقیقات کر رہے ہیں۔ اور ایک پرانی خادمہ نے حوالات میں سب کچھ اقبال کر لیا۔ اور اب اس امر پر حکومت غور کر رہی ہے کہ مہاراجہ صاحب نابھہ کو رنگون بھیجے۔ تو یقیناً میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

اچھا ہوا کہ دوسرے ہی دن مجھے میرے کرمفرما سردار سردول سنگھ کویشر شملہ ہی میں مل گئے۔ میں نے ان سے حقیقت حالات پوچھی تو معلوم ہوا کہ زہر خورانی کے متعلق تو حکومت کی تحقیقات کا وہی نتیجہ ہوا جسکی مجھے اطلاع ملی ہے۔ مگر اسکا مہاراجہ صاحب نابھہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ انہوں نے تو خود انتقال سے تین ہفتہ پیشتر مجسٹریٹ ضلع، کمشنر، بلکہ گورنر تک کو اطلاع دیدی تھی کہ مجھے اندیشہ ہے کہ بڑی مہارانی صاحبہ کو ان کے پاس والے بچنے نہ دیں گے اور مجھے ان کے لوٹے جانے کا بھی خوف ہے"۔ اسوقت تو میرے اطمینان کے لئے یہی کافی تھا۔ اور میں نے اسے تائید ایزدی سمجھا کہ مہاراجہ صاحب نے اپنے اس اندیشہ سے عمال حکومت اور خود حکومت کو مطلع کر دیا۔ اگر یہ نہ ہوا ہوتا تو جو کچھ شبہات حکومت ان پر کرتی وہ ظاہر ہیں۔ لیکن میں نے ارادہ کیا کہ شملہ سے جاتے ہی مسوری جاؤں گا، اور خود مہاراجہ صاحب سے تمام حالات دریافت کروں گا۔

چنانچہ جب شملہ سے روانگی کے بعد میں دہلی سے اپنی منجھلی لڑکی کو (جسے چار پانچ ماہ سے خفیف سی حرارت تقریباً روز ہو جاتی ہے) جناب حکیم اجمل خاں صاحب کو دکھانے

کے لئے دہرہ دون گیا۔ نو ایک دن کے لئے مسوری بھی ہوتا آیا۔ اور تمام اس خط و کتابت کی نقل اپنے ساتھ لیتا آیا جو مہاراجہ صاحب اور عمال حکومت کے درمیان اس سلسلہ کے متعلق ہوئی ہے۔

مہارانی نابھہ کا انتقال

(ہمدرد ۲۱ - ۲۳ - اکتوبر ۱۹۲۷ء)

یہ بھی مہاراجہ نابھہ سے متعلق سلسلۂ مضمون کی ایک کڑی ہے۔

مؤلف

پیشتر اس کے کہ ہم نابھہ کی بڑی مہارانی صاحبہ کے انتقال کے گرد و پیش کے واقعات کو، مہاراجہ صاحب نابھہ اور عمال حکومت کے درمیان خط و کتابت، اور انڈین نیشنل ہیرلڈ کے نامہ نگار مسوری کے بیانات سے اخذ کر کے یہاں درج کروں مناسب ہوگا کہ چند اشخاص جن کا ذکر اس بیان میں بار بار آئیگا ان کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔ کہ وہ کون ہیں۔ اور ان کا مہاراجہ صاحب نابھہ اور انکی بڑی مہارانی سے جن کا ۴ اگست کو انتقال ہوا کیا تعلق ہے۔

سردار گردیال سنگھ مان صاحب، مہاراجہ صاحب نابھہ کی بڑی مہارانی کے والد ہیں گویا مہاراجہ صاحب نابھہ کے خسر۔ مہاراجہ صاحب نے جو خط ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہرہ دون کو ۱۴ جولائی کو لکھا ہے۔ اس میں ان صاحب کے متعلق درج ہے کہ وہ

پنجاب میں ایک زمانہ میں ڈسٹرکٹ اور سشن جج تھے لیکن ۱۸۹۰ء کے بعد، اور ۱۹۰۰ء سے پیشتر ایک سال رشوت ستانی کی علت میں وہ حکومت کی نوکری سے، برطرف کردئے گئے۔ اور چونکہ حکومت پنجاب نے ان پر فوجداری مقدمہ چلانیکا حکم صادر کردیا تھا وہ نیپال کو بھاگ گئے۔ لیکن متوفی مہاراجہ صاحب نابھہ نے ۱۹۰۶ء میں کوشش کرکے انہیں پنجاب آنے کی اجازت دلوادی۔ موجودہ مہاراجہ صاحب نابھہ انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اور ان کا گمان ہے کہ ان کے یہ خسر ریاست پٹیالہ سے ملے ہوئے ہیں اور مہاراجہ صاحب سے اپنی عداوت کا ثبوت دیتے رہتے ہیں

یکم مارچ کو مہاراجہ صاحب نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک تحریر ارسال فرمائی تھی جس میں اپنی جان اور اپنے اہل وعیال کی عزت آبرو کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ وہ خطرے میں ہیں۔ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ ریاست پٹیالہ کے انسپکٹر جنرل سردار حضور اسنگھ ڈھلن اور ایک اور افسر پولیس سردار بھرپور سنگھ کچھ عرصہ ہوا دہرہ دون آئے تھے اور ڈالن والہ میں سردار گردیال سنگھ مان صاحب کے پاس ٹھہرے تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ جوالا سنگھ نامی، جو سردار حضور اسنگھ کا آدمی ہے اور پٹیالہ پولیس میں تھا اور ہمیشہ سردار گردیال سنگھ صاحب ہی کے مکان میں ڈالن والہ میں رہا کرتا ہے۔ پٹیالہ اور ڈہرہ دون کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر نگاہ رکھنے کی آپنے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے درخواست کی تھی۔ آپ نے ۱۴ جولائی کے خط میں اسکی شکایت بھی کی ہے کہ اس درخواست کا جواب تو جواب، اسکی رسید تک مجھے ارسال نہیں کی گئی۔ بہرحال یہ ایک دوسرا معاملہ ہے، جس کے متعلق بعد میں کچھ ذکر کیا جائیگا

اس آخری تحریر میں مہاراجہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ میری
یکم مارچ کی تحریر کے تھوڑے ہی دن بعد اس جوالا سنگھ کے پاس بغیر لائسنس کا ایک ریوالور
نکلا، اور یہ امر نہایت معنی خیز ہے کہ ۵ ار مارچ یا اسی کے قریب کسی تاریخ کو سردار گرو
دیال سنگھ مان صاحب جو ڈالن والہ میں قیام پذیر تھے، بڑی گھبراہٹ میں تمام ساز و
سامان لیکر دہرہ دون سے چلدیئے۔

مہاراجہ صاحب کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں بڑی مہارانی صاحبہ سخت علیل
تھیں یہ شخص جوالا سنگھ مہارانی صاحبہ کے مکان "روڈ ویل" میں تن تنہا اور پوری
طرح تمام کاروبار پر حاوی اور ہر چیز پر متصرف تھا۔

رانی صاحبہ کلسیہ کا بھی اس خط و کتابت میں کہیں کہیں ذکر آیا ہے، آپ
مہاراجہ صاحب نابھہ کی وہ صاحبزادی ہیں جو بڑی مہارانی صاحبہ کے بطن سے تولد
ہوئیں۔ آپ ہی کی شادی مہاراجہ صاحب پٹیالہ کے داماد، راجہ صاحب کلسیہ سے
۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ آپ کی عمر کوئی بیس سال کی ہوگی۔ اور مہاراجہ صاحب کا خیال
ہے کہ آپ اپنے نانا صاحب سردار گردیال سنگھ مان صاحب اور مہارانی صاحب دھولپور
کی اس قدر زیر اثر ہیں کہ آپ کو مسحور کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بہرکیف آپ کی
شادی بالکل مہاراجہ صاحب کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔

جن مہارانی صاحبہ دھولپور کا ذکر مہاراجہ صاحب کے خطوط میں آیا ہے، وہ
موجودہ مہارانا صاحب دھولپور کی رانی صاحبہ نہیں ہیں بلکہ انکی بھاوج ہیں، اور
خود مہاراجہ صاحب نابھہ کی سوتیلی بہن ہیں۔ ان کے متعلق مہاراجہ صاحب نابھہ نے
اپنے مراسلہ مورخہ ۱۴ر جولائی بنام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہرہ دون میں تحریر فرمایا تھا کہ چند

سال کا عرصہ ہوا کہ یہی مہارانی صاحبہ اپنے دیور مہاراج راناصاحب دھولپور کا کچھ قیمتی سامان اور جواہرات لیکر دھولپور سے چلی گئی تہیں ۔جس کے باعث انہیں دھولپور کے ریلوے اسٹیشن پر روک لیا گیا تھا ۔اور راجپوتانہ کے ایجنٹ گورنر جنرل کے حکم سے ان کے سامان کی تلاشی لی گئی تھی ۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ میں نے مذکورۂ بالا بیانات کے متعلق کوئی ذاتی تحقیقات نہیں کی ہے ۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں تک واقعات پر مبنی ہیں ۔ تاہم مہاراجہ صاحب نابھہ نے عمال حکومت کے ساتھ جو ضابطہ کی مراسلت کی ہے اس میں ان امور کو بطور واقعات کے ظاہر فرمایا ہے ۔ اور عمّال حکومت نے ان کی تردید بھی نہیں کی ہے ۔ اس لئے اگر انکو قرین قیاس مان کر کوئی شخص ان مراسلات پر نظر ڈالے تو یقیناً اسکو تعجب نہ ہوگا کہ مہاراجہ صاحب نابھہ کے دل میں وہ شبہات کیوں پیدا ہوئے جن کا انہوں نے اظہار فرمایا ہے ۔ بلکہ تعجب ہوگا تو اسی امر پر کہ ان کی شکایات موصول ہونے پر بھی عمّال حکومت نے تساہل سے کیوں کام لیا ۔

اب ریاست نابھہ کی بڑی مہارانی صاحبہ کے انتقال اور اس کے گردو پیش کے حالات ملاحظہ ہوں ۔ مہاراجہ صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ۱۴ر جولائی کو ارقام فرماتے ہیں کہ مجھے مہارانی صاحبہ کی صحت کے متعلق حقیقت حالات سے مطلق بے خبر رکھا گیا ۔ اور صرف ۳ر جولائی کو محض ایک دوست کی زبانی ، جو مسوری سے دہرہ دون آئے تھے ۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری اہلیہ کی حالت خطرناک ہے ۔ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ چونکہ بڑی مہارانی صاحبہ اور مہاراجہ صاحب کے

تعلقات میں ایک عرصہ سے کشید گی چلی آتی تھی۔ اس لئے خود مہارانی صاحبہ ہی نے
مہاراجہ صاحب کو اپنی صحت کی حقیقت سے بیخبر رکھنا چاہا۔ مگر یہ دوسروں کے
لئے کوئی معقول عذر نہیں سمجھا جا سکتا۔ مہارانی صاحبہ لاکھ ناراض، بلکہ یوں کہئے
کہ مہاراجہ صاحب سے بیزار سہی تاہم گردوپیش کے لوگوں کا فرض تھا کہ شوہر کو
اپنی اہلیہ کی خطرناک حالت سے مطلع کریں۔ اور جس وقت مہاراجہ صاحب کو
اطلاع ہوئی اسوقت تو مہارانی صاحبہ کی صحت کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی
کہ وہ اسوقت نہ تو کچھ بول ہی سکتی تھیں نہ مہاراجہ صاحب کو پہچان ہی سکتی
تھیں، ایسی حالت میں بھلا وہ گردوپیش کے لوگوں کو کیا ہدایات دے سکتی تھیں، اور
اگر دے بھی سکتی تھیں تو ان پر اس طرح عمل کرنا بھلا کب جائز تھا کہ ایک شوہر کو اپنی دم
توڑنے والی بیوی کی خطرناک علالت سے بھی بے خبر رکھا جائے؟

جب مہارانی صاحبہ کا ۴ اگست کو انتقال ہو گیا تو گردوپیش کے لوگوں نے
مہاراجہ صاحب کے ساتھ معاندانہ برتاؤ کو جاری رکھا۔ اور انھیں اپنی رفیق زندگی
کی نعش تک دیکھنے نہ دی۔ لطف یہ کہ ڈاکٹر فلیچر رابنسن صاحب نے اسی دن سردار
سردول سنگھ کویشر کو ٹیلیفون کیا کہ ہز ہائینس رانی صاحبہ کلسیہ دختر مہاراجہ صاحب
نابھہ و متوفی مہارانی کی خواہش ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ذریعے سے مہاراجہ صاحب
کو اطلاع دے دی جائے کہ بڑی مہارانی صاحبہ کی خواہش تھی کہ مہاراجہ صاحب بڑی
مہارانی صاحبہ کو نہ تو انکی وفات کے قبل نہ اسکے بعد دیکھیں، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا
کہ یہ خواہش دو تین ہفتہ قبل ظاہر کی گئی تھی اور بیبا صاحبہ اور نرسوں کے سامنے
ظاہر کی گئی تھی۔ جسوقت اس خواہش کا اظہار فرمایا گیا تھا ڈاکٹر رابنسن خود موجود نہ تھے

قارئین کرام خود قیاس کر سکتے ہیں کہ کیا واقعۃً بڑی مہارانی صاحبہ نے ایسی خواہش ظاہر کی تھی اور اگر کی تھی تو کیا وہ اس قابل تھی کہ اس پر عمل کیا جائے جسوقت یہ اطلاع ٹیلیفون پر مہاراجہ صاحب کو پہنچائی گئی تھی، اسوقت مہارانی صاحبہ کا یا تو انتقال ہوگیا تھا، یا ابھی انتقال تو نہ ہونے پایا تھا مگر جاں کنی کی حالت تھی، سردار سردول سنگھ کویشر اپنی ایک یادداشت میں اس ٹیلیفون کی گفتگو کا حوالہ اس ٹیلیفون پر موصول شدہ اطلاع کے بعد دیتے ہیں جو ڈاکٹر رابنسن نے مہاراجہ صاحب نابھہ کو دی تھی کہ بڑی مہارانی صاحبہ اگر جان توڑ نہیں چکی ہیں تو جان توڑ رہی ہیں اور اس یادداشت میں سردار صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ میں نے ۴ اگست کو دن کے ۱۱ اور ۱۲ بجے کے درمیان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی یہ اطلاع پہنچا دی اور ان سے مہاراجہ صاحب کی طرف سے درخواست کی کہ مہارانی صاحبہ کی جائے قیام "وڈویل" پر کسی کو مال و اسباب پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا جائے وہاں کے لوگ مہاراجہ صاحب کا وہاں آنا پسند نہیں کرتے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کہا کہ وہ مہاراجہ صاحب کے خاندانی امور میں دخل دینے کے لئے تیار نہیں ہیں مہاراجہ صاحب خود وہاں تشریف لے جا سکتے ہیں اور جو کچھ مناسب خیال فرمائیں کر سکتے ہیں۔

سردار دول سنگھ نے کہا کہ اگر مہاراجہ صاحب "وڈویل" تشریف لے گئے تو جھگڑا ہو جائیگا جس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس اندیشہ کے متعلق فرمایا کہ (IT WAS OLL NONSENSE) یہ سب لغو ہے، قول فیصل خود مہاراجہ صاحب کا ہوگا۔ اور انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ تب سردار صاحب نے

فرمایا کہ ڈاکٹر رابنسن نے ابھی ٹیلیفون پر اطلاع دی ہے کہ مہارانی صاحبہ نے
یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مہاراجہ صاحب نہ انتقال سے قبل نہ انتقال کے بعد
بڑی مہارانی صاحبہ کو دیکھیں۔
اگر واقعی رانی صاحبہ کاسیہ کی موجودگی میں ان کی والدہ ماجدہ نے
اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا تو ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے گردو
پیش کے لوگوں کی گھڑی ہوئی وصیت سمجھیں، لیکن پھر بھی اسکا پورا امکان
باقی رہتا ہے کہ انہی لوگوں نے اپنی کسی ذاتی غرض سے بڑی مہارانی صاحبہ کو
اس وصیت کے کرنیکا علانیہ یا خفیہ مشورہ دیا ہو۔ بہرحال میرے نزدیک
اگر یہ وصیت واقعی بھی تھی، اور مہارانی صاحبہ آنجہانی نے خود ہی کی تھی، نہ کہ
کسی کے کہنے میں آکر، تب بھی گردوپیش کے لوگوں کو اسے نظر انداز کر دینا
چاہئے تھا۔ اور ضلع کے مجسٹریٹ کو تو اسکا ضرور انتظام کرنا چاہئے تھا کہ مہاراجہ
صاحب کو اپنی بڑی مہارانی صاحبہ کا بسترِ مرگ پر دیدار نصیب ہو جائے۔ مگر
افسوس ہے کہ نہ گردوپیش کے لوگوں ہی نے کسی وجہ سے اسے پسند کیا نہ ضلع
کے مجسٹریٹ ہی نے مناسب انتظام کیا۔ اور مہاراجہ صاحب پر اس طرح وہ
انتہائی ظلم کیا گیا جسکی مثال آسانی سے نہ ملے گی۔

(۳)

بہرحال مہاراجہ صاحب اپنی اہلیہ کی خطرناک حالت کی خبر سنکر جو انکو
اپنے ایک دوست سے معلوم ہوئی جو منصوری سے دہرہ دون آئے تھے، منصوری
تشریف لے گئے۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ آپ کی تشریف آوری سے چند ہی گھنٹے

قبل آپ کی سوتیلی بہن، مہارانی صاحبہ دھولپور بھی معہ اپنے ساز و سامان کے تشریف لے آئی تھیں۔ اور مہاراجہ صاحب نے جو تحریر ۱۴ر جولائی کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ارقام فرمائی۔ اس میں آپ نے بیان فرمایا ہے کہ اسی دن مہارانی صاحبہ دھولپور، اور آپ کے خسر سردار گردیال سنگھ مان نے، مہارانی صاحبہ نابھ کے تمام پرانے ملازموں کو موقوف کر دیا۔

اس کارروائی کو میں آجتک نہیں سمجھا، مہارانی صاحبہ اور مہاراجہ صاحب کے درمیان جو ناچاقی تھی وہ عرصہ سے چلی آتی تھی اگر مہارانی صاحبہ کو اپنے اُن پرانے ملازموں پر اعتماد نہ تھا، ان سے اگر کسی قسم کا خطرہ تھا تو ان کو مہارانی صاحبہ کب کی برخاست کر چکی ہوتیں۔ جو ملازم سالہا سال سے اُن کی خدمت کرتے چلے آئے تھے، انکو عین اسوقت برخاست کرنے کے کیا معنی جبکہ وہ اسقدر سخت علیل تھیں اور بظاہر بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھیں؟ یہ تو وہی کرے گا جسکو ان سے اپنی جان کا خطرہ ہو۔ اور ان سے اپنی جان بچانا ہو۔ لیکن ہوا کیا؟ کیا مہارانی صاحبہ کی جان بچ گئی؟ وہ تو اس واقعہ کے ایک مہینہ بعد ہی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں اور "انڈین نیشنل ہیرلڈ" کا نامہ نگار منصوری سے لکھتا ہے کہ ان کی وفات اسقدر مشتبہہ سمجھی گئی کہ کرنل اونیل منصوری کے سول سرجن نے وفات کے بعد آپ کی نعش کا امتحان کیا۔ اور گورنمنٹ کے ممتحن کیمیاوی کو آپ کے معدہ میں سے سنکھیا ملی۔ اور دہرہ دون اور منصوری کے دوا فروشوں کے رجسٹروں کا معائنہ کیا گیا۔ اور اسکی تفتیش کی گئی کہ سنکھیا کہاں سے حاصل کی گئی، اور کس نے حاصل کی۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں تب تو مہارانی صاحبہ کے پرانے

خدمتگاروں کی اسی دن برخاستگی کے اسباب جس دن مہارانی صاحبہ دھولپور وڈوپل میں وارد ہوئیں۔ اور جس دن مہاراجہ صاحب نابھہ اپنی رفیقِ حیات کو دیکھنے گئے اور بھی محتاجِ تفتیش ہو جاتے ہیں، بالخصوص جبکہ ہمیں مہاراجہ صاحب کی تحریر بنام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مورخہ ۱۴ جولائی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مہارانی صاحبہ کو ہرگز اس قابل نہیں پایا کہ وہ اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کر سکیں، اور اسکے متعلق کوئی ہدایات دے سکیں۔ وہ نہ بول سکیں نہ مہاراجہ کو پہچان سکیں"، یہ خود مہاراجہ صاحب کی تحریر کے الفاظ ہیں۔

اور وہ یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ تمام فضا ایسی تھی کہ اس سے مہارانی صاحبہ کی پوری بےبسی ٹپکتی تھی۔ اور مہارانی صاحبہ دھولپور، اور سردار گردیال سنگھ مان کا اثر "وڈوپل" میں ہر چیز پر حاوی تھا۔ اور ریاست پٹیالہ کی پولیس کا سابق ملازم جوالا سنگھ، جس سے خود مہاراجہ صاحب کو ان کی تحریر مورخہ یکم مارچ بنام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مطابق اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اور جس کے پاس بلا لائسنس کا ایک ریوالور برآمد ہونیکا حال انہوں نے سنا تھا۔ تن تنہا سیاہ سفید کا مالک تھا۔ مہارانی صاحبہ کے پرانے خدمتگاروں کی ان حالات میں برخاستگی اس کے بعد تو عجیب و غریب طرح پر معنی خیز ہو جاتی ہے کہ مہاراجہ صاحب نے ۱۴ جولائی کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو جو تحریر ارسال فرمائی اس میں صاف صاف ارقام فرما دیا کہ "ان حالات میں اپنی اہلیہ کی زندگی کے لئے مجھے سخت اندیشہ ہے"، یہ تو مذکورہ بالا حالات بیان کرنے کے بعد کا فقرہ ہے، مگر ان کی تحریر کی ابتداء بھی اسی طرح ہوتی ہے "میری اہلیہ "وڈوپل" منصوری میں سخت بیمار پڑی ہوئی ہیں اور

ان کے گرد وپیش، اگر میں کہہ سکتا ہوں تو ضرور کہوں گا کہ انسانی شکل میں ایسے مردار خوار جمع ہیں جن کی نظر ہمارے مال واسباب پر لگی ہوئی ہے۔ بلکہ مجھے تو سخت شبہہ ہے اور میرا خیال ہے کہ میری اہلیہ کی زندگی ان لوگوں کے درمیان سخت خطرہ میں ہے۔"

اس سلسلہ میں یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ بڑی مہارانی صاحبہ کا انتقال ہونے والا تھا، اس حالت اور مہارانی صاحبہ کی آخری وصیت کی اطلاع ٹیلیفون پر ڈاکٹر فلیچر رابنسن نے مہاراجہ صاحب کو دی تھی، اور یہی مہارانی صاحبہ کے معالج تھے۔ لیکن ۳ر جولائی کو جب مہاراجہ صاحب انکی حالت اسقدر خراب ہونے کی خبر سنکر فوراً دہرہ دون سے منصوری تشریف لے گئے تو انہوں نے وہاں مہارانی صاحبہ دھولپور کی ایک پرانی، نہایت گہری دوست آگرہ کی لیڈی ڈاکٹر ہیرنگٹن نامی کو دیکھا۔ جو رات دن اسی مکان میں رہا کرتی تھیں، اور گو مہارانی صاحبہ دھولپور تو اپنے بھائی کے سامنے تشریف نہیں لائیں۔ مگر مہاراجہ صاحب کا بیان ہے کہ ان کی یہ پرانی اور نہایت گہری دوست سایہ کی طرح مہاراجہ صاحب کے ساتھ تھیں۔ اور چند منٹ مہاراجہ صاحب نے اپنی رفیق حیات کے کمرے میں ان کے بستر مرگ کے پاس گزارے ان میں سے ایک بھی ایسا نہ گذرا کہ یہ لیڈی ڈاکٹر ہیرنگٹن سر سے ٹلی ہوں۔ دوسرے دن مہاراجہ صاحب کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا گیا۔ اور وہ چاروناچار دہرہ دون واپس چلے آئے، اس کے بعد ایک دن بھی باوجود تاکید کے مریضہ کی حالت سے انہیں ٹیلیفون پر اطلاع نہیں دی گئی اور جب خود انہوں نے ٹیلیفون پر دریافت کیا، تب بھی جواب ملنا آسان نہ تھا

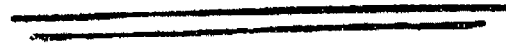
اگر واقعات یہ ہیں تو پھر اس ظلم کو کیا کہا جائے، کہ مجھے ایک نہایت موثق
ذریعے سے اطلاع ملے کہ گورنمنٹ مہاراجہ صاحب کو تورنگون بھیجنے کے مسئلہ پر
غور کر رہی تھی، جن کا چند منٹوں کے لئے بھی، اور اس بہرہ چوکی کے ساتھ تک
اپنے رفیق حیات کو دیکھنا متوفیہ کے گرد و پیش کے لوگوں کو گوارا نہ تھا۔ اور بظاہر
کوئی نہیں پوچھتا کہ مہارانی صاحبہ کے معالج کون تھے؟ ان کے گرد و پیش کے
لوگوں اور ان اشخاص سے جنہیں مہاراجہ صاحب عرصہ سے اپنا دشمن اور اپنے دشمن کا
دوست سمجھتے ہیں کیا تعلق تھا۔ اور مہارانی صاحبہ کے پرانے خدام کیوں انکی اس
خطرناک حالت میں مہارانی صاحبہ کو دھولپور کے آتے ہی برخاست کر دئے گئے
اور نئے نوکر کون تھے جو مہاراجہ صاحب کے "وڈ ویل" آنے کی تاریخ سے لیکر
مہارانی صاحبہ کے انتقال کی تاریخ تک ان کی خدمت کرتے رہے۔ انڈین نیشنل ہیرلڈ
کے نامہ نگار کے تاروں سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو دو یورپین نرسیں مہارانی
صاحبہ کی اسوقت تیمارداری کر رہی تھیں غائب ہیں، اور گو ایک کے متعلق
اطلاع ملی ہے کہ وہ یورپ کو سدھار گئیں۔ مگر دوسری بالکل لاپتہ ہیں۔ نیز یہ کہ
مہارانی صاحبہ کے عین انتقال کے وقت ان کے معالج ڈاکٹر رابنسن ان کے پاس
موجود نہ تھے۔ کہیں اور چلے گئے تھے۔ مہاراجہ صاحب نے مہارانی صاحبہ کے انتقال
سے پورے تین ہفتہ پیشتر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ضابطہ تحریر میں لاکر اپنا شبہہ آگرہ
کی اس لیڈی ڈاکٹر کے خلاف ظاہر فرما دیا تھا، اور گو بلا مزید تحقیقات کے کوئی نہیں
کہہ سکتا کہ مہاراجہ صاحب کا شبہہ بجا تھا یا بیجا تاہم اگر مہارانی صاحبہ کے انتقال
کے بعد خود مہاراجہ صاحب جو صرف ایک بار اور وہ بھی چند منٹ ہی مریضہ کے

کرے ہیں رہے، اپنی رفیق حیات کو زہر دلوانے کا شبہہ کیا جا سکتا ہے تو یقیناً وہ لوگ جن کے متعلق مہاراجہ صاحب نابھ نے واضح اور صریح الفاظ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو تحریراً اپنے سخت سے سخت شبہہ کی اطلاع انتقال سے تین ہفتہ پیشتر دے چکے تھے، اور ظاہر کر چکے تھے کہ لوگ ہر وقت مریضہ کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اور مریضہ کی صحت کو نقصان پہنچانے کے لاکھ موقعے انہیں حاصل ہیں، بدرجہا زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ مہارانی صاحبہ کے انتقال کے متعلق کافی تحقیقات کی جائے اور اسکے بعد ایک نتیجہ پر پہونچکر پوری کارروائی پبلک کے سامنے لائی جائے۔

یہ نہیں ہے کہ پولیس نے پکڑ دھکڑ بالکل نہیں کی۔ مگر بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ غذا کی ساری خفوت ہیں... سے پکڑا گیا تو مہارانی صاحبہ کی ایک پرانی نرس مس جیپ کو جو مدتوں سے نابھہ کے شاہی خاندان میں ملازم تھی۔ اسی کے متعلق مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس نے سب کچھ اقبال کر لیا۔ اور مہاراجہ صاحب کو رنگون بھیجنے کے مسئلہ پر غور کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس غریب بڑھیا کو بھی چودہ دن حوالات میں رکھنے کے بعد پولیس کو صرف اسقدر پتہ چلا کہ اس کے پاس ایک بلا لائسنس کا ریوالور ہے۔ اور کچھ افیون کی خلاف قاعدہ مقدار ہے۔

سابق مہاراجہ صاحب نابھہ نے اس بڑھیا کو بتایا تھا کہ بہت سے ضعیف سکھ افیون کا استعمال کرنے سے تندرست رہتے ہیں اور اس نے بھی افیون کھانا شروع کر دی تھی۔ چودہ دن حوالات میں افیون نہ ملی تو بیچاری کی بُری حالت ہو گئی۔ اور وہاں سے سخت پریشان، علیل، اور کمزور ہو کر چھوٹی، نہ خود اس نے کوئی اقبالِ جرم کیا۔ نہ مہاراجہ صاحب کو جھوٹ موٹ لپیٹا۔ اور اس بات کا صرف

ذاتی مچلکہ دیکر رہا ہو گئی کہ جب عدالت کے روبرو طلب کیا جائیگا تو حاضر ہو جائیگی۔ میں جب مہاراجہ صاحب سے ملنے منصوری گیا تھا تو میں نے سنا تھا کہ کل ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور کھانا بھی وہیں کھایا تھا۔



ڈاکٹر کچلو کا اخراج

("ہمدرد" ۱۲- اپریل سنہ ۱۹۲۷ء)

محمد علی حق کے ساتھی تھے۔ حق اگر مخالف کے ساتھ ہو تو وہ اس کے جاں نثار، ناحق اگر دوست کی متاع ہو تو وہ اس سے بیزار۔

ڈاکٹر کچلو نے جب تنظیم کی تحریک شروع کی اور اس طرح ہندوؤں کے سنگٹھن کے مقابلہ میں ایک مستقل نظام قایم کرنے کی کوشش کی تو محمد علی ان کے شدید مخالف تھے۔ محمد علی کی مخالفت ہی کی وجہ سے انہیں مجلس خلافت کی صدارت سے استعفا دینا پڑا۔

مہاراجہ اندور، ایک عورت ممتاز بیگم کے سلسلہ میں اور بمبئی کے ایک مجیز تاجر عبدالقادر باؤلا کے قتل کے الزام میں تخت حکومت سے دست بردار ہو کر ولایت چلے جاتے ہیں۔ ان کے بعد ریاست میں مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے مہاسبھائی عناصر چھا جاتے ہیں۔ ایک فساد ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمان ملزمین پر سنگین مقدمہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر کچلو اس مقدمہ کی پیروی کے لئے اندور جاتے ہیں۔ مگر نئے مہاراجہ کی حکومت انہیں اندور سے نکل جانے کا حکم دیدیتی ہے۔ پولٹیکل ایجنٹ بھی اسکی تائید کرتا ہے۔ اب ڈاکٹر کچلو دہلی آتے ہیں۔

محمد علی کا آغوش محبت کھلا ہوا ہے۔ محمد علی کا قلم کچلو کی حمایت اور حکومت کے اس ستبدانہ طرز عمل کی مخالفت کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ وہ پچھلی رنجشیں بھول جاتے ہیں۔ ایک صاف دل مسلمان کی طرح ڈاکٹر کچلو کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔

یاد رہے ریاست اندور سے ان کے خاندانی تعلقات ہیں ان کے برادر نسبتی مسٹر معظم علی بی۔اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، ایک بڑے عہدے پر وہاں فائز ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو ان زنجیروں کا خیال کرتا۔ کم از کم خاموش ہو جاتا لیکن محمد علی کے مذہب میں حق کی حمایت نہ کرنا گناہ تھا، وہ اس گناہ کا ارتکاب کیسے کرتے؟ مولف)



ہندو مسلم تنازعات جب تک اسی حصہ میں رونما ہوتے رہتے تھے جو حکومت برطانیہ کے نیچے ہیں تھا، تب تک ہندوستان والے کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک اجنبی حکومت کی برکات ہیں جنکو اطمینان اسی حالت میں نصیب ہو سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کے نصیب میں بے اطمینانی ہی لکھی رہے۔ ان بدنصیبوں کو جو نہی اطمینان نصیب ہوا اجنبی حکومت کو بے اطمینانی اور پریشانی سے سابقہ پڑا۔ ہندوستانی ریاستوں میں خواہ کتنی ہی خرابیاں کیوں نہ ہوں بفضلِ خدا اب بھی دونوں ملتیں امن و اطمینان کیساتھ

رہتی ہیں۔ سو اس اجنبی حکومت کے حسن تقدیر (یا حسن تدبیر) کو دیکھئے کہ اب ہندوستانی ریاستوں میں بھی یہ تنازعات رونما ہونے لگے۔ اور کون ہے جو اب کہہ سکے کہ یہ اس اجنبی حکومت کی برکات ہیں؟ گلبرگہ شریف میں جن لوگوں نے فساد کرایا ان کی نیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اس اجنبی حکومت کے سب سے بڑے خیرخواہ ثابت ہوئے۔

حضور نظام نے آصف جاہی سلطنت کی قدیم روایات کے مطابق اس نئے فتنے کو فرو کر دیا۔ مگر اسکا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی نہ کہ خود آصف جاہ کو نرغہ میں گھیر لیا گیا۔ اور انکی سلطنت پر انگریز مسلط کر دئے گئے۔ اب ایک ہندو ریاست کی باری تھی چنانچہ فتنہ پردازی کی شرر انگیزی نے قرعہ فال اس ہندو ریاست کے نام ڈالا جس کا سلوک اپنی ہندو مسلم رعایا کے ساتھ اسی بے تعصبی اور رواداری پر مبنی تھا جو حیدرآباد میں ہمیشہ نمایاں رہی تھی۔ مہاراجہ تکوجی راؤ ہلکر خواہ انکی خانگی زندگی کیسی ہی کیوں نہ رہی ہو، نہ انگریزی حکومت سے اور بہت سے راجاؤں اور نوابوں کی طرح بالکل مرعوب ہی تھے۔ نہ اپنی مسلم رعایا کے ساتھ بے انصافی کیا کرتے تھے۔ جس اندوہناک واقعہ کے بعد انہیں تخت و تاج چھوڑنا پڑا اسکے سلسلہ میں کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ ان کے مسلمان عمال حکومت ان کے ہم مذہب عمال حکومت سے وفاداری میں کم نہ تھے۔

آج کہا جاتا ہے کہ مصلحین کا دور دورہ ہے، اور اب دیکھنا کہ ریاست کے انتظامات کس قدر عمدہ ہو جاتے ہیں۔ ان اصلاحات کی پہلی قسط تو یہی تھی کہ مسلمان عمال کو فوج اور ملکی انتظامات سے رفتہ رفتہ علیحدہ کیا گیا اور اب دوسری قسط وہ فسادات ہیں جو ۱۴۔ اور ۱۵۔ فروری کو رونما ہوئے۔ اور انہیں کے

سلسلہ میں وہ تقلید حکومت انگلشیہ ہے جسکی اطلاع ہمیں اسی وقت خود
ڈاکٹر کچلو سے ملی ہے۔ جو اندور سے راتوں رات خارج کئے جانے کے بعد دہلی تشریف
لائے ہیں۔ اندور کے غریب مسلمانوں کا اب خدا ہی حافظ ہے۔ میر غلام بھیک نیرنگ
مولانا عرفان اور مولوی منظہر الدین اڈیٹر الامان کے اس بیان سے بھی بیشتر جو
انہوں نے تمام اخبارات میں شایع کرایا ہے۔ اندور سے کبھی کبھی چوری چھپے
اطلاعات آ ہی جاتی تہیں کہ وہاں کی مسلمان رعایا پر ہندو عمال سلطنت اور
ایک انگریز انسپکٹر جنرل پولیس اور اس کے ساتھ آئے ہوئے ہندو افسران پولیس
کے دور دورہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر مذکورۂ بالا حضرات کے بیان نے، اس
مرعوبیت کا پورا بھانڈا پھوڑ دیا تھا جس میں اندور کے پریشان حال اور لاچار مسلمان مبتلا
ہو گئے تھے۔ وہاں مسلمان ملزموں کو وکیل تک ملنا مشکل تھا۔ اور جس حکومت کے
زیر سایہ پانچ آدمیونکو ملکر عبادت تک کرنیسے عمال ریاست نے روک دیا ہو، اور
اس مذہبی فریضہ کی ادائیگی تک کو جرم ٹھہرا دیا ہو۔ کیا تعجب ہے کہ اسکی حدود میں
مسلمان اپنے بیگناہ بھائیوں تک کو ظلم و تعدی کے پنجے سے چھڑاتے اس لئے ڈرتے
ہوں کہ ملزموں کی صفائی کرنیوالے خود ہی دھر لئے جائیں گے ایسی حالت میں ضروری
تھا کہ کوئی سر بر آوردہ قانون پیشہ مسلمان باہر سے بلایا جائے۔ تاکہ ملزموں کی صفائی
کا بندوبست کر سکے۔ زبردستی اور تشدد سے حاصل کئے ہوئے اقبال جرم اور دیگر شہادتوں
کی حقیقت کا پتہ چلائے۔ صفائی کی شہادت کو مرتب کرے اور عدالت کو حق و باطل میں
تمیز کرنیکا موقعہ دے۔ ڈاکٹر کچلو اسکے لئے اندور بلائے گئے تھے۔ اور ایک بار وہاں جاکر
تمام حالات سے خود مطلع ہی نہیں ہو گئے تھے، بلکہ عمال حکومت سے جن میں کار پاری صاحب

یعنی وزیر اعظم ریاست اندور اور مسٹر ٹیلر، انسپکٹر جنرل پولیس شامل تھے، مل بھی آئے تھے۔ اور ان پر اچھی طرح ظاہر کر چکے تھے کہ وہ مسلمان ملزموں کی صفائی سے بھی زیادہ اس کے خواہشمند ہیں کہ یہ جھگڑا طول نہ کھینچے۔ اور اگر ممکن ہو تو کسی باہمی سمجھوتہ پر اسکا خاتمہ بالخیر کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت غیر معمولی صفائی سے ان بزرگوں کو اس سے بھی مطلع کر دیا تھا کہ اگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو وہ ملزموں کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کریں گے۔ اور بمجبوری اس طرح صفائی پیش کریں گے، بہتر ہو کہ انسپکٹر جنرل پولیس کسی پولیس کے افسر کو متعین کر دیں کہ انہیں صحیح حالات معلوم ہوتے رہیں۔ اور افترا پرداز لوگ انکی نقل و حرکت اور انکی وکیلانہ کارروائیوں کے متعلق غلط افواہیں نہ اڑاتے پھریں۔ چنانچہ ایک انسپکٹر پولیس اس کام کے لئے متعین بھی کر دیا گیا۔ اس پر بھی ڈاکٹر صاحب کو کارباری صاحب نے مقدمہ کی پیروی کی یوں تو اجازت نہ دی۔ مگر اُن سے فرمایا کہ آپ ریاست کے وکلا میں پانچسو روپیہ داخل کر کے شامل ہو جائیے۔ پہلے ایک مقدمہ میں مسٹر جینا اور مسٹر حیکر بھی شامل ہو چکے ہیں۔ اور یہ صرف ایک ضابطہ کی کارروائی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کچلو چلتے وقت ایک ضابطہ کی درخواست تیار کر کے وہاں کے مسلمانوں کو دے آئے تھے۔

جب وہ پھر اندور گئے کہ اب صفائی کی شہادت مرتب کی جائے۔ اور انہیں یقین تھا کہ ان کا نام معزز وکلائے اندور کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہوگا یا کر لیا جائیگا۔ اور انہوں نے ان مسلمانوں کے بیانات قلمبند کرنا شروع کر دئے جو کہتے تھے کہ ان کو ایذائیں دے دے کر اور ڈرا دھمکا کر جھوٹا اقبال جرم کرایا گیا ہے اور جھوٹی شہادت تیار کرائی گئی ہے۔ اور مسلمانوں نے جمعۃ الوداع، اور

عید کے دن جلسے کر کے اپنی مصیبتوں اور خیالات کا اظہار کیا۔ تو ۹ راپریل کی شب کو آدھی رات گئے مسٹر ٹیلر معہ ایک مجسٹریٹ اور ایک اعلیٰ افسر پولیس اور کار باری صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری صاحب کے انجمن اسلام مکان پر جہاں ڈاکٹر کچلو مقیم تھے تشریف لائے۔ اور سارے بازار کو پولیس کی ایک بڑی جماعت سے گھیر کر ڈاکٹر صاحب کو ان کے اخراج کا حکم دیا اور جب ڈاکٹر صاحب کا سامان تھوڑی ہی دیر میں بندھ چکا تو انہیں اپنی موٹر ہی میں سوار کر کے بجائے اندور کے اسٹیشن کے اندور سے دوسرے اسٹیشن پالی پر لے آئے۔ یہاں برطانوی حکومت کی برکات کا بھی ظہور ہوا۔ اور ایجنٹ گورنر جنرل بہادر کے پرائیویٹ سکریٹری نے بھی اندور کی برطانوی ریزیڈنسی کی حدود سے بھی اخراج کا حکم ڈاکٹر صاحب کو دیا تاکہ کہیں یہ ریاست کا ستم رسیدہ برطانوی حدود میں پناہ گزیں نہ ہو جائے ان دو احکام کا ترجمہ بھی ذیل میں دیا جاتا ہے۔

میں کار باری صاحب سے صرف اتنا ہی پوچھتا ہوں کہ جب ڈاکٹر کچلو نے آپ سے پہلی بار نیاز حاصل کیا تھا۔ اور آپ نے انہیں معزز وکلائے ریاست اندور کی فہرست میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ کیا اسی وقت آپ جیسے بزرگ کو اس کا علم نہ تھا کہ یہ شرر انگیز اور فتنہ خیز شخص سرکار انصاف مدار کی حضور سے پر قصور سمجھا جا کر قید فرنگ کا کئی سلاخوں والا تمغہ حاصل کر چکا ہے۔ اور کیا باوجود اس علم کے آپ کے دماغ میں اتنی سی بات نہ آئی کہ ایسے گنہگار کو اندور کے مسلمان مجرموں کی حمایت کے لئے ایک ہی بار اجازت د نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لئے اسے حامیان عدل و انصاف کا حامی سمجھ کر ملزموں کا محافظ بنایا جائے۔ بلکہ اسکا اندور میں ایک منٹ

رہنا بھی ایک حشر برپا کر دے گا۔ مگر نہ آپ کو، نہ ایجنٹ گورنر جنرل بہادر کو (جو نہ معلوم آپ کے امام ہیں یا مقلد) یہ یاد نہ آیا کہ باوجود جرائم پیشہ ہونے، اور بار بار قید فرنگ کا تمغہ حاصل کرنے کے چند ہی دن کی بات ہے کہ اس شرر انگیز اور فتنہ خیز ہستی کا پنجاب کی عدالتوں میں سرکار انصاف مدار کے مقرر کردہ انگریز ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرف سے اچھا خاصہ استقبال کیا جا چکا ہے؟

ایک دنیا جانتی ہے کہ جب اسی جرائم پیشہ شخص کو اسکے ہم خلافت اور کانگریس والوں کی قوم جرائم پیشہ میں عرصہ تک رہنے کے بعد آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے موقعہ پر، سرکار انصاف مدار انگلشیہ کے بہت سے فرزند دلبند اپنے ساتھ اڑا لیگئے۔ تو راقم الحروف کے دل کو سخت دھچکا لگا۔ اور حالت مرض میں اس کے آنسو نکل پڑے۔ اور راقم الحروف نے اس شخص کی اس کارروائی کے خلاف اپنے خیالات کا صاف صاف اظہار کیا۔ اور راقم الحروف کے متعلق کوئی ایمانداری کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ڈاکٹر کچلو کی ہر کارروائی کو سراہا کرتا ہے۔ لیکن کیا مسٹر بانیا اور دوسرے حضرات ہنود جنہوں نے آج اندور سے اس شخص کا اخراج کیا ہے، یہ کہتے ہوئے شرماتے بھی نہیں کہ جہاں یہ شرر انگیز اور فتنہ خیز ہستی جاتی ہے وہاں فسادات ضرور ہو جایا کرتے ہیں؟ کیا کوئی ہندو بتا سکتا ہے کہ کچلو کے قدوم فتنہ لزوم سے کہاں کہاں فساد ہوا؟ ایک فساد کو تو ہم جانتے ہیں اور وہ آج سے آٹھ برس پہلے ٹھیک انہی دنوں میں جلیانوالہ باغ میں اسکے دھرمسالہ (وادیٔ کانگڑہ) میں بطور قیدی کے قدوم فتنہ لزوم کے باعث ہوا تھا۔ اور ایک اور فساد جینتو میں ہوا۔ مگر کیا یہ مسلمانوں کو

ہندوؤں کے خلاف اُبھارنے والا، ہندو مسلم تعلقات کو سدھرنے نہ دینے والا، مسلمانوں کی فوج کو لیکر ہندوؤں پر حملہ کرنے گیا تھا، یا ہندو مسلم دونوں کو وطن کی آزادی کی خاطر، ان دونوں موقعوں پر قید فرنگ سے سرفراز کیا گیا تھا؟ میں خود اسی کچاؤ کے اس زمانے کے خیالات سے صاف صاف اپنا اختلاف ظاہر کر چکا ہوں جبکہ لالہ لاجپت رائے کی بغویتوں اور تعصبات سے تنگ ہو کر اس نے بلگام میں آواز بلند کی تھی۔ لیکن آج مجھ سے زیادہ اس کا ہمخیال کوئی نہیں کہ اندور کے عمال حکومت (یا انگریزی حکومت کے غلام) ہندو مسلم تعلقات کو بد سے بدتر بنا رہے ہیں، اور ان کا وہ حکم جس کے باعث ڈاکٹر کچلو اندور سے اس طرح خارج کئے گئے کہ نہ ان پر کوئی الزام لگا کر ان سے جواب لیا گیا نہ انکو حکم ملنے ہی پر کوئی موقعہ دیا گیا کہ تعمیل سے پیشتر وہ اپنی بریت کر سکیں۔

ان ہندوؤں کے مذہبی تعصبات اور سیاسی بے انصافیوں کی جنہوں نے اسے جاری کیا ہے یا جاری کرایا ہے پوری قلعی کھول رہا ہے، کہاں ہیں اسمبلی کے سوراجی اور قوم پرور، ہندو سبھائی، ہندو جو بنگال کے جلاوطنوں کی رہائی کے لئے حکومت کو امسال بھی اسمبلی میں "شکست فاش" دے چکے ہیں؟ اگر ان میں ذرا بھی اصول کا پاس ہے تو آئیں اور اندور کی حکومت اور اس کے برطانوی کارفرما کے اس ظلم و تشدد کے خلاف آج ہی سے جدو جہد شروع کریں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ ہندوؤں کا شور و غوغا فقط ہندوؤں کی حمایت میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر ہندوستانی کی حمایت میں ہوتا ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

نقل ریزولیوشن کابینہ نمبر ۶۱ مورخہ ۹- اپریل ۱۹۲۷ء (مہر)
مضمون :-

رجسٹرار ہائی کورٹ کا مکتوب نمبر ۲۰۱۸ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۲۷ء جس کے ہمراہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو بی-اے- پی-ایچ-ڈی- بیرسٹرایٹ لا کی اصل درخواست مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۲۷ء شامل ہے جس میں ریاست اندور کے اندر بطور ایک ہائیکورٹ وکیل کے مقدمات کی پیروی کی اجازت طلب کی گئی ہے۔

حکم :-

ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے گزشتہ واقعات کے متعلق جو تحقیقات کیگئی تھی اس سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک سرگرم شورش پھیلانے والے ہیں۔ وہ کم سے کم دو مرتبہ جیل جا چکے ہیں۔ اور انکی کارگذاریوں کا نتیجہ اکثر کسی نہ کسی قسم کی ابتری کی صورت میں نکلا ہے۔ گزشتہ فروری کے بلوہ کے بعد ڈاکٹر کچلو دو مرتبہ اندور آئے اور ایک ہائیکورٹ وکیل کے طور پر اپنے نام کے اندراج کی درخواست دی۔ حکومت کے پاس اس بات کے باور کرنے کے لئے معقول وجوہ ہیں کہ جتنے عرصہ سے وہ یہاں ہیں انہوں نے فتنہ انگیز خیالات اور جھوٹے بیانات کی اشاعت کی ہمت افزائی کی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مخاصمانہ خیالات بڑھانے کی کوشش کی ہے اور مسلمانوں کو اُبھارا ہے کہ حکومت کی پروانہ کریں اور قانون شکنی کریں۔

اس ریاست میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات مخلصانہ رہے ہیں، اور حال کے فسادات کا بھی دونوں جماعتوں کے پرانے اور معزز افراد پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ مگر حکومت واقف ہے کہ دونوں فرقوں میں کچھ عرصہ سے بیرونی اثرات

کام کر رہے ہیں۔ اور ان میں نزاع کرانے کی اور حال میں کشیدگی کو زیادہ کرنے کی چپکے
چپکے کوششیں، مگر ایک نظم کے ساتھ جاری ہیں۔ جہلا اور دیوانے اشخاص کے لئے
یہ بالکل آسان ہے کہ شورش پھیلانے والوں اور فتنہ انگیز پروپگنڈا کرنیوالوں کے
بہکانے میں آجائیں اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ اپنی رعایا کو اس قسم کے اثرات سے محفوظ
رکھے جو دوامی خطرہ کا باعث ہیں۔ اور امن وقانون قایم رکھنے کے راستے میں اور فرقہ
وارانہ دوستی اور اتحاد از سر نو پیدا کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر کچلو اور بعض دیگر اشخاص اس قسم کا تخریبی پروپگنڈا کرتے رہے ہیں
اور اس لئے انہیں ہائیکورٹ کے وکیل کے طور پر درج رجسٹر کرنے کے لئے ایک موزوں
شخص نہیں خیال کیا جا سکتا۔

اسی سبب کی بنا پر انہیں حکم دیا گیا ہے کہ فوراً ریاست چھوڑ دیں اور حکومت
کی اجازت کے بغیر پھر ریاست میں نہ آئیں۔

۲۱۷۲ء از دفتر چیف سکریٹری اندور مورخہ ۹ اپریل ۱۹۲۶ء

نقل حکم ڈاکٹر سیف الدین کچلو بی۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔بیرسٹرایٹ لا کو بغرض
اطلاع تعمیل مرسل ہے۔

انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ایسے وقت پر ایسی جگہ سے اور ایسی سمت میں روانہ
ہوجائیں کہ جیسی ہدایت انہیں اس افسر سے ملے جو یہ حکم ان تک پہنچائیگا۔

مہر

حسب الحکم

(دستخط) جی آر نائیٹ۔ چیف سکریٹری وزیر اعظم

مندرجۂ بالا حکم ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے پاس ۹ اپریل کو رات کے بارہ بجے خان بہادر مسٹر محمود مجسٹریٹ درجہ دوم، مسٹر بھنڈارکر پرائیویٹ سکریٹری وزیر اعظم، انسپکٹر جنرل پولیس، اور سپرنٹنڈنٹ شہر لیکر گئے، اور اسی شب میں تین بجے صبح کی گاڑی سے جو بالی سے جاتی تھی۔ انہیں ریل میں سوار کر دیا گیا۔

ڈاکٹر کچلو کے اخراج کا دوسرا حکم :-

ایجنٹ گورنر جنرل وسط ہند کی طرف سے ڈاکٹر کچلو کے اخراج کا دوسرا حکم صادر ہوا :-

چونکہ میں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے خلاف ایک حکم زیر دفعہ ۱۰۰ قانون برائے انتظامات اندور ریزیڈنسی بازار جس کا نفاذ حکومت ہند کے محکمہ جات خارجہ و سیاسی کے اعلان ۱۳ء ۲ آئی، بی مورخہ ۸ جولائی ۱۹۱۰ء کے ماتحت ہوا تھا جاری کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جس سے انہیں اندور کے ریزیڈنسی بازار سے خارج کیا جائے۔ میں بنا بر آں یہ اعلان مذکور الصدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے لئے جاری کرتا ہوں جس میں ان سے چاہا گیا ہے کہ اگر وہ مذکورہ بازار کی حدود میں ہوں تو ریزیڈنسی بازار سے فوراً چلے جائیں۔ اور انہیں منع کیا گیا ہے کہ ان بازاروں میں بلا میری اجازت کے پھر نہ داخل ہوں۔

ایجنٹ گورنر جنرل وسط ہند

اندور ۹۔ اپریل ۱۹۲۷ء

یہ نوٹس ڈاکٹر کچلو کو پالی ریلوے اسٹیشن پر تقریباً ڈھائی بجے ملا تھا جبکہ وہ روانگی کے لئے ریل گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔



سامراج دشمنی

فہرست مضامین

ایشیاٹک بل ۶۷

برطانیہ کے سامراجی تعلقات ۹۴

چین اور ہندوستان ....

ایشیاٹک بل

(ہمدرد ۱۶-۱۷-۱۸- اکتوبر ۱۹۲۵ء)

جنوبی افریقہ کی سرسبزی و شادابی، زرخیزی اور رعنائی میں ہندوستانیوں کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن کام نکل جانے کے بعد جس بدسلوکی کا مستحق ہندوستانیوں کو سمجھا گیا اسکی نظیر ملنا بھی مشکل ہے۔ وہاں آئے دن ایسے قوانین بنتے رہتے ہیں جو ہندوستانیوں کے لئے اہانت آمیز ہوتے ہیں۔

جس طرح آج کل "بیکنگ بل بل کے خلاف ہندوستان میں مظاہرے ہورہے ہیں اسی طرح اس زمانہ میں جنوبی افریقہ کے ایک ہندوستان آزار" ایشیاٹک بل" کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔

دہلی کے ایک عام جلسہ میں اس موضوع پر محمد علی نے مندرجہ ذیل تقریر کی

مولف

آج ہم یہاں احتجاج کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں اور اپنے جنوبی افریقہ کے بھائیوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری

کسی چیز میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ بدیشی کپڑا اسی طرح خریدا اور پہنا جاتا ہے۔ یہ آپ کے بزازہ والے بدیشی کپڑے فروخت کرتے اور خوب پیسے کماتے ہیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ پیسے اس قوم کو کموا دیتے ہیں جس کے خلاف آج صدائے احتجاج بلند کی جارہی ہے۔ سرکاری اور امدادی اسکولوں اور کالجوں میں اسی طرح تعلیم حاصل کی جارہی ہے۔ کونسلوں میں اسی طرح داخلہ ہو رہا ہے۔ اور اب تو مسٹر تانبے سوراجی کونسل سے ایگزیکٹو کونسل میں بھی داخل ہو گئے۔ پھر کیا حق ہے ہم کو احتجاج کرنے یا اظہار ہمدردی کا!

جس وقت ۹۹-۱۸۹۸ء میں انگریزوں اور بور لوگوں سے جنوبی افریقہ میں جنگ ہو رہی تھی۔ اس زمانہ میں میں ولایت میں تھا۔ اور میرے ساتھ دو اور ہندوستانی طالب علم میرے دوست اور ساتھی تھے۔ ایک پنجاب کے مسلمان اور دوسرے پونہ کے ایک مرہٹہ عیسائی، میں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا اور میرے پنجاب کے مسلمان دوست کیمبرج میں۔ اور پونہ کے مرہٹہ عیسائی دوست پہلے آکسفورڈ آئے، پھر لندن ہی میں رہ گئے۔ ہم تینوں ایک ساتھ سول سروس کے امتحان میں بیٹھے، پونہ کے عیسائی دوست پاس ہو گئے مگر ہم دونوں مسلمان فیل ہو گئے۔ لیکن خدا کی شان کہ پنجاب کے وہ مسلمان سر میاں فضل حسین آج وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہیں اور چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپے دس آنے آٹھ پائی ماہوار پا رہے ہیں اور دوسرے عیسائی صاحب مسٹر بھوراسی محکمہ کے سیکریٹری ہیں اور تین ہزار پانسو روپے پاتے ہیں لیکن ہم دہلی کے بازاروں میں جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں، اور لوگوں سے کھدر پہننے کے لیے کہہ رہے ہیں ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم ، در دیوان عشق

او بہ صحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

اور اس پر لطف یہ کہ یہ دونوں صاحبان اسی محکمہ میں ہیں جس کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے اور یہ اسکے لئے حکومت ہند کی طرف سے خط وکتابت کر رہے ہیں۔ ولایت میں بور لوگوں سے جنگ کے وقت یہ دونوں حضرات میری ہی طرح انگریزوں کو "کوسا" کرتے تھے یعنی مجھ باغی سے کسی طرح کم بور لوگوں کے حق بجانب ہونے کے قایل نہ تھے، اور انگریز جو کہہ رہے تھے کہ ہم بوروں سے اسلیے لڑ رہے ہیں کہ وہ ہمارے بادشاہ کی ہندوستانی رعایا پر ظلم وستم کرتے ہیں اور انہیں جنوبی افریقہ سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اسکے نہ یہ دونوں قائل تھے اور نہ میں تھا۔ معلوم نہیں اب جبکہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں پر یہ ظلم وستم ہو رہا ہے تو اب بھی یہ حضرات اسی طرح اس حکومت کو "کوستے" ہوں گے یا نہیں، جو بوروں کے اس تمام ظلم کو روا رکھ رہی ہے۔

میاں فضل حسین نے کونسل آف اسٹیٹ میں بہت کچھ کہا، لیکن اس سے ہندوستانیوں کی کوئی تشفی نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کا غم وغصہ اور بڑھ گیا۔ اسی طرح مسٹر بھور نے اسمبلی میں پیہم سوالات کے جواب میں جو کچھ کہا وہ بھی ناقابل اطمینان تھا۔ میرے سامنے ہر طرف سے ان پر سوالات کی بوچھار ہو رہی تھی۔ مگر وہ نہایت ہوشیاری سے بغیر کچھ کہے ہوئے جواب دیدیتے تھے۔ اور جس طرح شکاری کتوں سے پیچھا بچا کر لومڑی اپنے غار میں چھپ جاتی ہے اسی طرح وہ بھی صاف بچکر نکل گئے۔

جسوقت جنوبی افریقہ میں بور وار ہو رہی تھی اسوقت انگریزوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا تھا کہ ہم اسلیے جنگ کر رہے ہیں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی ہو رہی ہے

لیکن آج وہی بدسلوکی خود ہندوستانیوں کے ساتھ کی جا رہی ہے۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے "حق" کے نام پر انصاف کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن صاحبو وہ کب کہتے ہیں کہ ہم میں انسانیت ہے۔ آپ نے بہت انسانیت پر زور دیا تو وہ یہہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم اولاد آدم ہی نہیں ہم تو بقول ڈارون بندر کی اولاد ہیں۔ اسوقت میرے بھائی آندر صاحب کیا انکی پوزیشن سے اپیل کریں گے؟ اسی طرح حق کا خیال فضول ہے۔ بقول حالی مرحوم اس دنیا میں ؎

حق ہے غالب کا کہ رگڑے اور دے مغلوب کو

ہے یہی مغلوب ہونیکا مآل انجام کار

کیا قومیں یونہی بغیر ہاتھ پیر ہلائے بغیر مصیبتیں جھیلے ہوئے بغیر قربانیاں کئے ہوئے غالب ہو جایا کرتی ہیں۔ حق تو صرف غالب کا ہے۔ اور اس صورت میں وہ جو کچھ بھی کرے قابل شکایت نہیں۔ بلکہ شکوہ کی بات تو یہ ہے کہ ہم مغلوب کیوں ہوئے لیکن مغلوب ہو کر ہمارے ہندوستانی بھائی اسقدر سنگدل ہو گئے ہیں کہ اگر جنوبی افریقہ کے اکھ پتی اور کروڑ پتی بھی فاقہ کشی کرنے لگیں تب بھی انکی آنکھوں سے آنسو نہ نکلیں گے

ہم یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ جنوبی افریقہ کی حکومت ہمارے ہندوستانی بھائیوں کی تجارت کو تباہ کر کے ان کو جنوبی افریقہ چھوڑنے پر مجبور کرنا چاہتی ہے، اور انگریزی حکومت اسکا مداوا نہیں کرتی۔ اسلئے ہم دونوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمیں شرم نہیں آتی کہ ہمارا بزازہ خود انگریزوں کا بنایا ہوا کپڑا بیچکر روپیہ کماتا ہے۔ اور انہیں انگریزوں کی مدد کرتا ہے۔ ایک طرف انگریزوں کو دشمن کہنا

اور پھر دوسری طرف انہی دشمنوں کی مدد کرنا، یہ ہے اپنے جنوبی افریقہ والے بھائیوں کے ساتھ ہماری رفاقت۔

جب نان کوآپریشن شروع ہوئی، تو مہاتما گاندھی نے اپنے ایک گجراتی، یا کاٹھیاواڑی دوست سے کہا کہ تم بھی نان کوآپریشن کرو۔ مگر ان دوست نے نہایت ایمانداری سے کہا کہ مہاتما جی! میں تو انہی انگریزوں کی بدولت مالا مال ہوگیا۔ آج لکھ پتی سے بھی زیادہ ہوں۔ میں کیوں ناشکری اور نمک حرامی کر دوں"

یہ صاحب ایک انگریزی کمپنی کے جو کپڑے کی تجارت بھی کرتی تھی، دلال تھے دلالی کا کمیشن غالباً آٹھ آنہ سیکڑہ تھا۔ اس پر مہاتما گاندھی نے کہا کہ جب تم آٹھ آنہ فیصدی دلالی لے کر کروڑ پتی ہو گئے تو جسکو ساڑھے نانوے روپے سیکڑہ ملتے ہونگے اس انگریز کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ کیا وہ اسی ہندوستان کے روپے سے ارب پتی نہ ہوگیا ہوگا؟

ہم اپنے جنوبی افریقہ کے بھائیوں کی تجارت تباہ ہو جانے پر اگر سچے دل سے ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ تباہ نہ ہوں تو ہم کو اس ملک کی تجارت کی بھی مدد نہ کرنا چاہئے۔ جو ہم پر حکمران ہے اور ہمارے جنوبی افریقہ کے بھائیوں کی تباہی کے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن ہم بذاتِ خود ہندوستان کی اقتصادی تباہی کے روکنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ خود انگریزی کپڑا پہنتے ہیں، اور انگریزی کپڑے کی تجارت کرتے ہیں۔

میں نے اپنے دو دوستوں کا نام لیا ہے جو میرے ساتھ اسوقت انگلستان میں پڑھتے تھے۔ جب میں خود وہاں پڑھتا تھا اور یہ اسلئے کہ آج جبکہ میں یہاں

انگریزی حکومت کی غفلت اور بے اعتنائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہا ہوں وہ اس میں شریک ہیں اور یہی نہیں بلکہ اسی محکمہ پر مامور ہیں جس کا تعلق ہماری صدائے احتجاج سے ہے۔ جب تک ہم اس طرح حکومت کے ساتھ تعلق رکھیں گے حکومت ہماری صدائے احتجاج کی مطلق پروا نہ کریگی۔

ایک طرف مسلمان ہیں جو چلاتے ہیں کہ ساری نوکریاں ہندوؤں کو مل جاتی ہیں۔ ایک طرف ہندو ہیں جو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو نوکریاں انکی آبادی میں نسبت سے زیادہ ہرگز نہ ملیں۔ بلکہ اس سے بھی کم ملیں۔ اس لئے کہ وہ ان نوکریوں کے اہل نہیں۔ لیکن میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ خدا کی قسم ہندو یہ نوکریاں لیکر ہرگز تم سے بہتر حالت میں نہیں، بلکہ تم سے زیادہ خراب حالت میں ہیں جس قوم کو بھی نوکریاں زیادہ دی جاتی ہیں وہ فائدہ میں نہیں اور جو نوکریاں زیادہ مانگے، وہ کوئی فائدہ کی چیز نہیں مانگ رہا ہے۔ مسلم لیگ ہو یا ہندو سبھا۔ مسٹر جینا ہوں یا لالہ لاجپت رائے، دونوں غلطی پر ہیں۔ مسلمان اگر نوکری کے دلدادہ ہوں تو اسقدر تعجب نہیں۔ کل تک یہ ہندوستان کے حکمراں تھے اور آج گئی گزری حالت میں ہیں۔ پھٹے پرانے چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں۔ اور نوکری پر اپنا دارومدار سمجھتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندو بھائیوں میں پھر بھی علم ہے، روپیہ ہے۔ روزگار ہے جس سے مسلمان ایک بڑی حد تک محروم ہیں۔ انگریزوں کی نوکری کوئی کرے، خواہ میرے بھائی میاں فضل حسین ہوں، یا میرے بھائی مسٹر بھور، دونوں غلامی میں مبتلا ہیں۔ غلامی کے لئے رال ٹپکی پڑتی ہے۔ پھر ہمیں کیا حق ہے کہ ہم کہیں کہ جنوبی افریقہ کے بھائیوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

آج ہم ایک طرف انگریزوں کی شکایت کرتے ہیں اور دوسری طرف خود ہندوستانی نان کوآپریشن کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ لیجئے آپ کی نان کوآپریشن کی تحریک تو مردہ ہو گئی۔ اچھا خیر ایسا ہی ہوا ہو گا۔ بدیشی کپڑے پہننے والے۔ کھدر پہننے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کھدر کی کوئی بات نہیں پوچھتا۔ خیر یوں ہی سہی۔ مگر ایسا کہنے والے شرماتے نہیں کہ انہی کی کمزوری اور تن آسانی کے باعث ہندوستان آج بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایسا کہنے والوں کو کیا حق ہے کہ وہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف کا تقاضہ کریں!

انگریز اپنی کسی تحریک کا اسطرح مضحکہ نہیں اُڑاتے۔ بلکہ وہ آخر دم تک اسکے لئے کوشش کرتے ہیں۔ بور وار میں پہلے تو انگریز یہ سمجھ کر ہنسی خوشی کھیلتے کودتے گئے کہ تین مہینے میں پالا مار لیں گے۔ اسی لئے وہ پولو کھیلنے کی لکڑیاں اور گیندیں ساتھ لیتے گئے تھے۔

اول اول لارڈ کچنر تار پر تار بھیجتے تھے کہ آج ہمارے "بیگ" میں اتنے بور مجروح اور اتنے مقتول تھے، گویا انسانوں کا شکار کھیلا جا رہا تھا۔ اور شکاری اپنی قادر اندازی پر، شکار کی تعداد گنا کر فخر کر رہے تھے۔ مگر فتح تین مہینے میں نہیں ہوئی۔ لڑائی نے طول پکڑا۔ اور انگریزوں کو شکستیں بھی ہوئیں اور وہ گھر بھی گئے۔ مگر کیا انہوں نے اپنی فوج کا مضحکہ اُڑایا؟

جب انگلستان کے لوگ پریشان ہو گئے، اور ہر شخص زرد رو ہو رہا تھا۔ اور سر جھکائے چلتا تھا۔ اور وہ جمعہ بھی آیا جس دن انگریزی شکستوں کے دن گن

نام "بلیک فرائڈے" یعنی "کالا جمعہ" پڑگیا۔ اسوقت بھی انگریز لڑائی جاری رکھنے پر مضبوطی سے قایم رہے۔ اور اسوقت بھی انہوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس جنگ میں آخر دم تک لڑتے رہیں گے۔ اور بور لوگوں کو صلح کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ایک ہم ہندوستانی ہیں جو اپنی بڑی سے بڑی اور مفید سے مفید تحریک کا بھی جب ہمیں اپنی ہی کم ہمتی سے کامیابی فوراً حاصل نہ ہو سکے۔ مضحکہ اڑانے لگتے ہیں۔ حقیقت میں ہم وہ غلام قوم ہیں کہ انگریز ہم کو گھوڑوں کی طرح جوت کر ہمارے کوڑے بھی لگائے تب بھی ہم اپنی غلامی کی زنجیر کو توڑنا پسند نہ کریں گے۔

جنوبی افریقہ کے سفید لوگ ہمارے بھائیوں کو، جنوبی افریقہ سے یہ کہہ کر نکالتے ہیں کہ وہ گندے ہیں۔ اس پر ہم صدائے احتجاج بلند کرتے آئے ہیں لیکن حقیقتاً گندے ہمارے جنوبی افریقہ کے بھائی نہیں بلکہ گندے ہم ہیں، جو غلامی کی نجاست میں اب تک پڑے ہوئے ہیں اور اسی کو پسند کرتے ہیں۔ ہم وہ گندی قوم ہیں کہ انگریز ہماری کھالوں کا جوتہ بنا کر پہنیں تب بھی ہماری تذلیل نہ ہوگی۔ بلکہ انگریزوں کے پاؤں گندے ہو جائیں گے۔

یہ تو انگریزوں کا حال تھا جنکو بالآخر فتح ہوگئی۔ مگر شکست خوردہ قوم کا کیا حال تھا؟ بور ایک چھوٹی سی قوم تھی، لیکن ہماری طرح ذلیل و بزدل نہ تھے، وہ کسی طرح ہار نہ مانتے تھے۔ اس چھوٹی سی قوم نے بھی ۲۶ ہزار کو اس جنگ کی نذر کر دیا۔ مگر ان ۲۶ ہزار میں سپاہی صرف پانچ ہزار تھے باقی عورتیں، بوڑھے اور بچے تھے۔ جب مرد، میدانِ جنگ میں تھے اور کسی طرح قابو میں نہ آتے تھے تو

انگریزوں نے یہ تدبیر سوچی کہ انکی عورتوں کو اور بچوں کو، اور بوڑھوں کو گھروں سے نکال کر کنسن ٹریشن کیمپ "میں اکٹھا کیا۔ جہاں صفائی کا نام نہ تھا۔ اور پانی اس قدر خراب تھا کہ انہیں ٹائیفائڈ ہوگیا۔ اور ۲۱ ہزار ہتھیار نہ اُٹھانے والے مرض میں مبتلا ہو کر لارڈ کچنر کے "بہک" میں داخل ہو گئے۔

یہ ہے عورتوں کی عزت و احترام جو انگریزوں نے کیا۔ جن کا دعویٰ ہے کہ ہم ایشیائی لوگ عورتوں کا احترام نہیں کرتے۔ کیا بور لوگوں نے ملک کے فتح ہو جانے پر انگریزوں کی نوکری کی؟ ہرگز نہیں۔ انہوں نے فاتح قوم کے ساتھ موالات سے قطعی انکار کر دیا۔ اور آج ایک ہندوستان ہے کہ اس کا ایک فرزند حکومت کا ممبر ہے اور چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپیہ ۱۰ آنے ۸ پائی پا رہا ہے اور دوسرا اس کا سکریٹری، جو تین ہزار پا لنو لے رہا ہے۔ ایک تیسرے صاحب ڈاکٹر تانبے مرہٹہ ہیں جو سوراج پارٹی کے ممبر، اور باوجود اس کے ابھی حال میں گورنر کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بن گئے ہیں۔ اور پانچہزار پائیں گے۔

ڈاکٹر مونجے صاحب جن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ڈنڈا لیکر مسجدوں کے سامنے باجہ بجوانے میں مصروف ہیں۔ اور جن کو اپنے مرہٹوں کی بہادری پر مسلمانوں کے خلاف بڑا ناز ہے۔ حالانکہ وہ پانی پت تک ریٹرن ٹکٹ لیکر آئے تھے اور چلے بھی گئے۔ وہ ڈاکٹر تانبے کی اس حرکت پر فرماتے بھی ہیں تو یہ کہ "ابھی ملازمت قبول کرنا نہ چاہئے تھا" بظاہر وہ وقت بھی آنیوالا ہے جب ڈاکٹر مونجے صاحب خود ملازمت قبول فرمالیں گے۔ لیکن پھر بھی صدائے احتجاج حکومت کے خلاف ضرور بلند کیجاتی رہیگی۔

یہ ہے ہمارے ہندوستانیوں کی حالت۔ پھر ہم کیا توقع کر سکتے ہیں کہ حکومت یا یورپین قوم ہماری بات سنے گی! لیکن بور لوگوں نے باوجود ملک فتح ہو جانے کے سب انگریزوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا اور انہیں ناکوں چنے چبوائے تھے۔ آخر کار جب گول میز کانفرنس ہوئی جس میں آزاد جنوبی افریقہ کا دستور تیار کیا گیا اور پارلیمنٹ میں پاس کرنے کے لئے مسودہ پیش کیا گیا تو انگریزوں نے کہا کہ اس میں کئی خامیاں ہیں اور ایک جگہ تو صرف یا نحو کی غلطی ہے۔ مگر انگلستان کے وزیر اعظم نے کہا۔ خواہ کچھ بھی ہو ہمیں اسے تسلیم کرنا پڑیگا۔ کیونکہ بور لوگوں کے ساتھ طے ہو گیا ہے کہ بلا کسی تغیر تبدل کے یہ مسودہ اسی طرح منظور کیا جائیگا۔ چنانچہ اس مودہ میں آجتک ایک ایڈورب (متعلق فعل) کی غلطی رہ گئی ہے۔ ایک مسودہ قانون وہ تھا جو اسطرح منظور کیا گیا۔ اور ایک آج مسز لسبنٹ دولت مشترکہ ہند کے قانون کا مسودہ لیکر گئی ہیں جس کا حشر معلوم ہے کہ کیا ہوگا۔ اسے اس شخص کے سپرد کر دیا گیا جو پارلیمنٹ کے مسودات قانون کی غلطیاں درست کرتا ہے۔ اسکی مثال تو بعینہ اس شخص کی سی ہے جو راستہ میں کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور لوگوں نے پوچھا کہ کیا تلاش کر رہے ہو؟ تو کہا کہ بھائی ایک نعل ملگیا ہے۔ اگر تین اسی طرح اور ملجائیں تو گھوڑا خرید لوں۔ گویا مسودہ قانون میں صرف و نحو کی غلطیاں نہ رہیں گی تو مسودہ ضرور اور فوراً پاس ہو جائیگا۔

بھائیو! ایسے قانون یوں نہیں پاس ہوا کرتے ان کے پاس کرانے کے لئے وہ قربانیاں درکار ہیں جو خود بور قوم نے اور انگریزی قوم نے جن کے خلاف تم صدائے احتجاج بلند کر رہے ہو۔ اپنے اپنے ملک کی آزادی اور عزت کے لئے کی تھیں۔ آل پارٹیز

کانفرنس کے زمانہ میں جب مسز بسنٹ نے یہ مسودہ میرے سامنے پیش کیا اور بھائی شوکت علی صاحب نے بھی مجھ سے کہا کہ ان بڑی بوڑھی کا خیال کرو، یہ تو ہماری ماں سے بھی زیادہ عمر کی ہیں۔ ان کی بات رکھ لو۔ تاہم میں اس پر غور کرنیسے برابر انکار ہی کرتا رہا۔ اسوجہ سے کہ میں جانتا تھا کہ اسکا کیا حشر ہوگا؟ جبتک ہم غلام رہیں گے اور آپس میں لڑتے رہیں گے ہمارے مسودات کی کیا قدر وقیمت ہو سکتی ہے؟

آپ جو یہ کہتے ہیں کہ جبتک انگریز رہیں گے پھوٹ رہیگی۔ یہ میں نے مانا کہ درست ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ جبتک ہم میں پھوٹ رہیگی اسوقت تک انگریز ہم پر مسلط رہیں گے۔ کیا قربانی کی گائے پہاڑی دھیرج ہی سے گذرنی چاہئے یا پانی پت کے بازار ہی سے گذر کر نگلا گھاٹ کی طرف جانے سے خدا مل گیا۔؟ میں کہتا ہوں کہ دونوں میں سے کسیکو ہرگز نہیں ملا۔ جبتک آپس کی لڑائی اور غیروں کی غلامی کو چھوڑ کر خدا کی غلامی نہ کرو گے اسوقت تک نہ آزادی مل سکتی ہے نہ خدا۔

(۲)

اب میں ایک نہایت اہم نکتہ کی طرف آتا ہوں جس کا سمجھنا ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے ضروری ہے۔ مجھے اپنے بھائی گردھاری لال کی تقریر سے تقریباً کلیتہً اتفاق ہے۔ لیکن انہوں نے ایک فقرہ کہا جس کے خلاف مجھے سر ہلانا پڑا۔ اور ظاہر کرنا پڑا کہ میں ان سے اس بارے میں اختلاف رکھتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا ترکوں کو ملک کے باہر روپیہ بھیجنا ایک غلط کارروائی تھی اور ہم کو اس روپیہ کو ملک ہی میں خرچ کرنا چاہئے تھا۔

اسکی حقیقت یہ ہے کہ یہ غیر ملکی ترکوں کی مدد نہ تھی بلکہ خود ہماری اپنی مدد تھی

اسلامی نقطۂ نظر سے ترک اور ہندوستان کے مسلمان، اور عرب، اور ایرانی اور افغانی سب بھائی بھائی ہیں۔ انسان کی برادری نسل اور نسب کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ اسطرح تو بلّی کتوں کی نسل چلتی ہے جیسے انگورہ کی نسل کی بلّی، اور جمنا پار کی بھینسیں، انسان کی نسل روح اور دماغ سے ہوتی ہے۔ گندے پانی کی بوند سے نہیں ہوتی۔ اسلام نے کہدیا کہ سب انسان ایک ہی نسل ہیں۔ اور آدم کی اولاد ہیں اور وہ مٹی سے بنے ہیں۔ ترکوں کے ساتھ ہمارا تعلق روحی اور دماغی تعلق ہے وہ اور ہم ایک عقیدہ اور ایک مسلک کے پابند ہیں۔ اور اسوجہ سے ہمارا ان کے ساتھ رشتہ ہے۔ ہمارے اور ان کے یہاں قانون ازدواج اور ترکے کی تقسیم یکساں ہے۔ روحی اختلاف کے باعث حضرت نوح کا بیٹا ان کی اہل سے خارج ہو گیا۔ اور سگِ اصحاب کہف کے متعلق مشہور ہے کہ نیکوں کی صحبت میں آدمی بنگیا۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف عقاید کے لوگ ایک ہی زمین میں پیدا ہوں اور ساتھ ساتھ رہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوں اور اس بنا پر ان میں رشتۂ ہمسائیگی کے حقوق کو اسلام نے تسلیم کیا ہے اور قایم رکھا ہے۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ،، حُبِ وطن ایمان کا ایک جزو ہے۔ ہم نے ترکوں کی مدد نہیں کی بلکہ اسلام کی مدد کی اس لیئے کہ اسلام کا دنیوی اقتدار زیادہ تر ترک کی حکومت کیساتھ وابستہ تھا۔ اگر وہ تباہ کردیا گیا ہوتا تو پھر ہمارے لیئے ایک خدا کو ماننا اور اسلام کا کلمہ پڑھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اور ہماری شریعت کو وحشیانہ اور ناپاک کہا جاتا۔ مثلاً انگلستان میں کوئی مسلمان ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرے تو یہی نہیں کہ اُسے حرام کاری کے مرادف سمجھا جائیگا۔ بلکہ اس شخص پر بگمی، یعنی

ازدواج ثانی کی فرد قرارداد جرم لگادی جائیگی ۔جس کے پاس قوت ہوتی ہے وہ برے کو اچھا کہے تو اچھا ہو جاتا ہے ۔ اور اچھے کو برا کہے تو برا ہو جاتا ہے ۔

اسلام میں چار نکاح تک جائز ہے اور فقط اسی مذہب نے تعداد ازدواج پر قید لگائی ہے ۔ ورنہ کسی اور مذہب میں از روئے مذہب اس قسم کی کوئی قید نہیں لیکن جہاں چار بیویوں تک کی اسلام میں اجازت دی گئی ہے وہاں پانچویں عورت کو آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی ممنوع ہے ۔یورپ میں کتنے شخص ایسے ہیں جنکی نسبت یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ وہ حقیقتاً چار پر بھی اکتفا کرتے ہیں اور منھ دیکھنے کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ۔عورتوں کو اسلام میں صرف ایک مرد سے شادی کرنیکی اجازت ہے اور وہ اس پر قایم ہیں ۔لیکن یورپ میں تو آج یہ حالت ہو گئی ہے کہ مسز ڈلنٹن جیسی عورت کا ، جس کے شوہر کے علم میں تھا کہ وہ کئی مردوں سے مانوس تھی ۔مسز ڈلنٹن کا وجود شاذ و کمیاب نہیں ہے ۔ وہاں عورتوں کا لباس کم ہوتے ہوتے حیا سوزی کے درجہ تک پہونچ گیا ہے ۔غیر مردوں کے ساتھ ناچ ہوتا ہے شرابیں پی جاتی ہیں اور پھر کالی جگہوں میں بیٹھا جاتا ہے (مسٹر آصف علی لوگوں کو سمجھا تو دیجئے کہ کالی جگہ کیا ہوتی ہے) یہ ناچ کے کمرے کے آس پاس ایسے تاریک مکانات ہوتے ہیں جہاں اوٹ کے پیچھے یا علیحدہ کمروں میں غیر مرد اور عورت ملکر ، مگر اور مرد یا عورتوں سے الگ بیٹھا کرتے ہیں ۔ یہ سب جائز ہے لیکن ہماری شریعت جس میں چار بیویوں تک کی اجازت ہے مگر پانچویں کو آنکھ اٹھا کر دیکھنا ممنوع ہے خلافِ اخلاق اور ناپاک ہے ۔صفائی ہی کو لیجئے کہ آبدست لئے بغیر غسل کیا جاتا ہے اور ٹب کا وہی پانی سارے جسم پر ڈالا جاتا ہے لیکن یہ گندے نہیں گندے

ہم ہیں اور ہمارے جنوبی افریقہ کے بھائی جنکو اسی بناء پر جنوبی افریقہ سے نکالا جا رہا ہے

مولانا حالی مرحوم نے انکی صفائی کی خوب تعریف کی تھی کہ اگر انکی انگلی میں ذرا سی بھی غلاظت لگ جاتی ہے تو فوراً زبان سے چاٹ کر تھوک دیتے ہیں، یہ اپنی اپنی ریت اور رسم ہے لیکن جسکو دوسروں پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے وہ مغلوب قوموں سے بجبر منواتا ہے کہ اسی کی رسم و ریت ٹھیک ہے اور دوسرونکی غلط۔ بلکہ مغلوب قومیں مانیں یا نہ مانیں ان کے رسم و رواج اور ان کے قانون و شریعت کو وحشیانہ، گندہ اور مخرب اخلاق کہہ کر یا تو اس کے ترک پر انہیں مجبور کیا جاتا ہے یا اس پر قایم رہنے کی پاداش میں انکو سزا دی جاتی ہے۔ اور ان سے ان کے حقوق چھینے جاتے ہیں۔

ہمکو یہی خطرہ تھا کہ ترکوں کی حکومت مٹ جانے سے اسلام کی شریعت کا یہی حشر ہوگا۔ اس لئے ترکوں کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ شریعت اسلام کے تحفظ کے لئے ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کے روپیہ کو ترکوں کی مدد کے لئے بھیجا لیکن یہ میرے بھائی گردھاری لال نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ترکوں کی بہترین مدد ہندوستان سے تیس چالیس لاکھ روپیہ بھیجنا نہیں ہے بلکہ خود ہندوستان کو آزاد کرانا ہے۔

جب میں وفد خلافت کے ساتھ یورپ گیا تھا تو ترکوں سے ملا تو انہوں نے پوچھا کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں نے کہا تمہاری مدد کے لئے اس پر انہوں نے کہا کہ کیا کل تک تمہیں نے ہمارے خلاف ہندوستان کا ٹڈی دل لشکر نہیں بھیجا؟ ہم نے کہا کہ بھائی وہ اور مسلمان تھے، اس جماعت میں پیر جماعت علی شاہ کی طرح پنجاب کے بہت سے پیر تھے جو آج قبوں کے انہدام کو ایک بہانہ بنا کر پھر اسلام اور حامیان اسلام

کی مخالفت کر رہے ہیں۔

سر مائیکل اڈوائر نے اپنی تازہ تصنیف میں جہاں اور انگریزوں کو، جو ہندوستانیوں کو اصلاحات دئے چلے جاتے ہیں انگلستان کا دشمن ثابت کرنا چاہا ہے وہاں اپنی انگلستان کے ساتھ دوستی کا یہ بھی ثبوت دیا ہے کہ اپنی پیروں کے ذریعے سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار مسلمان سپاہیوں کو اسلام اور خلیفہ کے خلاف لڑنے بھجوایا اور ان میں سے بعض پیروں نے تو اپنے مریدوں کے تعویذ باندھے اور کہا کہ ترکوں کی گولیاں تمہارے سینوں پر اثر نہ کرینگی۔ اور تمہاری گولیاں لشکر اسلام کے سینوں کو چھید دیں گی۔ یہ تھے وہ لوگ جنہوں نے ترکوں کے خلاف ہندوستان کا ٹڈی دل لشکر بھجوایا۔ پھر ایسے لوگ تھے جیسے میاں سر محمد شفیع جنہوں نے والیسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں بیت المقدس یا بغداد کے قبضۂ اسلام سے نکلکر قبضۂ کفار میں جانے پر حکومت کو مبارکباد دی تھی۔

ترکوں نے ہم سے پوچھا کہ یہ سپاہی کیوں آئے تھے؟ تو ہم نے کہا کہ وہ اپنی خوشی سے نہیں آئے تھے بلکہ خوف کے مارے آئے تھے۔ ترکوں نے کہا، خوف کیسا؟ جرمن کی توپ سے نہیں ڈرے، ہماری تلوار سے نہیں ڈرے۔ پھر ڈرے کس چیز سے؟ تو ہم نے کہا کہ وہ پولیس والے کے ڈنڈے سے ڈرے اور یہ اس لئے کہ گو ہمارے بھائی اب بھی جنگ میں بیباک ہیں مگر سرکار کی پھری ہوئی نظروں اور قید و بند سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم میں غلامی سرایت کر گئی ہے۔

اس پر انہوں نے کہا کہ تو پھر جاؤ، اور ہندو مسلمان سب ملکر ہندوستان کی آزادی حاصل کرو۔ اسی طرح تم ہماری سب سے بہتر مدد کر سکو گے۔ کیونکہ جب تم

آزاد ہو گئے تو تمہیں ہمارے خلاف جنگ کرنے پر کوئی مجبور نہ کرے گا یہ ہے
وہ پیغام جو ترک بھائیوں نے میرے بھائی گدھاری لال کے پاس بھیجا ہے۔ اور
یہی وہ پیغام ہے جواب سے پانچ برس پہلے ترکوں نے میرے ہاتھ بھیجا ہے۔
میرے مسلمان بھائیو! اس پیغام پر غور کرو، ہندو مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرو
اپنے ملک کو آزاد کراؤ۔ پھر اسلامی ممالک کو غلامی سے بچاؤ۔ تمہارے مذہب
کی آزادی بھی ایک بڑی حد تک ہندوستان کی آزادی پر منحصر ہے۔ تمہارا بڑا
مذہبی فرض آج یہ ہے کہ اس ملک کو غلامی سے نجات دلاؤ۔

مگر بعض لوگ ہیں جو ہندوستان میں جو کبھی رشیوں اور اولیاؤں کا ملک
تھا کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھو۔ ابھی بابو بپن چندر پال نے اسی
پر اخبار انگلشمین میں ایک مضمون لکھا ہے، یہ صاحب انڈی پنڈنٹ کہے جاتے
ہیں۔ یہی لالہ لاجپت رائے فرماتے ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مذہب داتون یا
مسواک کے جیسا ہو جائے کہ ایک دوسرے کی داتون یا مسواک کے ساتھ کوئی
واسطہ نہیں۔

مذہب ایک نجی و خانگی چیز ہو جائے اور پبلک معاملات سے اسکو کوئی سروکار
نہ رہے۔ لیکن یہی لوگ ہیں جو اپنے مذہب کے عقیدے کی بنا پر مسلمانوں کو خود انکی
گائے ذبح کرنے سے بھی روکنا چاہتے ہیں۔

مذہب ساری زندگی کی تفصیل ہے اور زندگی کے ہر شعبے سے اسکو تعلق ہے
کرنل ویجوڈ نے مجھے پارلیمنٹ میں مدعو کیا تھا۔ ہم چار پی رہے تھے تو انہوں نے
فرمایا کہ بھائی تمہارا جو جی چاہے کرو مگر اپنے مذہب کو ہمارے پارلیمنٹ میں نہ لاؤ

میں نے کہا کہ میرا مذہب آپ کا پارلیمنٹ تو پارلیمنٹ آپ کے چکلوں اور شراب خانوں تک میں جائیگا۔ اور وہاں کی گندگیوں تک کو دور کرے گا میرے ہندو بھائی! میں چاہتا ہوں کہ ایک بات تمہارے ذہن نشین کرا دوں وہ یہ ہے کہ ہم مسلمان جو ہندوستان میں سات کروڑ ہیں دو مختلف دائروں کے جو تقریباً برابر ہے مشترک جزو ہیں ایک دائرہ ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں کا ہے جس میں ہم مسلمان سات کروڑ ہیں اور باقی ہمارے ہمسلئے بھائی۔ دیگر اقوام کے ہیں جن کے دکھ درد میں ہم بطور ہمسایہ کے شریک ہیں۔ ایک دوسرا دائرہ بھی اتنا ہی بڑا موجود ہے اور یہ مسلمانان عالم کا ہے جس میں ہندوستان کے مسلمان سات کروڑ ہیں اور باقی پچیس تیس کروڑ دوسرے ممالک کے مسلمان ہیں ان کیساتھ ہمارا روحانی تعلق ہے اور ہم ان کے دکھ سکھ میں بھی شریک ہیں۔

تم پر صرف ایک ہندوستان کی آزادی کا فرض عائد ہوتا ہے لیکن ہم پر اس فرض کے علاوہ مسلمانان عالم کی آزادی کا بھی فرض عائد ہوتا ہے میرا ایک پاؤں ہندوستان میں ہے اور ایک پاؤں مذہب اسلام میں تمہاری کاشی تمہارا گیا۔ تمہارا اجودھیا جی سب یہیں ہیں۔ میرا مکہ، میرا مدینہ، میرا بیت المقدس یہاں سے باہر ہے میں انکو نہیں چھوڑ سکتا لیکن میں کعبہ اور کاشی دونوں کے آزادی کے لئے لڑنیکو تیار ہوں آج تو ہم سب بلاتشدد ترکِ موالات پر عامل ہیں لیکن اگر کبھی جنگ کا وقت آئیگا تو مجھے بلا بھیجنا۔ اسوقت اگر تلوار نہ بھی ہوگی جیسی کہ آج نہیں ہے تو ڈنڈا ہی لیکر آجاؤں گا۔ اور لالہ لاجپت رائے۔ لالہ گردھاری لال اور بابو بپن چندر پال ان میں سے انشاءاللہ کسی سے بھی پیچھے نہیں رہوں گا بلکہ شاید

دو قدم آگے ہی رہوں گا۔

یہ ہے میرا ہندوستانی قومیت کے متعلق نقطۂ نظر جو میرے نزدیک ہر اک ہندوستانی مسلمان کا ہونا چاہئے۔

لیکن ترکوں کا ایک پیغام اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ترکوں اور اُنکے دشمنوں کی جنگ کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے، بابو بپن چندر پال جو بیپلیکر انگلشمین اخبار میں مہاتما گاندھی اور ہمارے خلاف اور کانگریس کے خلاف آج مضامین لکھ رہے ہیں اور انگلشمین کے مالک کو اسوقت سے اپنا رزاق بنائے ہوئے ہیں جب سے غریب داس سے ٹکے ملنے بند ہو گئے وہ فرماتے ہیں کہ مہاتما جی نے زبردستی ہندوؤں کو اس خلافت کے جھگڑے میں پھنسا دیا۔ ان کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں" سنو بھائیو! ہم مہاتما جی کے اور ان ہندو بھائیوں کے جو انکی سرکردگی میں ہمارے شریک حال ہوئے بیحد ممنون ہیں، لیکن یاد رکھئے کہ اگر مہاتما جی ہمارے ساتھ نہ ہوتے بلکہ یہ کہو کہ پیدا بھی نہ ہوئے ہوتے تب بھی میں تو وہی کرتا جو میں نے کیا ہے اور اسی طرح میرے بھائی شوکت صاحب بھی نہ ہوتے تو تب بھی میں وہی کرتا جو میں نے کیا۔ اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ بھی وہی کرتے جو انہوں نے کیا۔ ہمارا بھروسہ مہاتما جی پر نہیں ہے۔ بلکہ خدا پر بھروسہ ہے۔ اور ہر اک ہندو مسلمان کو صرف خدا ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ بپن بابو گولر کے بھنگے کی طرح ہندوستان میں بند ہیں وہ نہیں جانتے کہ ہندوستان کے باہر بھی ایک دنیا ہے جس کے ساتھ ہندوستان کا تعلق ہے ترکوں نے صاف کہلا بھیجا ہے کہ ان کو غلام بنانے کی کوشش صرف اس لئے تھی اور ہے کہ ہندوستان کو ہمیشہ غلامی میں رکھنا منظور ہے۔

جب پرتگال کے واسکوڈاگاما نے کیپ آف گڈ ہوپ یعنی "راس امید" کے گرد ہوکر ہندوستان آنیکا پہلے پہل راستہ نکالا تو یورپ والے ہندوستان آنے لگے۔ مگر یہ راستہ بڑی مسافت کا تھا اسلئے گزشتہ صدی کے آخری نصف حصہ میں ایک فرانسیسی انجنیر موسیو لیسپس نے بحر ابیض اور بحر احمر کو ایک نہر کے ذریعے ملانے کی تدبیر سوچی، یہ تدبیر کوئی نئی نہ تھی بلکہ خلیفۃ الرسول، حضرۃ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بھی بلند ہمت عربوں نے یہ تدبیر سوچی تھی۔ مگر اسوقت حضرت عمرؓ نے یہ فرماکر اسکو رد کر دیا کہ یہ راستہ یورپ والوں کی طرف سے ایشیا اور افریقہ والوں کے قتل و غارت کو شروع کر دیگا، چنانچہ یہ تجویز اسوقت عمل میں نہ آئی۔ البتہ اب جبکہ اسمٰعیل پاشا جیسا یورپ کی تہذیب کا دلدادہ اور عیش پرست خدیو مصر پر حکمراں تھا تو اس نے اس تجویز کو منظور کیا اور سخت سود در سود کی شرح پر یورپ کے یہودیوں اور نصرانیوں سے روپیہ لیکر نہر سویز بنانی شروع کی۔ چونکہ یہ کام رقیب حکومت فرانس کے ایک انجنیر نے شروع کیا تھا اس لئے انگلستان نے فرانسیسی انجنیر کو "خطرناک پاگل" کا لقب دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب مالی حالت اسمٰعیل پاشا کی نہایت ردی ہوگئی اور انگلستان کے وزیر اعظم ڈسرریلے کو یہ معلوم ہوا کہ خدیو اسمٰعیل نہر سویز کے اپنے حصے فروخت کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے بلا پارلیمنٹ کی منظوری کے راتوں رات کوڑیوں کے مول یہ حصے خرید لئے اور اب انگلستان اس "خطرناک پاگل پن" میں سب سے بڑا حصہ دار ہے۔ کچھ عرصہ بعد انگلستان نے مصر پر فوجی قبضہ کیا اور اسطرح ہندوستان آنے کے لئے بحری راستے کے ایک ساحل کو اپنے لئے محفوظ بنالیا۔

اگر جرمن سب مرین کچھ اور زیادہ تاخت و تاراج کریں تو نہر سویز کا راستہ

بند ہو جاتا اور یہ انگلستان کے لئے ایک عذاب عظیم ہوتا۔ پھر واسکو ڈاگاما کے راستے سے
راس امید کے گرد گھوم کر ہندوستان آنا پڑتا۔ اور ہفتوں کا راستہ مہینوں میں طے ہوتا
اسی سے نہر سویز کی انگریزوں کو اور بھی قدر معلوم ہوئی۔ مگر جب ترکوں نے جمال پاشا
کی سرکردگی میں نہر سویز پر حملہ کیا۔ اور مصر کا ملک ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ انگریزوں کو
ہونے لگا۔ تب انہوں نے تہیہ کیا کہ اگر فتح ہوئی تو نہر سویز کی دونوں جانب قبضہ کرنا
ہندوستان کے راستہ کی حفاظت کے لئے ضروری ہوگا۔

حضرات آپ نے گھوڑا بے رکابوں کے اکثر دیکھا ہوگا۔ اور لوگوں کو اس پر سوار
ہوتے بھی دیکھا ہوگا۔ مگر آپ نے کبھی بے گھوڑے کے خالی رکابوں پر کسیکو سوار ہوتے
نہ دیکھا ہوگا۔ مصر اور فلسطین اور بحر احمر کے افریقی و ایشیائی دو ساحل رکابیں ہیں جن میں
جنگ کے بعد انگریزوں نے پوری طرح پاؤں ڈال لئے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے وہ
گھوڑا کون ہے؟ جس پر سواری گانٹھنے کے لئے انگریزی شہسوار نے ان دو رکابوں میں
پاؤں ڈالے ہیں۔ ان کا یہ گھوڑا ہندوستان ہے۔ یہ گھوڑا ہم اور آپ ہیں۔ پہلے جب
فقط مصر پر قبضہ تھا، تو میموں کی طرح سے فقط ایک جانب کی رکاب میں پاؤں تھا۔ اب
سوار نے مردوں کی طرح بلکہ آجکل کی میموں کی طرح گھوڑے کو دونوں رانوں سے دبایا ہے۔
اور دونوں رکابوں میں پاؤں ڈال لئے ہیں تاکہ جما بیٹھا رہے۔ اسلئے اب نہ صرف مصر
سوڈان پر بلکہ فلسطین پر بھی قبضہ ہے اور یہی نہیں بلکہ حجاز مقدس پر بھی قبضہ کی تمنا
ہے۔ بدبختی سے شریف اور اسکی ذریات نے عقبہ اور معان کو حجاز سے نکال کر انگریزوں
کے حوالے کر دیا۔ جنکی حکومت عبداللہ کے واسطے سے شرق یردن پر ہے اب تک تو صرف
بحری راستہ کے تحفظ کا خیال تھا۔ مگر ہوائی جہازوں نے اب ایک اور راستہ ہندوستان

آنے کا نکال دیا ہے جو القنطرہ سے عقبہ و معان کے پاس سے، ہوتا ہوا عراق اور عراق
سے کراچی تک جاتا ہے ان تمام راستوں کے تحفظ کے خیال سے انگریز نہ صرف بحر احمر
کے دونوں ساحلوں پر قابض ہو کر بحر احمر کو انگریزی جھیل بنانا چاہتے ہیں بلکہ سارے
جزیرۃ العرب پر بھی ہوائی راستہ کے تحفظ کے خیال سے قابض ہونے کے آرزومند ہیں
اور ان سب ممالک کو صرف اسلئے غلام بنایا جارہا ہے کہ ہندوستان کی غلامی دوامی
ہو جائے۔ اس لئے ترکوں نے یہ پیغام میرے ہاتھ ۱۹۲۰ء میں بھیجا تھا۔ کہ اے ہندی
بھائیو! خواہ تم ہندو ہو یا مسلمان، تمہارا بھی ہماری اس جنگ سے تعلق ہے اسلئے
ہم تمہاری وجہ سے غلام بنائے جارہے ہیں۔ اب بھی بہن بابو فرمائیں گے کہ ہندوؤں کو
ترکوں اور عربوں کی آزادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں
نے ہم پر جادو کر دیا ہے اور جو خیال وہ ہمارے دل میں ڈالنا چاہتے ہیں، وہ ڈال
دیتے ہیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارا خیال ہے حالانکہ وہ انگریزوں کی طرف سے
ڈالا ہوا خیال ہوتا ہے جس طرح قصوں میں سنا کرتے تھے کہ شہزادی کی شرطیں پوری
کرنیکی غرض سے شہزادے سفر کے لئے نکلے، اور راستہ میں ایک دیو ملا اور اس نے جادو
کے زور سے یا بنگالہ کی کسی جادوگرنی نے شہزادے کو انسان سے مکھی بنادیا۔ یہی آج
ہمارے دماغوں اور دلوں کی حالت ہے لیکن ہمکو چاہیئے کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں
اور خود سوچیں کہ ہمارے لئے کیا مناسب ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے
مناسب ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو کر ہندوستان کو آزاد کرائیں اور ہندوؤں کو
مناسب ہے کہ وہ مصری، ترکی، فلسطینی اور حجازی باشندوں کو اپنا سمجھیں اور انکی آزادی
کو اپنی آزادی سے اور ان کی غلامی کو اپنی غلامی سے غیر متعلق نہ سمجھیں ہم مسلمانوں کو تو

فقط ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنا نہیں ہے ہم کو تو چومکھی لڑائی لڑنا ہے
سب سے صحیح راستہ پر ہم ہیں کہ جو خلافت اور کانگریس دونوں کے لیے جان دینے کو
موجود ہیں - اور میں بالخصوص مسلمان بھائیوں سے کہتا ہوں کہ اگر ہندو آزادی کے
لئے کوشش نہ بھی کریں - تب بھی مسلمانوں کو کوشش کر کے ہندوستان کے ہندو، اور
مسلمان دونوں کو آزاد کرانا چاہئے -

صاحبو! یہ میری پالٹیکس ہے اور یہ میرا مذہب ہے - خدا مجھے توفیق دے کہ
کہ اسکے مطابق عمل کروں -



برطانیہ کے سامراجی تعلقات

(ہمدرد ۲۴ - نومبر ۱۹۲۶ء)

ایک حد درجہ بصیرت افروز اور صحیح معنوں میں ایمان پرور مقالہ

مولف

ٹھیک اسی وقت جبکہ ہندوستان کے پائے تخت دہلی میں ہندوستان کے والیان ریاست اپنے ایوان "نریندر محل" نامی میں مجتمع ہوکر، ان ریاستوں اور حکومتِ ہند کے تعلقات پر غور کر رہے ہیں، برطانیہ کے پایۂ تخت لندن سے "برطانوی لاسلکی" کا پیغام دنیا کے اور گوشوں کی طرح ہندوستان میں بھی موصول ہوا ہے کہ برٹش امپیریل کانفرنس کی سامراجی (استعماری) تعلقات کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شایع کی ہے جو تاریخی اہمیت رکھنے والی خیال کی جاتی ہے۔ اور جس کا مضمون دور دور طمانیت بخش ثابت ہوا ہے

اسی پیغام میں درج ہے کہ سامراج (استعمار یا قلمرو) کی وحدت جوں کی توں رہی ہے، بلکہ اور بھی مستحکم اور مضبوط کر دی گئی ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سوال بھی اس خیال سے تشنہ بحث و تمحیص نہیں چھوڑا گیا ہے کہ وہ مشکل یا خطرناک ہے

سامراج کے مختلف اجزاء کے تعلقات کے ہر پہلو پر بلا تکلف اور پوری طرح غور و خوض کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو اتفاق کلی حاصل ہوا وہ حقیقی ہے، اور دھوکے کی ٹٹی نہیں ہے۔ اسکا پھر ایک بار اقرار کیا گیا ہے کہ سامراج ایسی بالکل آزاد اور برابر کی خود مختار (سوراجی) اقوام کا مجموعہ ہے جن میں درجہ کے اعتبار سے اونچے اور نیچے، عالی اور سافل کا کوئی سوال نہیں ہے۔ سامراج کا ہر عضو ایک حکمران مملکت ہے جو اپنے دائرہ میں خود اپنی ذمہ داری پر عمل کرنے میں آزاد ہے۔ جو اقوام سامراج میں داخل ہیں ان کے بیرونی ممالک سے تعلقات پہلی بار دفعہ وار متعین کر دیئے گئے ہیں۔ ہر مملکت ہر بیرونی ملک کے ساتھ اُن امور کی بابت جن کا اس سے تعلق ہو گفت و شنید کر سکتی ہے اور معاہدہ تیار کر سکتی ہے۔ اور ان عہد ناموں پر اس مملکت کے نائبین براہ راست شہنشاہ کی طرف سے دستخط کر سکتے ہیں۔ ہر ایسے امر میں جس کا تعلق کسی خاص مملکت سے ہو شہنشاہ براہِ راست اس مملکت کے مشورہ پر عمل کیا کریں گے۔ نہ کہ برطانوی حکومت کی سفارش پر۔

اس طریقے سے سامراج کے تمام اجزاء کی مساوات جس کا پہلے نظریہ ہی نظریہ تھا اب عملاً بھی قایم ہو گئی۔ ایک امر میں صورت حالات کا تغیر نہایت دلچسپ ہے۔ اور وہ یہ کہ کانفرنس اسے پسند کرتی ہے کہ شہنشاہ کی وہ حکومت جو برطانیہ میں قایم ہے، اور ان کی وہ حکومتیں جو مملکتوں میں قایم ہیں ان کے درمیان براہ راست اور شخصی رابطہ کا ایک نظام قایم کر دیا جائے۔ اسلئے گورنر جنرل کے منصب کی ہیئت کذائی میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ جو شخص اس منصب پر مقرر ہو گا وہ اب بھی شہنشاہ کا نایب تو رہیگا مگر جو کچھ ذمہ داری بحیثیت شہنشاہ کی برطانوی حکومت کے اس وکیل کے جو سمندر پار مقیم ہو

اب تک باقی رہی، وہ اب باقی نہ رہیگی۔ اس مقصد کے پورا کرنیکی غرض سے ہر مملکت کی آزاد حکومت ہے کہ وہ چاہے توکسی اور ذریعے سے۔ اس شخصی رابطہ کو قایم کرے مثلاً اپنا سفارتی وکیل (برطانیہ کی حکومت سے گفت و شنید کے لیئے) خود مقرر کرے۔ اس کے متعلق خاص ذریعہ کونسا تجویز کیا جائے، یہ گرد و پیش کے حالات کے اقتضا کے مطابق بعد میں طے ہوگا۔ شہنشاہ کے القاب میں بھی خفیف سی تبدیلی کی سفارش کی گئی ہے جس کے لیئے قانون بنانا پڑے گا۔ اب تک شہنشاہ کا لقب شہنشاہ برطانیہ و آئرلینڈ و مملکتہائے ماوراء البحر ہے، لیکن اب پہلا واو عطف دور کر دیا جائیگا تاکہ صاف ہوجائے کہ آئرلینڈ کا بھی وہی مرتبہ ہے جو مملکتہائے ماوراء البحر کا ہے۔

حقیقتاً سیاست کی دنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں، اور یہاں سنت اللہ تبدیل و تحویل ہی کا نام ہے۔ برطانیہ کی وہ مستعمرات اور نوآبادیاں جہاں کے باشندوں پر اس سورج کی کرنیں جو برطانوی سامراج میں کبھی غروب نہیں ہوا کرتا ہندوستان کی طرح سیدھی نہیں بلکہ ترچھی پڑا کرتی ہیں۔ اور جنکی رنگت اس کے باعث ہماری طرح کالی نہیں بلکہ سپید ہوتی ہے۔ کل تک برطانیہ عظمیٰ کی مقبوضات تھیں، پھر وہ مملکتیں بنیں اور اعظم یا عظیم تر برطانیہ کا جزو، اور آج وہ خود مختار آزاد حکمراں اور خود برطانیہ کی برابر والی مملکتیں ہیں۔ اور برطانیہ نے پتھر کا دل کرکے اس سب پر صبر کیا ہے اور اسی پر قناعت کی ہے کہ کسی رقیب "نظام شمسی" کی ارکین و اعضا نہ بن بیٹھیں۔ اب برطانیہ عظمیٰ کے نظام شمسی میں مختلف سیارے سورج کے گرد نہیں گھومتے بلکہ سورج خود ان سب سیاروں کی گرد جو ثوابت بن بیٹھے ہیں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ تاکہ کوئی سیارہ یہاں سے ٹوٹ کر کسی اور مد مقابل نظام میں داخل نہ

ہو جائے۔

جب پنڈت مدن موہن مالوی نے اپنی آزاد پارٹی قایم کی اور مسٹر جینا کی طرح چند مسلمان افراد بھی اس میں داخل ہوئے تو سوال کیا گیا کہ معاملات ملّی میں اس پارٹی کا مسلک کیا ہوگا، تو فرمایا گیا کہ ہر رکن "آزاد ہوگا"، جو چاہے رائے دے یعنی "ہندو آزاد" ہوں گے کہ ہندو سبھا کے مسلک پر قایم رہ کر اپنی اکثریت کی رائے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف دیں، یا بالفاظ دیگر، ہندو "آزاد" ہوں گے کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ جیتا کریں۔ اور مسلمان "آزاد" ہوں گے کہ ہمیشہ ہارا کریں۔ اور اگر اس استعارہ کا استعمال جائز ہو۔ اور میرے ہندو بھائی جو پنڈت مدن موہن مالوی کے متبع ہیں۔ برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ "بھیڑیا" اور "بھیڑ" دونوں "آزاد" ہوں گے کہ جو قدیمی تعلقات ان کے درمیان قایم ہیں اون پر بدستور قایم رہیں اور وہی اگلی چیر پھاڑ جاری رہے۔ "بھیڑیے" کے نقطۂ نظر سے تو ان روابط و تعلقات کے قایم رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن غالباً "بھیڑ" کا نقطۂ نظر اس سے قدرے مختلف ہے اور کوئی سیاسی پارٹی اس اصول "آزادی" پر قایم نہیں رہ سکتی، بھیڑ غریب نہ بھیڑیے کی خو بو بدل سکتی ہے نہ اپنی کمزوری ہی کو، اور جب اسکو موت "بھیڑیے" کے ہاتھوں، یا "دانتوں" آتی ہے تو مرجاتی ہے، اور وہ بادل خواستہ نہ سہی بادل ناخواستہ ہی سہی دنیا کو خیرباد کہتی ہے۔ لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ تو اس "آزادی" پر راضی بھی ہے، تو یقیناً اسکا جواب اثبات میں نہ ہوگا، بلکہ نفی میں ہوگا۔ اپنی موت کا پروانہ کوئی اپنے قلم سے نہیں لکھا کرتا۔ برطانوی نو آبادیاں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح "آزاد" تھیں، مگر آج کے لاسلکی پیغام

ہیں خود اس کا اقبال ہے کہ وہ "آزادی" ایک "نظریہ" اور ایک دھوکے کی ٹٹی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اور اب نوآبادیوں کی بھیڑوں نے بھی بجائے اپنی موت کے پروانے پر اپنے قلم سے دستخط کرنے کے بھیڑیے کی طرح خود بھی پنجے پیدا کر لئے، اس لئے بھیڑیے کو اپنے ناخن بھیڑوں کے ہاتھ سے ترشوائے بغیر چارہ نہ تھا۔

برطانیہ عظمیٰ کی پالیسی اپنی نوآبادیوں کے متعلق ایک زمانہ میں وہ تھی جو بہترین طریقہ پر شیکسپیئر کے ڈرامے "شاہ جان" میں شاہزادہ آرتھر حقیقی وارث تخت کی ماں شاہزادی کانسٹنس کے الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ شاہ جان کی ماں شاہزادہ آرتھر یعنی اپنے پوتے اور غاصب شاہ جان کے بھتیجے کو چچا بھتیجوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے اپنی طرف بلاتی ہیں کہ میرے بچوا میرے پاس تو ذرا آ۔ اس مکاری پر آرتھر کی ماں اس سے کہتی ہے کہ ہاں بچوا، جا دادی جان کے پاس ضرور جا۔ دادی جان اپنے بچوے کی سلطنت تو لے لیں گی، اور اپنے بچوے کو سنگھاڑے کھانے کو دیں گی۔ اور بیر کھانے کو دینگی اور گنے کی گنڈیریاں کھانے کو دیں گی بعینہ یہی "دادی جان" والی پالیسی برطانیہ عظمیٰ کی اپنے بچوں کے متعلق تھی۔ لیکن امریکہ نے سلطنت دیکر سنگاڑے اور بیر، اور گنے کی گنڈیریاں لینا قبول نہ کیا۔ اور جنگ آزادی ہوئی اور وہ جارج واشنگٹن جو شاہ انگلستان جارج سویم کے عہد میں اس جنگ میں فتحیاب ہونے کے باعث سب سے بڑا غاصب غدار اور باغی اور بدترین خلائق تھا۔ آج شاہ جارج پنجم کے زمانہ میں خود انگلستان میں دنیا کا سب سے بڑا وطن پرور اور محب آزادی، اور بہترین خلائق مانا جاتا ہے۔ اس دن سے

برطانیہ کو برابر کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اپنے پڑوسی، مملکتہائے متحدہ امریکہ کی طرح شمالی امریکہ کا وہ دوسرا حصہ بھی جس کا نام کینیڈا ہے۔ آزاد نہ ہو جائے، یا اس سے بدتر یہ کہ خود مملکتہائے متحدہ امریکہ میں جس کے جمہوری دربار میں اس نے ایک دو برس سے اپنا سفیر علیحدہ مقرر کر رکھا ہے۔ شامل نہ ہو جائے۔ نسلاً بھی کینیڈا کا ایک حصہ انگریزوں کی اولاد نہیں ہے۔ بلکہ ان کے رقیب فرانسیسیوں کی اولاد ہے اور مذہباً بھی پراٹسٹنٹ نہیں بلکہ کیتھولک ہے۔ اس سے مفارقت کا اور بھی خوف ہر وقت دامنگیر رہتا ہے۔

آسٹریلیا۔ گو برطانیہ سے دور ہے مگر یہ دوری ہی تقرب کا باعث ہے۔ اس لئے کہ جاپان آسٹریلیا سے بالکل قریب ہے، اور اگر برطانیہ کا سہارا نہ ملا ہوتا تو زرد رو، کب کا اپنے اس سپید رو پڑوسی کو کچا نگل گیا ہوتا۔ اس لئے آسٹریلیا کو برطانیہ کے سایہ عاطفت کی بڑی حاجت رہتی ہے۔ تاہم وہ اس سایہ کے نیچے تو رہنا چاہتا ہے مگر کسی بوجھ کے نیچے وہ بھی دبنا نہیں چاہتا۔ اور گو اس نے کسی دربار میں اپنا سفیر علیحدہ تو مقرر نہیں کیا ہے (اور مقرر کرتا بھی کیسے؟ اسکا پڑوسی کینیڈا کے پڑوسی مملکت ہائے متحدہ امریکہ کی طرح اسکا دوست تو ہے نہیں۔ بلکہ اس کا رقیب روسیاہ زرد رو جاپان ہے) لیکن آسٹریلیا نے بھی یہ ضرور کیا ہے کہ ایک برطانوی گورنر صاحب کو جو ذرا ٹیڑھا چلتے تھے دھتا بتائی ہے، اور وہ عنقریب بیک بینی و دو گوش وہاں سے واپس آرہے ہیں۔

تیسری بڑی نو آبادی جنوبی افریقہ کی ہے۔ مگر یہاں نسل کا اختلاف کینیڈا سے بھی زیادہ ہے، اور یہاں کے اصلی باشندوں کے علاوہ (جو باوجود اپنی کثرت کے ایسے

ہیں کہ گویا ان کا وجود ہی نہیں) جو باشندے باہر سے آکر بسے ہیں وہ زیادہ تر ہالینڈ سے آئے ہوئے ہیں اور ولندیزی یعنی ڈچ نسل کے ہیں۔ اور پھر یہ نہیں کہ یہ ملک کینیڈا کی طرح مدتوں سے برطانوی قبضہ میں آیا ہو بلکہ ہماری ہی زندگی میں جنگ بور کے بعد، اسی صدی میں انگریزی سامراج کا جزو بنا ہے۔ کینیڈا تو اس وقت فرانسیسیوں سے چھینا گیا تھا جب براعظم امریکہ کی طرح براعظم ایشیا میں بھی انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اور یہ جنگی جُوا ہندوستان میں بھی ڈوپلے اور کلایو کے درمیان ہم بدبختوں کی آزادی کی بازی کے لئے کھیلا جارہا تھا۔ مگر بوروں کی جنگ جس کے لئے ہندوستان کا کمانڈر انچیف انگلستان کی کمک کے لئے بھیجا گیا۔ اور لیڈی اسمتھ میں محصور ہوگیا۔ اور جس کے لئے ہندوستان سے مدد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وہ تو کل کی بات ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ خون پھر خون ہے اور پانی پھر پانی ہے۔ اس لئے کہ انگریزوں اور ولندیزیوں کا خون ایک نہیں صرف رنگ ایک ہے مگر یہ پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ رنگ پھر رنگ ہے اور روٹی پھر روٹی ہے۔ انگریز ہم جیسے وفاداروں کی روٹی میں شریک ہیں۔ اور کل کے جانی دشمنوں یعنی بوروں کے وہ ہمرنگ ہیں پھر بھلا ہمارا کیا حق ہے کہ بوروں کی ہمسری کا دعویٰ کریں۔

گزشتہ جنگ میں ہندوستان نے جان و مال چھوڑ، ایمان تک دینے میں دریغ نہیں کیا۔ اس کے مقابلہ میں جنرل ڈی ویٹ نے دو دن قبل کے فاتحوں سے بدلہ لینے کے لئے اعلان جنگ کردیا۔ اور جنرل ہرٹزاگ بھی جو آج لندن میں بحیثیت وزیراعظم جنوبی افریقہ مسٹر بالڈون وزیراعظم برطانیہ کے دوش بدوش برطانوی سامراج کی موتمر میں شریک ہیں ان کے ہم مشرب اور ہمنوا تھے۔ یہ آج بھی سب سے تیز تھے اور جو رپورٹ

سامراجی تعلقات کی کمیٹی نے شایع کی ہے وہ یقیناً انہیں کے مطالبہ آزادی کامل کی
وجہ سے تیار ہوئی ہے "تاکہ "تپ" پر راضی ہو کر غریب برطانیہ اس "مرگ" سے بچے
جس پر جنوبی افریقہ کے ولندیزی بوروں کا اصرار تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے
ہم مدرسہ لارڈ مارلے آنجہانی جو اسوقت تک "ایماندار جان" تھے اور جو جنگ بور
میں اسکوئیتھ اور گرے کی طرح جوزف چیمبرلین آنجہانی کے ہمنوا نہیں بنگئے تھے، بلکہ
یادش بخیر لائڈ جارج صاحب کے شریک کار تھے اور آزادی اور سیاسی معاملات میں
بھی ایمانداری کے پر جوش حامی تھے۔ اور قدامت پسند حکومت اور اسکے کارفرما
اپنے پرانے رفیق جوزف چیمبرلین کے سخت مخالف تھے، وہ آکسفورڈ آئے تھے،
اور ہماری یونیورسٹی کے پامرسٹن کلب کی دعوت میں انہوں نے ایک پُرزور تقریر کے
دوران میں نہایت دردناک لہجہ میں اس پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ہائے آج "آرنج
فری اسٹیٹ"، (آرنج کی آزاد مملکت) اب برطانوی سامراج کا جزو بن گئی اور اس کا
نام بدل کر "آرنج پراونس" (صوبہ آرنج) رکھدیا گیا۔ اور فری (آزاد) کا لفظ اسکے
قلمروے برطانیہ میں داخل ہونے ہی قلمزد کر دیا گیا۔

آج اگر لارڈ مارلے زندہ ہوتے تو شاید وہ بھی خوش ہوتے کہ نام کے
لئے خواہ "آرنج فری اسٹیٹ"، آج بھی فری نہو۔ لیکن ہر کام کے لئے وہ آج آزاد
ہے۔ اس پر بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سلسلہ کب اور کہاں جا کر ختم ہوگا۔ کل
تک تو انگریز اسی پر خوش ہو رہے تھے کہ جنوبی افریقہ کے بوروں کا دل بہلانے کے
لئے شاہزادہ بلند اقبال ولیعہد سلطنت بھیجے گئے تو انہوں نے ان دشمنان
سامراج پر بلا کا جادو کر دیا۔ ایک بور نے جو جنوبی افریقہ کے پارلیمنٹ میں برطانیہ کا سب سے

بڑا دشمن ہے۔ پرنس آف ویلز سے ملنے اور ان کے تبسم کی سحر کاری کے بعد ہی خود آکر اُن سے ہاتھ ملایا۔ اور اُن کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بولو، کہ ہماری جمہوریہ کے صدر بننے کے لئے تیار ہو؟ ایک دنیا وہ بھی جہاں "رعایا" کا ولیعہد سلطنت کے کندھوں پر ہاتھ رکھنا، اس بغاوت کی تحریک کرنا بھی ولیعہد کی عزت افزائی ہے اور ایک دنیا یہ ہے۔ جہاں ولیعہد کا بڑے سے بڑے سورج بنسی اور چندر بنسی مہاراجہ سے ملا لینا بھی اس چاند سورج کی اولاد کے لئے فخر مباہات کا سبب خیال کیا جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ تغیرات جو سامراج کی طاقتور اور زبردست مملکتوں میں رونما ہو رہے ہیں۔ اب کل کو ان تغیرات کا حال بھی سن لیجئے گا جو سامراج کے اس کمزور اور زبردست حصہ میں رونما ہو رہے ہیں جسکے باعث بقول لارڈ مارلے کے برطانوی سامراج سامراج بنا ہے

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

چین اور ہندوستان

(ہمدرد - یکم فروری ۱۹۲۷ء)



چین میں شورش ہوئی۔ چینی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے ملک میں دوسری قوتوں کا اجارہ ہو۔ اور وہاں کے خاص خاص حصول کو اپنا لیں۔

اس شورش کو دبانے کے لئے ہندوستان سے فوجیں بھیجی گئیں۔ مرکزی اسمبلی میں کانگریس نے تحریک التوا پیش کی جسکی وائسرائے نے اجازت نہیں دی دہلی میں ایک جلسہ ہوا جس میں اس روش کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

اس موضوع پر محمد علی کے تاثرات یہ ہیں:-

مؤلف



سب سے پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گو مشرق پر مغرب کا ابتک تسلط اور غلبہ ہے۔ مگر سوائے ہمارے جو اپنی پر امن جنگ کو بھی تھک کر چھوڑ بیٹھے مشرق کا ہر ملک اس تسلط اور غلبہ کو دور کرنے میں مصروف ہے۔ ترکوں نے جس طرح اپنی گئی گزری حالت میں بھی اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو پھر حاصل کر لیا اسے ایک عالم

جانتا ہے۔

ریف میں مٹھی بھر منخلوں نے دنیا کی سب سے بڑی جنگی دولت کا جس بے جگری سے مقابلہ کیا وہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ شام میں جو کچھ اب تک ہو رہا ہے اس سے بھی دنیا واقف ہے۔

فلسطین اس قدر چھوٹا سا خطہ ہے کہ وہاں جنگی جد وجہد کا تو کسی کو خیال ہونا بھی مشکل ہے۔ مگر سیاسی جد وجہد برابر جاری ہے۔ اور حکمران اور حکمیر دار برطانیہ اسکی طرف سے ہرگز مطمئن نہیں۔ مصر و سوڈان کو جس طرح ۱۹۲۴ء میں دیا گیا تھا وہ بچہ بچہ جانتا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ برطانیہ وہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں، اور مصر کی کنپٹی پر برطانوی طپنچہ ہر وقت رکھا رہتا ہے۔

سعد پاشا زاغلول نے جارج لائڈ جیسے دبنگے شخص کو ایک حد تک مجبور کر دیا کہ اس وزارت کو تسلیم کرے جو حقیقتاً انہیں کی وزارت ہے

ایران میں رضا خاں نے اور افغانستان میں امان اللہ خاں نے ترکی مصطفےٰ کمال ہی کی طرح اپنے اپنے ملک کو برطانیہ کی دست برد سے بچا لیا۔ اور اپنی قومی آزادی کو روز بروز اور مستحکم کر رہے ہیں۔

جاپان ہی وہ مشرقی ملک ہے جو اس بیسویں صدی کے آغاز ہی میں جبکہ اور مشرقی ممالک یورپ کے استعمار کا شکار ہو رہے تھے یورپ کی ایک بڑی دولت کا مقابلہ کر کے جس سے برطانیہ خود خائف تھی پوری طرح آزاد ہو گیا۔ اور بڑی سے بڑی سلطنت کا آج مدمقابل ہے۔

البتہ چین ہماری طرح خواب غفلت میں پڑا تھا۔ اور جب یہ غفلت کسی قدر دور

ہوئی تو ہماری ہی طرح اس میں بھی انتشار، اور شکست رونما ہوا۔ مگر بقول سر حیت سر ہنواس
آئنگر کے آج وہ اس دیو کی طرح نظر آتا ہے جو محنت شاقہ کے بعد مزے کی نیند سویا ہوا
اور اس خواب سے تازہ دم ہوکر اٹھا ہو اور بیدار ہوتے ہی مصروف کار ہوگیا ہو۔ بہت
سے مشرقی ممالک کی طرح (اور مشرقی ممالک ہی پر کیا موقوف ہے بہت سے مغربی ممالک
کی طرح) چین بھی ملکیت کی لعنت میں مبتلا تھا۔ مگر پندرہ برس ہوئے کہ ایک خدا
کا بندہ اسی طرح چین میں اٹھا جس طرح ترکی میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا۔ ایران
میں شاہ رضا پہلوی۔ افغانستان میں شاہ امان اللہ خان اور ہندوستان میں مہاتما
گاندھی، اور گو ان ممالک میں سے بعض کے رہبروں اور رہنماؤں نے تو ملکیت کو ہی
برقرار رکھا۔ مگر بعض نے اس کا خاتمہ کرنیکی جرات کی۔ اور انہیں میں سے سن یٹ
سین تھا۔ یہ چینی مصلح قوم اور محب وطن امریکہ میں تعلیم پاچکا تھا اور مذہباً
عیسائی تھا۔ مگر جب دوران جنگ عمومی میں جبکہ یہ جمہوریت چین کا نائب صدر تھا
برطانیہ نے اسے بھی جھانسا دینا چاہا۔ اور چین سے کہا کہ تم بھی ہمارے حلیف بن جاؤ
اور پرہیز گاری و تقوے کا سیاہ کاری اور ظلم کے خلاف ساتھ دو۔ تو اس بندۂ
خدا نے اس خناسی وسوسہ سے متاثر نہ ہوکر صاف انکار کر دیا۔ اور گو ہندوستان
نے آج ہی کی طرح اسوقت بھی اپنی فوجیں برطانیہ کی کمک کے لئے فوراً روانہ
کر دی تھیں۔ حالانکہ ان کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔

اس عیسائی نے جن وجوہ سے چینی فوجیں بھیجنے سے انکار کیا تھا ان میں ایک
زبردست وجہ یہ بھی بیان کی تھی کہ ہمارے ملک کے پانچ عنصر ہیں۔ اور اسی کے لحاظ سے
ہمارے قومی جھنڈے میں پانچ رنگ بھی ہیں ان میں سے ایک عنصر اسلامی ہے اور اسی

سبز رنگ ہمارے جھنڈے میں بھی رکھا گیا ہے۔ ہمارے مسلمان بھائی اپنے ترکی کے اسلامی بھائیوں اور امیر المومنین خلیفۃ الرسول کے خلاف لڑنا حرام سمجھتے ہیں اسلئے چینی قوم اس جنگ میں تمہارے شریک ہوکر جرمن کے ترکی حلیف سے نہیں لڑسکتی

آج ہندوستان کی افواج جن میں مسلمان بھی ضرور شامل ہوں گے اسی چینی قوم کے خلاف بلاکسی وجہہ مخالفت کے جنگ کرنے جارہی ہیں ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

پنڈت موتی لال نہرو نے جلسہ میں فرمایا کہ چینی قوم کا مذہب بودھ ہے اور وہ ہندوستان ہی سے چین گیا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ ہندوستان سے بری طرح نکالا گیا اور اس کی طاقت بجائے ہندوستان کے آج برما، لنکا، چین، جاپان وغیرہ میں ہے۔ لیکن آج بھی ہندوستان کے لوگ "کالے پانی" کو عبور کرنے کے پاپ سے نہ گھبراکر، اگر چین و جاپان سے اپنے قدیم رشتۂ مذہبی کو از سر نو مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہئیے۔ کہ اہل ہند کی کھوئی ہوئی وسعت نظر بحر ہند کی خندق اور ہمالیہ کی فصیل کے اس پار انہیں چین و جاپان میں مل گئی۔ مگر موتی لال جی کو معلوم نہ تھا کہ چینیوں کا مذہب فقط ہندوستان ہی سے نہیں گیا ہے۔ بلکہ رب المشرقین و رب المغربین نے اپنے ایک برگزیدہ بندہ کو عرب میں پیدا کیا تھا اور اسے خاتم النبیین بنا کر اسکے منھ سے کہلوایا تھا کہ اطلبوا العلم ولو کان بالصین (علم کی تلاش میں جاؤ گو وہ چین ہی میں کیوں نہ ملے) اور فقط اسی طرح چین و عرب کا ڈانڈا انہیں ملایا تھا بلکہ اس خاتم النبین کی امت کو یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ وہ علم لدنّی جو عرب کے ایک اُمّی کو عطا ہوا تھا اس سے چین کو بھی فیضیاب کرے۔ چنانچہ ہندوستان

کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی آج چین ہی میں رہتی ہے۔ موتی لال جی کا
اس سے آگاہ نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مگر تعجب مسلمانانِ ہند پر ہوگا
اگر وہ اس بات کو بھول جائیں اور ہندوستان کے مسلمان بھی خوش خوش چین
کو ہندوستانی افواج روانہ کرائیں۔

سر حیت سرینواس آئنگر نے بالکل صحیح فرمایا کہ وایسرائے کا یہ کہنا غلط ہے
کہ ہندوستان ہی اس شہنشاہی اور سامراج کا سب سے قریبی جزو ہے جہاں سے
چین کو فوجیں بھیجی جاسکتی ہیں۔ بلکہ یہاں سے سب سے پہلے فوجوں کا جانا اس لئے
ہے کہ اس سارے سامراج میں ہمیں ایسے بدبخت و فاکیش اور اسارت شعار ہیں
کہ ہمارے مالک رقاب اور آقا برطانیہ کی سب سے پہلے ہمیں پر اس ناپاک خدمت
کے لئے نظر پڑتی ہے۔

موتی لال جی نے بھی صحیح فرمایا کہ خواہ کچھ بھی ہو، یہ آزادی کی لہر جو چین
کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ رہی ہے۔ اسے کوئی روک نہ
سکیگا۔ یہ لہر کبھی ہندوستان میں بھی دوڑ رہی تھی، بلکہ ہمیں نے ترکی اور جزیرۃ
العرب کو آزاد ہونے کی اسوقت دعوت دی تھی جبکہ وہاں کے غداروں نے غیروں
کو عنانِ حکومت سپرد کرنیکا تہیہ کر لیا تھا۔ آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہماری
فوج اس آزادی کی لہر کو اپنے غلام جسموں کا ایک بند بنا کر روکنا چاہتی ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

گاندھی جی کانگریس اور مسلمان

فہرست مضامین

(۱) واقعہ کوہاٹ ۱۰۵

(۲) ہندو مسلم تعلقات اور خلافت کا مسلک

(۳) یو پی کی پولٹیکل کانفرنس ۱۴۷

(۴) کانگریس کے سابق صدر ۱۶۲

(۵) کانگریس کی تعمیر میں مسلمانوں کا حصہ ۱۶۶

واقعۂ کوہاٹ

ایک ضروری تصریح

(ہمدرد - ۱۳ - ۱۴ - ۱۵ - جنوری ۱۹۲۵ عیسوی)

یہ وہ زمانہ ہے کہ گاندھی جی اور علی برادران جیل سے رہا ہو چکے ہیں۔ سوامی شردھانند شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کر چکے ہیں۔ کانگریسی رہنماؤں کا بڑا طبقہ مسلمانوں کے خلاف ایک مستقل محاذ قایم کر چکا ہے۔ اس طبقہ میں لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موہن مالوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں میں بھی ہندوؤں اور کانگریس کے خلاف غم و غصہ کے جذبات بیدار ہو چکے ہیں۔ تبلیغ اور تنظیم کی لہریں ان میں بھی اُٹھ رہی ہیں۔

لیکن ملت کے یہ کوہ وقار رہنما علی برادران ــــــــ پورے ثبات و عزم کے ساتھ اپنے مسلک پر قایم ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان ملکر رہیں، اور غلط اور اشتعال انگیز طریقہ پر شدھی اور تبلیغ کے فرائض انجام نہ دیں۔

اس حالت میں کوہاٹ کا فساد ہوتا ہے۔ ہندو پریس سارا الزام مسلمانوں پر لگاتا ہے۔ لالہ لاجپت رائے، مالوی جی اوغیرہ بھی اسی خیال کے حامی ہیں کانگریس کی

طرف سے تحقیقات کرنے کے لئے گاندھی جی اور مولینا شوکت علی مامور ہوتے ہیں دونوں
کی رائے میں اختلاف ہوتا ہے، یہ پہلا اختلاف ہے جو گاندھی جی اور ان کے جاں نثار
پیرو میں ہوا۔ گاندھی جی اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمان ونگمی اور جھگڑالو ہیں

محمد علی خواہ کتنے ہی بڑے کانگریسی کیوں نہ ہوں وہ مسلمان تھے اور اول و
آخر مسلمان تھے۔ انہوں نے وفور جذبات سے متاثر ہو کر ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی
نہیں کی لیکن مسلمان کو خواہ مخواہ برا نہیں کہا۔

ذیل کے مضمون سے اندازہ ہوگا کہ محمد علی حرارت اسلامی، نور اسلام، اور
جذبۂ ملی سے کس طرح سرشار تھے انہوں نے جذبات کے تلاطم میں بھی اعتدال و توسط
کا مسلک کس طرح قایم رکھا   مؤلف



مسلم لیگ نے حال میں ایک ریزولیوشن حادثہ کوہاٹ کے متعلق منظور کیا ہے چونکہ اس
رزولیوشن کا مسودہ میں نے تیار کیا تھا ممکن ہے کہ میرے ساتھ ملکر کام کرنیوالوں کو یہ خیال
پیدا ہو کہ یہ ریزولیوشن میرے خیال کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے اس لئے میں اپنا فرض
سمجھتا ہوں کہ ان اصحاب کے سامنے بصراحت کل صورت حال بیان کر دوں۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ مسلم لیگ ایک ایسی جماعت نہیں ہے جس
میں تمام مسلمان میرے ہی ہم خیال ہوں۔ پچھلی گرمیوں میں جو اجلاس بمقام لاہور ہوا تھا
وہاں ہم لوگ اقلیت میں تھے۔ صرف ایک ترمیم پر رائے شماری ہوجانے کے بعد جب
ہم کو شکست ہوئی تو بقیہ امور میں اختلاف رائے کے اظہار یا جن تحریکوں میں ہم متفق
نہیں ہو سکتے تھے ان کے خلاف صرف ہاتھ اٹھا دینے پر ہم نے اکتفا کیا۔ آل پارٹی کانفرنس

کے موقع پر جو ریز ولیوشن بمبئی میں خود مہاتما گاندھی نے پیش کئے تھے وہ دراصل انکی یا کانگریس کی اکثریت کی رایوں کو پورا پورا نہیں ظاہر کرتے تھے، بلکہ اُن رایوں کو ظاہر کرتے تھے جو بخیال مہاتما جی تمام جماعتوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ مشترک ہو سکتی تھیں۔ اسی طرح مفاہمت کلکتہ میں بھی وہ تمام باتیں نہیں ہیں جو اس صورت میں ہوتیں کہ کانگریس میں کوئی سوراجی نہ ہوتا، بلکہ صرف وہ باتیں ہیں جن پر مہاتما جی سوراجیوں کو ترغیب دیکر رضامند کر سکے۔ اس طرح قومی پروگرام میں سے انہوں نے عدم تعاون کے بہت سارے اُن مدّات کو خارج کر دیا جن کے وہ آج بھی اتنا ہی گرویدہ ہیں جتنے کہ پہلے تھے۔ اور سوراجیوں کو کانگریس کے نام سے بعض ایسے کاموں کے کرنیکی اجازت دیدی جن کی اجازت کانگریس کو اگر مہاتما جی کی مرضی فائق ہوتی تو ہرگز نہ دی جاتی یہ نہایت کھلی ہوئی باتیں ہیں لیکن بدقسمتی سے اعتراض کرنیوالوں کی ایک ایسی جماعت بھی ہے جسکو دوسرے کی آنکھ میں تنکا تو نظر آجاتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، ان لوگوں کو اصلیت سمجھانیکی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے میرے سامنے اسوقت لمبے اور احتیاط کے ساتھ تیار کئے ہوئے رز ولیوشن موجود ہیں جن میں سے ایک سناتن دھرم کانفرنس راولپنڈی میں گزشتہ ۳۰ نومبر کو منظور ہوا تھا۔ اور دوسرا ہندو مہا سبھا بیلگام میں ایک مہینے بعد منظور ہوا تھا۔ پہلے رز ولیوشن کے ابتدائی الفاظ حسب ذیل ہیں:-

" یہ کانفرنس جس میں بارہ سو ہندو نمایندگان شامل ہیں جو پنجاب بلوچستان سندھ، صوبہ سرحد اور ہندوستان کے بعض دیگر حصوں کے قریباً تمام اضلاع کے سناتن دھرمیوں کے قایم مقام ہیں اُن مظالم پر جو مقامی اور سرحد کے مسلمانوں نے

اپنے ہندو اور سکھ شہر داروں پر ۹ ستمبر اور اسکے اگلے دن پر ڈھائے ہیں نہایت ہی دکھ اور غصّے کا اظہار کرتی ہے اور جس سے ذیل کا نقصان سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے انتیس ہندوں اور سکھوں اور گیارہ مسلمانوں کا اتلاف جان ۵۰، ۱۴ ہندو گھروں اور دکانوں کا جلایا جانا اور ہندو بازاروں کی لوٹ جن کی قیمت تقریباً دو کروڑ روپیہ انداز ہ لگایا گیا ہے اور کئی منادر اور گردواروں کا جلایا جانا جسکی وجہ سے کوہاٹ کی ساری سکھ اور ہندو آبادی شہر چھوڑنے اور راولپنڈی اور پنجاب کے دیگر شہروں میں پناہگزیں ہونے پر مجبور ہو گئی"۔

آگے چل کر اس ریزولیوشن میں نہ صرف اُن "مظالم" کا اعادہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں نے ہندؤں پر ڈھائے، بلکہ گیارہ مسلمانوں کے مارے جانیکی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ "ہندؤوں نے حفاظت خود اختیاری میں گولی چلائی"

اس طرح کل الزام مسلمانوں پر رکھنے کے بعد ریزولیوشن میں ایک تحقیقاتی کمیٹی کا مطالبہ کیا گیا ہے، جس میں ہندو، سکھ، مسلمان، اور یورپین شامل ہوں، اور اس کمیٹی کی بناوٹ ایسی ہو کہ پبلک کا اسے اعتماد حاصل ہو"

اور پھر وایسرائے سے درخواست کی گئی ہے کہ "جہانتک جلد ممکن ہو ایسی کمیٹی مقرر کریں جو تمام حادثہ کی تحقیقات کرے اور ہندؤں میں حفاظت کا خیال واپس لانے کے لئے جو کچھ ضروری ہو اسکی سفارش کرے، اور ان لوگوں کے لئے معاوضہ کی سفارش کرے جنکو ان فسادات سے نقصان پہنچا ہے اور ایسے وسائل بنائے کہ فسادات پھر نہ ہو سکیں"

اس ریزولیوشن میں ہز اکسلنسی سے اور بھی بہت سی باتوں کی درخواست

کی گئی ہے جو صرف ہندوؤں کے لئے مفید ہیں۔ خاصکر یہ کہ مقامی پولیس میں ہندوؤں اور سکھوں کا عنصر اس قدر بڑھایا جائے کہ پولیس کی جمعیت میں یہ ۵۰ فیصدی ہو جائیں اور کوہاٹ کے جوڈیشل اور ایگزیکٹیو افسران میں ہندو افسران کی کافی تعداد مقرر کیجائے،

یہ رزولیوشن کانگریس سے تین یا چار ہفتہ پہلے پاس کیا گیا تھا۔ اور ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ جن ہندوؤں نے اسکو منظور کیا تھا ان کو جب کانگریس نے بہتر بہتر راستہ بتایا تو انہوں نے اپنی رائیں بدل دیں۔ لیکن دوسرا ریزولیوشن جو ہندو مہا سبھا نے پاس کیا ہے اسکے سامنے اس دلیل کی وقعت نہیں باقی رہتی اس لئے کہ یہ ریزولیوشن کانگریس کے بعد پاس ہوا ہے۔

ہندو مہا سبھا کے ریزولیوشن کو لکھنے سے پہلے، میں کانگریس کا ریزولیوشن نقل کر دینا چاہتا ہوں تاکہ موازنہ میں آسانی ہو۔

کانگریس کا ریزولیوشن حسب ذیل ہے:۔

"کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی اور مختلف حصص ہند میں جو فسادات ہوئے ان پر افسوس کرتی ہے۔ کانگریس حال کے کوہاٹ کے فسادات پر اظہار افسوس کرتی ہے جن سے بہت کچھ نقصان جان اور مال کا بشمول منادر کے ہوا۔ اور کانگریس کی رائے یہ ہے کہ مقامی حکام جان و مال کی حفاظت کے اولین فرض کی انجام دہی میں قاصر رہے۔ کانگریس ہندوؤں کے کوہاٹ سے مجبوری نکالے جانے پر بھی افسوس کرتی ہے اور مسلمانوں پر زور دیتی ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کو انکی جان و مال کی حفاظت پر پورا یقین دلا کر انکو مثل اپنے معزز دوست و ہمسایہ کے واپس آنیکی دعوت دیں۔ کانگریس پناہ گزینوں کو مشورہ دیتی ہے کہ

بغیر ہندو اور مسلمان لیڈروں کی صلاح کے اور بغیر کوہاٹ کے مسلمانوں کی طرف سے باعزت دعوت کے ہرگز کوہاٹ کو واپس نہ جائیں۔ کانگریس پبلک کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان حادثہ کوہاٹ کے متعلق مشورہ دیتی ہے کہ گورنمنٹ ہند یا کسی اور کی تحقیقات کو قبول نہ کریں اور اپنے فیصلے کو اسوقت تک ملتوی رکھیں جب تک کہ انجمن اتحاد کے مقرر کردہ بورڈ یا کوئی ایسی ہی اور نمائندہ جماعت اس افسوسناک حادثہ کی تحقیقات کا فیصلہ نہ کرے۔"

کانگریس فسادات گلبرگہ کے مصیبت زدگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی ہے اور وہاں پر معابد کی جو بیحرمتیاں ہوئی ہیں ان کو مذموم قرار دیتی ہے۔

اس ریزولیوشن میں فسادات پر اظہار افسوس کیا گیا ہے لیکن اقوام متعلقہ کے درمیان الزامات کی تقسیم نہیں کی گئی ہے اور پبلک کو خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ہدایت کی گئی ہے کہ نہ تو گورنمنٹ کی اور نہ کسی اور جماعت کی تحقیقات کو اسوقت تک تسلیم نہ کریں جبتک کانفرنس اتحاد کے مقرر کردہ بورڈ یا کوئی اور ایسی ہی نمایندہ کمیٹی تحقیقات کرکے فیصلہ نہ کردے۔

گلبرگہ کے متعلق بھی اس ریزولیوشن میں مصیبت زدوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا ہے۔ لیکن نہ تو ہمدردی محض ہندوؤں کے ساتھ ہے اور نہ صرف ہندوؤں کی بیحرمتی پر ملامت کی گئی ہے۔

کوہاٹ کے معاملہ میں بھی صرف مندروں کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے نہ کہ انکی بیحرمتی کا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "کوہاٹ سے ہندوؤں کے مجبور ہوکر چلے آنے پر"

اظہار افسوس کیا گیا ہے اور مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ "ہندوؤں کو جان و مال کا پورا یقین دلائیں اور انہیں بطور اپنے معزز دوست و ہمسایہ کے واپس بلائیں اور پناہ گزینوں کو مشورہ دیا کہ جبتک کوہاٹ کے مسلمان با عزت طریقہ پر انہیں واپس نہ بلائیں اور ہندو مسلمان لیڈر انہیں مشورہ نہ دیں وہ لوگ کوہاٹ کو واپس نہ جائیں

اس ریزولیوشن کی تائید کرنے سے پہلے میں نے مہاتما جی سے جنہوں نے اسکا مسودہ تیار کیا تھا دریافت کر کے اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ ہندوؤں کے باہر چلے جانیکا جو تذکرہ کیا گیا ہے اُسکے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ انکو مسلمانوں نے باہر چلے جانے پر خاص طور سے مجبور کیا۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے ہنسی خوشی کے ساتھ وطن نہیں چھوڑا۔

میں نے مہاتما جی سے اس بات کا بھی اطمینان کر لیا تھا کہ کوہاٹ کے مسلمانوں سے ہندوؤں کے واپس بلانے اور انکی جان و مال کی حفاظت کا یقین دلانے کی جو درخواست کی گئی ہے اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ بغیر ہندوؤں پر کسی قسم کا الزام لگائے مسلمانوں کی خطا تسلیم کر لی جائے۔ مہاتما جی کا یہ مقصد تھا کہ ہندو کوہاٹ کو واپس بلائے جائیں لیکن خواہ مخواہ اس طریقہ پر نہیں کہ مسلمان اُن سے معافی مانگیں گویا صرف مسلمان ہی مجرم ہیں، بلکہ اگر ضرورت ہو تو اس غرض سے واپس بلائیں کہ جو کچھ باہمی تنازع ہوں وہ آپس میں بیٹھکر کسی غیر جانب دار پنچایت کے ذریعہ سے فیصلہ کریں۔

اب اسکے مقابلہ میں لالہ لاجپت رائے کے اس انداز کو دیکھنا چاہیے جو مدراس میں "ہندو کرانیکل" کے نمایندے سے گفتگو کے دوران میں اختیار کیا تھا

لالہ جی نے ہندوؤں کے اشتعال انگیز افعال کو اتنا اقبال کر کے ٹالدینا چاہا ہے کہ "وہ ہندو لڑکا جس نے پمفلٹ شایع کیا تھا نہایت بیوقوف اور احمق تھا،، اور پھر اپنے اس اقبال کو یہ کہہ کر اور بھی کمزور کرنے کی کوشش کی ہے کہ" اس قسم کے پمفلٹ اس سے پہلے بھی ملک کے مختلف حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بارہا شائع کئے ہیں"

اس کے بعد لالہ جی بیان فرماتے ہیں کہ" مسلمانوں ہی نے پوری ہندو جماعت کو شہر سے باہر نکال دیا اور دوسو میل پر بھاگ کر پناہ لینے پر مجبور کیا،، اس قسم کی اور بہتری باتیں لالہ جی نے کی ہیں جو کانگریس کے ریزولیوشن اور اس کے مقصد کے بالکل منافی ہیں۔ لیکن انفرادی رایوں سے علیحٰدہ ہو کر ہم ہندو مہاسبھا کے ریزولیوشن کو نقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سبھا میں لالہ جی نے تمام ہندوؤں کو اس مقصد کے لیئے مدعو فرمایا تھا کہ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس ہندوؤنکی ضروریات کو کما حقہ پورا نہیں کرتی اس لئے سبھا کے ذریعے سے ہندوؤں کی رائیں اور اسکیمیں مخصوص طریقے پر مرتب کی جائیں۔ ریزولیوشن حسب ذیل ہے۔

(۱) یہ کانفرنس ان مظالم پر اپنے سخت رنج و افسوس کا اظہار کرتی ہے جو ۹ ستمبر اور اسکے بعد مقامی اور قبائل کے مسلمانوں نے اپنے ہندو اور سکھ شہریوں پر ڈھائے ہیں اور جسکی وجہ سے تقریباً ۵۰۰، ۴ ہندوؤں کے مکانات اور دکانیں جلادی گئیں، اور بہت زیادہ جانوں کا نقصان ہوا۔ اور متعدد مندر اور گردواروں کی بیحرمتی ہوئی یا انکو نقصان پہنچایا گیا۔ اور جسکی وجہ سے کوہاٹ کے تمام ہندو اور سکھ آبادی کو شہر چھوڑنا پڑا۔ اور راولپنڈی اور پنجاب کے دوسرے مقامات پر پناہ لینی پڑی۔

(۲) یہ کانفرنس افسوس کے ساتھ اپنے اس یقین کو درج کرتی ہے کہ مقامی حکام جنکو پہلے سے خطرات کا علم تھا ایسی کارروائیاں کرنے سے قاصر رہے جس سے فسادات رک جاتے اور فسادات کے شروع ہو جانے کے بعد ان کو دبانے اور ملزمین کو گرفتار کرنے اور لٹی ہوئی جائداد کو واپس کرانے سے بھی قاصر رہے اگرچہ یہ ان کے امکان میں تھا کہ قریب کی چھاؤنی سے تھوڑے سے سپاہیوں کی مدد سے وہ تمام برائیوں کا شروع ہی میں خاتمہ کر سکتے تھے۔

(۳) یہ کانفرنس افسوس کے ساتھ اپنی اس رائے کا اظہار کرتی ہے کہ مذکورۂ بالا مظالم کے باوجود جسکی کوئی مثال موجود نہیں ہے، صوبہ سرحد کی گورنمنٹ تین ہزار کوہاٹ ہندوؤں اور سکھوں کی مصیبتوں پر ہمدردی ظاہر کرنے سے قابل افسوس طریقے پر قاصر رہی، حالانکہ یہ لوگ بالکل بے خانماں و مفلس ہو گئے ہیں اور تقریباً چار مہینے سے راولپنڈی اور دوسرے مقامات پر اپنے ہم مذہبوں کی خیرات پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نیز معاملات کے طے کرنے میں ناقابلیت سے کام لیا گیا اور زیادہ تر اسی وجہ سے ابتک کوہاٹ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت نہو سکی

(۴) یہ کانفرنس افسوس کرتی ہے کہ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر اور گورنمنٹ ہند نے جونیر مجسٹریٹ کی تحقیقات کو قبول کر لیا جس نے ہندوؤں سے کچھ دریافت نہیں کیا اور نہ انکو اس بات کا موقع دیا کہ واقعات کوہاٹ جیسے اہم معاملے پر اپنے بیان واقعات کو ثابت کر سکیں اور یہ تحقیقات مسلمہ طور پر غیر منصفانہ ہیں حالانکہ ان ہندوؤں کو اتنا شدید نقصان مسلمانوں سے پہنچا ہے۔

(۵) اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مظالم کی نوعیت جان و مال کے نقصان

کی کثرت اور اہم تنقیحات یہ تمام باتیں اسکی مقتضی ہیں کہ ایک غیر جانب دار عام تحقیقات ایسی کمیٹی کے ذریعے سے کی جائے جس پر پبلک کو اعتماد ہو۔ اور جو تمام واقعات کی تحقیقات کے بعد ایسے وسائل کی سفارش کرے جن کی بنیاد پر ہندوؤں کو اپنے تحفظ کا دوبارہ اطمینان ہو جائے۔ اور جن لوگوں کو نقصان اٹھانا پڑا ہے انہیں معاوضہ ملجائے۔ اور آیندہ اس قسم کے واقعات کا انسداد ہو جائے۔

(۶) اس کانفرنس کو یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ صوبہ سرحد کی گورنمنٹ نے بڑے بڑے ہندوؤں کو گرفتار کرکے اس بات پر مجبور کرنا چاہا ہے کہ بغیر اسکے کہ قابل اطمینان شرائط طے ہوں وہ مصالحت پر آمادہ ہو جائیں، اور مصالحت کے ناکامیاب رہنے پر جسکی بابت کوہاٹ کے ہندوؤں کے نمایندے کہتے ہیں کہ ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ گورنمنٹ صوبہ نے حکم دیا ہے کہ کوہاٹ کے سربرآوردہ ہندو اور سکھ گرفتار کر لئے جائیں۔

چونکہ ان معزز لوگوں میں سے اکثر بغیر کسی مقدمہ کے چلائے ہوئے تین مہینے سے زائد جیل میں رہ چکے ہیں اور چونکہ یہ لوگ صاحب حیثیت ہیں اسلئے کانفرنس ہز ایکسلنسی وائسرائے پر زور دیتی ہے کہ اس قسم کے تمام لوگ ضمانت پر رہا کر دئے جائیں اور ان کے مقدمات پنجاب کے کسی کورٹ میں منتقل کر دئے جائیں۔

(۷) یہ کانفرنس اپنی دلی ہمدردی کا اظہار ان لوگوں کے ساتھ کرتی ہے جنکو ان فسادات سے نقصان پہنچا ہے۔ اور جن لوگوں کو ان سے ہمدردی ہے ان سے درخواست کرتی ہے کہ ہندو مہاسبھا کوہاٹ ریلیف فنڈ میں چندے سے شریک ہوں اور اپنا روپیہ پنجاب نیشنل بنک لمٹیڈ یا سنٹرل بنک آف انڈیا لمٹیڈ لاہور، یا

دوسرے مقامات پر ان بنکوں کی شاخوں میں جمع کر دیں۔

محرک :- ٹی پرکاشم (مدراس)

مؤید :- راجہ گووندلال (بمبئی)

تائید مزید منجانب - مسٹر کوانگی (بیجاپور) ستیہ چرن شاستری (بنگال) لالہ لاجپت رائے (پنجاب) سوامی شردھانند (دہلی)

ریزولیوشن متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔

اسکے بعد مہاسبھا نے ایک ریزولیوشن گلبرگہ کے متعلق بھی پاس کیا، جو درج ذیل کیا جاتا ہے :-

" یہ کانفرنس اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار ان مسلمانوں کے افعال پر کرتی ہے جنہوں نے گلبرگہ کے بہت سے مندروں کی بیحرمتی کی، اور ان کو توڑ ڈالا۔ اور امید کرتی ہے کہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس حضور نظام کی گورنمنٹ ایسے طریقے اختیار کریگی جو اس غرض کے لئے ضروری ہوں کہ آیندہ اس قسم کے واقعات ظہور پذیر نہ ہوں، اور فرمان جاری شدہ کے موافق مندروں کے دوبارہ تعمیر کے لئے از سر نو احکام فوراً جاری کرے گی "

یہ ریزولیوشن صاحب صدر کی جانب سے پیش ہوا۔ اور متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔

جہانتک مجھے علم ہے، کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں جب کوہاٹ کا ریزولیوشن پاس ہوا ہے تو مہاتما جی نے بار بار پنڈت مدن موہن مالوی اور لالہ لاجپت رائے سے کانگریس کے اجلاس عام میں اس ریزولیوشن کی تحریک کرنے کی درخواست کی

لیکن دونوں صاحبوں نے انکار کر دیا جس پر پنڈت موتی لال نہرو اور مجھ سے اس ریزولیوشن کی تحریک اور تائید کرنے کے لئے کہا گیا اور ہم دونوں نے منظور کیا۔ بایں ہمہ پنڈت مدن موہن مالویہ نے کانگریس کے ریزولیوشن کی نہ تو مخالفت کی اور نہ کوئی ترمیم پیش کی۔ اور جہانتک میں جانتا ہوں کم سے کم انہوں نے اسکے خلاف ووٹ نہیں دیا۔ لیکن لالہ لاجپت رائے سے ان کے ہندو دوستوں نے تحریک کی کہ وہ ریزولیوشن کی تائید میں تقریر کریں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے انہوں نے ریزولیوشن کے مفہوم سے گریز کیا اور نہایت صاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کیا جنکو بعد میں انہوں نے زیادہ واضح طور پر ظاہر کر دیا ہے۔ یعنی قصور بالکل مسلمانوں کا تھا۔ اور ہندو فی الجملہ بے خطا ہیں۔

کانگریس کے ریزولیوشن کی تائید کرنے کے بعد ہی لالہ لاجپت رائے جہا سبھا کے اس ریزولیوشن کی تائید کرتے ہیں جسے میں نے مشرح طور پر اوپر بیان کر دیا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لالہ جی بہت جلد کانگریس کے ریزولیوشن کی تائید اور اپنے بعد کے طرز عمل میں مطابقت کے دلائل پیدا کرلیں گے۔ اور ان دلائل کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ البتہ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ ان واقعات کے بعد لالہ جی کے احباب مسلم لیگ کے منظور کئے ہوئے ریزولیوشن پر کیونکر اعتراض کر سکتے ہیں۔ کانگریس کے ریزولیوشن کی تائید کرنے کے بعد کانگریسی لوگ اگر جہا سبھا کے ریزولیوشن کی بھی تائید کر سکتے ہیں (حالانکہ دونوں کا مفہوم بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے) تو مسلم لیگ کے ریزولیوشن کی تائید کرنے سے کونسی بات مانع ہو سکتی ہے۔

کانگریس کے اجلاس کے بعد میں ۳۰ دسمبر کے دوپہر کو بمبئی پہنچا۔ جس وقت میں لیگ کے اجلاس میں شریک ہوا تو پریسیڈنٹ صاحب اپنے خطبہ صدارت کا آخری حصہ پڑھ رہے تھے۔ میرے مانگنے پر اس خطبہ کا ایک چھپا ہوا نسخہ مجھے بھی ملا۔ میں نے دیکھا کہ خطبہ میں جو حصہ بعد کو اضافہ کیا گیا ہے اس میں ایک جزو "مہاتما گاندھی اور کوہاٹ" کے عنوان سے بھی ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس حصہ کا اضافہ صاحب صدر کے بمبئی پہنچنے کے بعد ہوا تھا۔ اس اضافہ شدہ حصہ میں خصوصیت کے ساتھ صوبہ سرحد کے حکام کی تعریف کی گئی ہے۔

(۲)

میں مسٹر رضا علی کو عرصہ سے جانتا ہوں، دنیائے سیاست میں بغیر کسی معمولی قوت دوربینی کا دعوے کئے ہوئے میں یہ بتا سکتا ہوں کہ کسی پبلک مسئلہ میں مسٹر رضا علی کی کیا رائے ہوگی۔ لیکن نہ صرف پنڈت مدن موہن مالویہ، بلکہ لالہ لاجپت رائے اور بعض ادنےٰ درجے کے ہندو لیڈران کا طرز عمل دیکھنے کے بعد میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر رضا علی نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ خلاف توقع تھا۔

مسٹر رضا علی کو مہاتما گاندھی بلکہ کانگریس کے اس مشورہ کی معقولیت اور صحت پر اعتراض ہے کہ جب تک مسلمان ہندوؤں کو جان و مال کی حفاظت کا پورا اطمینان نہ دلائیں یہ لوگ کوہاٹ کو واپس نہ جائیں۔

سید رضا علی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ "گورنمنٹ ہند کے ریزولیوشن مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۲۴ء اور اسکے متعلق کاغذات کا بغور مطالعہ ہر غیر جانبدار شخص کو

یقین دلادیگا کہ مقامی حکام نے دانشمندی اور ہمدردی کے ساتھ کام کیا، لیکن میں مسٹر رضا علی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرنا چاہتا۔ اور یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ساتن دھرم سبھا یا ہندو مہا سبھا کی طرح انہوں نے ایک فریق کی حمایت دوسرے فریق کے مقابلے میں نہیں کی ہے۔ گزشتہ دو سال کے فسادات کے اسباب بیان کرنے کے بعد انہوں نے صرف اس طرف اشارہ کیا ہے کہ روز بروز ایک قوم میں اشتعال دلانے اور دوسری قوم میں سخت انتقام لینے کا میلان بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس سے آگے انہوں نے کسی قسم کا فیصلہ صادر نہیں کیا۔

اس سے تقریباً دو گھنٹہ بعد، جب مجھے سبجیکٹ کمیٹی کے ریزولیوشن کا ایک چھپا ہوا مسودہ ملا۔ جسکی بابت میں نے یہ گمان کیا کہ اسے لیگ کے کارکنوں یعنے مسٹر جینا پریسیڈنٹ منتقل اور مسٹر ظہور احمد سکریٹری نے مسٹر رضا علی صدر اجلاس اور اراکین استقبالیہ کمیٹی سے مشورہ کر کے مرتب کیا ہے کوہاٹ کے متعلق اس مسودہ میں حسب ذیل ریزولیوشن تھا

"آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ بغور قایم شدہ رائے ہے کہ گورمنٹ کا ریزولیوشن مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۲۴ء جو فسادات کوہاٹ کے متعلق ہے اس میں اس افسوسناک حادثہ کی ابتدا اور بعد کے واقعات صحیح بیان کئے گئے ہیں اور لیگ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے مصیبت زدگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے کے بعد ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کے کوہاٹ کو واپس جانے کے انکار کو حق بجانب نہیں سمجھتی، اور دونوں قوموں سے درخواست کرتی ہے کہ اپنے پرانے پرامن تعلقات کو دوبارہ قایم کریں"

یہ ریزولیوشن تھوڑے وقفہ کے لئے ملتوی رکھا گیا اسلئے کہ صاحب صدر یہ کوشش کر رہے تھے کہ جو معاملات کم متنازع ہیں ان کا پہلے تصفیہ ہو جائے بہت زیادہ وقت

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ایک ریزولیوشن میں صرف ہوگیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ

"آل انڈیا مسلم لیگ کی نگاہ میں چونکہ ہماری سب سے فوری قومی ضرورت یہ ہے کہ جماعتوں کے درمیان جن کی رائیں اغراض اور دائرہ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہیں، باہم اتحاد و تعاون پیدا ہو جائے، اور چونکہ یہ اتحاد صرف باہمی مفاہمت، رواداری اور تائید سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ایک نمایندہ کمیٹی اس غرض سے مقرر کی جائے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ہمارے ہم مذہب جو رہتے ہیں انکی حالت اور حیثیت کی تحقیقات کرے اور انکی رایوں اور خواہشوں کو معلوم کرنے کے بعد ہماری قوم کی سیاسی ضروریات اور مطالبات کو ایک رپورٹ کی صورت میں تیار کرے جنپر لیگ کے کسی اجلاس خاص میں جو سال آیندہ میں بمقام دہلی منعقد ہو غور کیا جائے"

پنجاب کے ایک نمایندے نے سوال کیا کہ آیا مجلس واضعان قوانین، اور دوسری منتخب شدہ جماعتوں کے مسلمانوں کی نمایندگی کا مسئلہ وہ زیر بحث رہنے دینا چاہتے ہیں، یا اس مسئلہ پر تمام بحثوں سے قطع نظر کرکے وہ مسودے والے ریزولیوشن کی پالیسی کو اس بارہ میں طے شدہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس ریزولیوشن میں وہی باتیں اختیار کی گئی ہیں جو لاہور کی پچھلی گرمیوں والے اجلاس میں طے کی گئی تھیں۔ البتہ اس ریزولیوشن میں واضح طور پر اس بات کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ باستثنائے بنگال و پنجاب کے تمام اور صوبوں میں نمایندگی مفاہمت لکھنؤ کے مطابق ہوگی اور پنجاب میں نمایندگی اس طریقہ پر ہوگی کہ "مسلمانوں کی اکثریت اقلیت یا مساوات میں نہ تبدیل کردی جائے"

اس پر صاحبزادے صاحب نے کہا کہ چھپے ہوئے مسودہ کے ریزولیوشن کو وہ

ایک طے شدہ پالیسی تسلیم کرتے ہیں اور مجوزہ کمیٹی کے اختیار سے باہر ہوگا کہ اس مسئلہ کو بھی زیر بحث لائے۔

صاحبزادے صاحب کے ریزولیوشن میں مسٹر جینا نے ترمیم پیش کی جس کا یہ مفہوم تھا کہ کمیٹی ویسی ہی مقرر کی جائے جیسا کہ لاہور کے اجلاس میں ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کا مسودہ تیار کرنے کے لئے کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اور اس کمیٹی کو دوسری سیاسی جماعتوں سے مشورہ کرنیکا اختیار دیدیا جائے

مولینا ابوالکلام آزاد نے ہمارے ہم خیالوں کے مشورہ سے ایک دوسری ترمیم پیش کی جس کا یہ مقصد تھا کہ دہلی یا اور کسی مرکزی مقام پر جلد سے جلد کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ملک کے مختلف حصوں اور مختلف سیاسی خیال رکھنے والی جماعتوں کے مسلمان نمائندے اس مقصد سے اکٹھے ہوں کہ وسیع ترین حدود کے اندر باہم تعاون کرسکیں اور صحیح متفقہ طریق عمل اختیار کرنیکا فیصلہ کریں۔

مسٹر جینا کو اپنی ترمیم پر اصرار تھا اور اسطرح بحث نے طول پکڑا۔ آخر میں انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ مولینا آزاد کی ترمیم در اصل ترمیم نہیں ہے، بلکہ ایک جداگانہ ریزولیوشن ہے اور جب یہ جواب دیا گیا کہ انکی ترمیم کی بھی یہی حالت ہے تو انہوں نے صاحبزادہ صاحب سے تحریک کی کہ وہ اپنے ریزولیوشن کو واپس لیکر مسٹر جینا کے ریزولیوشن کو منظور کرلیں چونکہ پریسیڈنٹ نے بھی فیصلہ کیا کہ مولینا ابوالکلام کی ترمیم ایک جداگانہ ریزولیوشن ہے اور اسوجہ سے وہ اس پر بحیثیت ترمیم کے مسٹر جینا کے اصلی ریزولیوشن سے پہلے رائے لینا نہیں چاہتے تو ہم لوگوں نے چار و ناچار مسٹر جینا کے ریزولیوشن کی مخالفت کا فیصلہ کیا اور بالآخر اس ریزولیوشن کو شکست دینے اور اپنی ترمیم کو بحیثیت ایک ریزولیوشن کے پاس کرانے میں کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد مسٹر جناح نے ہم لوگوں سے اس طرح پر مصالحت کرنی چاہی کہ اگر ایک ایسی کمیٹی کے تقرر کو منظور کر لیں جو مجالس واضعان آئین اور دوسری منتخب شدہ جماعتوں اور پبلک ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کے مطالبات کو طے کر سکے اور یہ اختیارات بھی رکھے کہ دوسری سیاسی انجمنوں سے مشورہ کر کے مسلم لیگ میں پیش کرے تو وہ اس ریزولیوشن کے مسودہ کو جسے صاحبزادہ صاحب نے طے شدہ قرار دیکر کمیٹی کے اختیارات سے باہر رکھا ہے واپس لے لیں گے۔ ہم لوگوں نے اسے منظور کر لیا۔ لیکن بحث میں رات کے دو بج چکے تھے۔

کوہاٹ کا ریزولیوشن جب بحث کے لئے پیش ہوا تو مسٹر محمد یعقوب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی نے نہایت دانشمندانہ تحریک کی کہ لیگ اس بارہ میں کوئی ریزولیوشن نہ پاس کرے ہم نے اس تحریک کی اس خیال سے تائید کی کہ اس مجمع میں کوئی ایسی تحریک جو کانگریس کے ریزولیوشن کے ہم معنے ہو نہیں منظور ہو سکتی تھی اور یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر لیگ کی سبجکٹ کمیٹی نے کوئی ریزولیوشن مرتب کیا تو وہ یقیناً سناتن دھرم اور ہندو مہا سبھا کے ریزولیوشن کا جواب ہوگا اور زیادہ تر خطبۂ صدارت اور مسودے والے ریزولیوشن کے جسکو میں نقل کر چکا ہوں، ہم معنی ہوگا۔

بدقسمتی سے مسٹر یعقوب کی تحریک ایک یا دو ووٹ سے نامنظور ہو گئی۔ اس پر ہم لوگوں نے مسودے والے ریزولیوشن کی مخالفت کی اب یہ طے ہوا کہ دوسرا ریزولیوشن مرتب کیا جائے۔ بالآخر مولوی ظفر علی خاں نے حسب ذیل مسودہ پیش کیا جسے انہوں نے عجلت میں تیار کیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ حادثہ کوہاٹ پر اظہار افسوس کرتی ہے اور ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے اور اپنا پختہ یقین اس

بارہ میں درج کرنے کے بعد کہ فسادات کی ابتدا ہندوؤں نے پہلے کی دونوں قوموں سے درخواست کرتی ہے کہ گزشتہ باتوں کو بھولکر اپنے قدیم باہمی تعلقات کو تازہ کریں لیگ کو یہ بھی امید ہے کہ کوہاٹ کے مسلمان چونکہ کثیر تعداد میں ہیں اپنے ہندو ہمسایوں کا فراخ دلی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔"

مجھے اس ریزولیوشن پر اطمینان نہیں ہوا۔ اور نہ اور لوگوں کو اطمینان ہوا جنہوں نے کانگریس کے ریزولیوشن کی تائید کی تھی۔ چھپے ہوئے ریزولیوشن کے مقابلہ میں جس کا شجرہ نسب مسٹر جینا کے "غصہ آمیز انکار کرنے کے بعد مشتبہ ہو گیا ہے" یہ ریزولیوشن ضرور غنیمت تھا۔ اس لئے کہ اس میں سابق مسودہ والے ریزولیوشن کی طرح گورنمنٹ ہند کے ریزولیوشن کی صحت کی تائید نہیں کی گئی۔ اور نہ اس میں ہندوؤں کے کوہاٹ واپس جانے سے انکار کو ناحق قرار دیا گیا ہے۔ پھر بھی مولوی ظفر علیخاں کے ریزولیوشن میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ہندوؤں کی مصائب بمقابلہ مسلمانوں کے بہت زیادہ تھیں۔

مسلمانوں کو اس بات کی بھی ہدایت نہیں کی گئی تھی کہ وہ ہندوؤں کو واپس بلالیں۔ بلکہ دونو قوموں سے درخواست کی گئی تھی کہ پچھلی باتوں کو بھول جائیں ایسی ہی درخواست ڈیوک آف کناٹ نے جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد حکام و غیر حکام سے کی تھی کہ گزشتہ باتوں کو بھول جائیں اور ایک دوسرے کو معاف کر دیں درحقیقت اس امید کے اظہار میں کہ مسلمانان کوہاٹ چونکہ شہر میں کثیر تعداد میں ہیں اس لئے اپنے ہندو ہمسایوں کو کشادہ آغوش میں لینے کو تیار ہیں" ایک قسم کی شاندار ہیکڑی تھی اور گویا صبح کے بھولے ہوئے سے شام کو واپس آنیکی توقع ظاہر ہوتی تھی۔

اس ریزولیوشن میں ہندوؤں پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے بلوے کی ابتدا کی لیکن مسلمانوں کی بعد کی کارروائیوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اور اگرچہ مسٹر رضا علی کے اڈریس کی طرح اس ریزولیوشن میں گورنمنٹ اور مقامی حکام کو اس بات کا سرٹیفکٹ تو نہیں دیا گیا تھا کہ انہوں نے دانشمندی اور ہمدردی سے کام کیا لیکن ان لوگوں پر نفرین بھی نہیں کی گئی تھی۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور سبجکٹ کمیٹی میں جو تھوڑے بہت لوگ رہ گئے تھے ان میں سے بھی زیادہ حصہ جانا چاہتا تھا۔ اور کیسکو کوہاٹ کے ہندوؤں کے کیساتھ انصاف کرنے یا گورنمنٹ کے قصور پر اظہار ناپسندیدگی کرنیکی پرواہ بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ان حالات میں اُن سے تھوڑی دیر ٹھیرنے کی درخواست کی اور یہ کہا کہ میں چند باتیں سرسری طور پر کاغذ پر لکھ دیتا ہوں۔ اور اگر ان لوگوں نے اسے پسند کیا تو صبح کو مناسب الفاظ میں ان کو درست کردوں گا۔ یہ سرسری مسودہ میں اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں، ایک دفعہ اس پر نظر ڈالکر ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ یہ صرف چند منٹوں میں لکھا گیا تھا۔ اور ہرگز اس غرض سے نہیں لکھا گیا تھا کہ لیگ کے کھلے ہوئے اجلاس میں بجنسہٖ پیش کیا جائے۔ پنجاب اور صوبہ سندھ کے نمایندوں نے اُسے منظور کرلیا تھا۔ لیکن اُن میں سے اکثر اشخاص بعض ایسے اسباب سے جنکو اُن لوگوں نے بعد کو واپس لے لیا (اور مجھے اس سے مسرت ہے) یہ چاہتے تھے کہ گورنمنٹ پر نفرین کرنے والا حصہ نکالا جائے۔ میں اسے منظور نہیں کرنا چاہتا تھا اور کل معاملہ ہنوز ناتمام تھا۔ کہ مولوی ظفر علی خاں نے بالکل دوسرے مضمون پر ریزولیوشن پیش کردیا جس میں وہ ناکامیاب رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی ناکامی پر بہت جھلاہٹ تھی اور اسکے بعد انہوں نے یہ چاہا کہ مسئلہ کوہاٹ کے ریزولیوشن پر بھی تقسیم آراہو۔

چونکہ پنجاب کے احباب کو گورنمنٹ پر نفرین کرنے سے اختلاف تھا اس لئے اُن لوگوں نے میرے خلاف رائے دی اور مولوی ظفر علیخاں والا مسودہ دو یا تین رائے کی کثرت سے منظور ہو گیا۔

چونکہ یہ سب سے آخری کام رکھا گیا تھا سبجکٹ کمیٹی منتشر ہونا شروع ہو گئی ایسی صورت میں جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ یہ تھا کہ میں نے اس بات کا نوٹس دیا کہ میں اپنے مسودہ کو بطور ترمیم کے پیش کروں گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سرسری مسودہ کے الفاظ کا پابند ہو جانا پڑا۔ حالانکہ مسودہ ایک سرسری خاکہ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ فوراً ایک یادومنٹ کے اندر اسکی صاف شدہ نقل کی ضرورت تھی اور میں نے بغیر کسی وقفہ کے مسودہ کو صاف کرنا شروع کر دیا۔ عین اسی موقع پر جبکہ میں نصف بھی نہیں لکھ پایا تھا فاؤنٹن پن کی روشنائی کو بھی ختم ہونا تھا۔ اور آنریری سکرٹری سے پنسل کہ وہ بھی قلم تراش کی محتاج معلوم ہوتی تھی مانگ کر میں نے بُرے بھلے اس مسودہ کو بعجلت پورا کیا۔ تقریباً تین بجے میں نے اپنی ترمیم کا "صاف شدہ" مسودہ آنریری سکرٹری صاحب کے حوالہ کیا۔ اور اُن کو اور اُن کے ٹائپ کرنیوالے کو سبجکٹ کمیٹی کے کمرہ میں تنہا چھوڑ کر اپنی جگہ پر چلا آیا۔

دوسرے روز مسٹر برکت علی نے مجھ سے کہا کہ چونکہ میں کوہاٹ کے ریزولیوشن کا مؤید ہوں اس لئے میں نے ظفر علیخاں کو راضی کر لیا ہے کہ وہ آپ کے تیار کئے ہوئے ریزولیوشن کو پیش کریں۔ اس طرح میں اس ترمیم کو پیش کرنیکی زحمت سے بچ گیا۔ جو فی الواقع میرے خیال کی پوری پوری ترجمانی نہیں کرتی تھی۔

جب اس ریزولیوشن کی پیشی کی نوبت آئی تو مسٹر جینا میرے پاس اس بات پر

ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے آئے لیکن میں گورنمنٹ سے قطع نظر کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور میں نے کہدیا کہ اگر محرک یا مؤید اپنے فیصلے سے ہٹ جائیں گے تو میں خود اس ریزولیوشن کو پیش کر دونگا۔ جسکو میں نے بطور ترمیم کے پیش کیا تھا۔

اسی وقت میں میرے دوست بھروچہ نے مجھ سے کہا کہ میرا مقصد (جو ترمیمی ریزولیوشن میں ظاہر کیا گیا تھا) یہ تو نہیں ہو سکتا کہ "کوہاٹ کے ہندوؤں کے مصائب بغیر اشتعال کے نہیں پیش آئیں۔ اور میں نے اسی وقت اقرار کیا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانان کوہاٹ کا فعل بغیر اشتعال کے نہیں صادر ہوا" مصائب کا لفظ کیونکر درمیان میں آگیا۔ یہ بات میرے اصلی مسودہ کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

صورت یہ پیش آئی کہ پہلے میں نے ان مصائب کی زیادتی کو اہمیت دینا چاہا لیکن چند سطریں لکھنے کے بعد مجھے ضروری معلوم ہوا کہ نوعیت اشتعال کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس سے ان مصائب کی زیادتی کا ذکر وہاں سے کاٹکر چار سطروں کے بعد نیچے لکھنا پڑا۔ اور "مصائب" کا لفظ جس سے میں نے ابتداء کی تھی اپنی جگہ پر۔

میں نے مسٹر بھروچہ سے کہا کہ میری جانب سے مسز نیڈو سے کہیں، اور ان کی معرفت مسٹر جینا کو رضامند کریں کہ میں ترمیم کے الفاظ میں یہ تبدیلی کر لوں۔ میں خود براہ راست کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر پہلے میں نے گورنمنٹ پر نفرین کرنے والے حصے کو نکال لینے سے انکار کر دیا تھا اور اپنی ترمیم کے پیش کرنے پر اصرار کیا تھا۔ تو میں کیونکر یہ توقع کر سکتا تھا کہ وہ کسی قسم کی ردّو بدل پر راضی ہوں گے ممکن تھا کہ مسز نائیڈو کامیاب ہوئیں۔ اور میں نے مسٹر بھروچہ کی معرفت ان کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ کوشش کریں لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی اور ریزولیوشن بغیر اس

تبدیلی کے جسے میں چاہتا تھا پیش ہوا۔ اور اگر یہ تبدیلی ہوگئی ہوتی تو کسی شخص کو یہ خیال آنا بھی محال ہوجاتا کہ میری نظر میں کوہاٹ کے ہندو اپنے مصائب کے مستحق تھے۔

رات کے وقت جب میں ریزولیوشن کو مرتب کر رہا تھا تو مجھے یقین تھا کہ سبجکٹ کمیٹی کے ممبر اور لیگ کے ممبر بھی دو باتوں کے ذکر پر زور دیں گے اس لئے کہ یہ دونوں باتیں اُنکی رائے میں غیر مشتبہ تھیں۔ اول یہ کہ کرشن لال نے جنم اشٹمی کے موقع پر جو نظم "کرشن سندیس" کے نام سے شایع کی، وہ اشتعال انگیز تھی۔ اور دوسرے یہ کہ ایک ہندو کے مکان سے چند مسلمانوں پر جو غل وشور مچاتے ہوئے جا رہے تھے گولیاں چلیں جس سے ایک مسلمان بچے کی جان گئی۔ جہانتک مجھے علم ہے ابتک کسی ہندو نے ان باتوں پر ملامت نہیں کی ہے۔ اور ہندو اخبارون اور دوسرے پروپگنڈا کرنیوالوں نے تو یہ شہرت دے رکھی ہے کہ مسلمانان کوہاٹ نے بغیر کسی اشتعال کے بے ضرر ہندؤوں کے ساتھ تشدد کا برتاؤ کیا۔ مہاتما گاندھی کے روزہ سے بھی یہی کام نکالا گیا ہے۔ اور یہ شہرت دی گئی ہے کہ خلافت کے مسئلہ میں مسلمانوں کی خود حمایت کرکے اور دوسرے ہندؤوں کو بھی حمایت پر آمادہ کرکے انہوں نے مسلمانوں کو یہ ہمت دلائی تھی کہ ہندؤوں سے یہ تشدد پیش آئیں اور بالآخر اپنی غلطی معلوم کرنے کے بعد وہ اس خیال سے کفارہ ادا کر رہے تھے کہ اپنی قوم کیساتھ انہوں نے بدسلوکی کی۔

میں اس موقع پر یہ ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ابتدا ہی میں یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ لوگ مہاتماجی کے روزہ سے یہ مطلب نکالنا چاہیں گے۔ اور میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ روزہ رکھنے کی بجائے وہ میری اس تجویز کو قبول کرلیں کہ وہ سیدھے کوہاٹ کو چلے جائیں۔ اور میں خود بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار تھا، تاکہ وہاں پہنچکر اصل واقعات

کی تحقیق کی جائے۔ اب تک میرا خیال یہ ہے کہ اگر مہاتما جی کی صحت زیادہ بہتر ہوتی تو روزہ رکھنے کا خیال ان پر اتنا حاوی نہ ہوتا۔ اور ان کا یہ فعل ویسا ہی کمزوری کا اظہار کرتا تھا جیسا کہ تین مہینہ پہلے احمد آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں۔

ان کے رو پڑنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ بیرونی اسباب دونوں صورتوں میں موجود تھے لیکن صحت کے لحاظ سے وہ اگر بہتر ہوتے اور اپنی طبعی اور محکم عزم سے کام لینے کے قابل ہوتے تو ان اسباب کا اتنا اثر نہ ہوتا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی عام طور پر اپنی اس رائے کو روزے رکھنے جیسے نازک معاملے کے متعلق نہیں ظاہر کی ہے اس لئے کہ سیاسی رہنما اور بھائی سے بڑھکر میں انکو "باپو" لکھتا بھی ہوں، اور ایسا ہی سمجھتا بھی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایک ذاتی اور نجی بات کے متعلق اس طرح میرے اظہار رائے کی گستاخی پر وہ مجھے معاف کر دیں گے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر ان کا شخصی لحاظ کر کے صورت معاملہ کو جیسا میں نے سمجھا ہے نہ ظاہر کروں تو میں اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہوں گا۔

ایک ہندو نے جو اشتعال انگیزی کی تھی۔ اور ایک دوسرے ہندو نے فیرکی ابتدا کی۔ ان دونوں باتوں کے متعلق اگرچہ میں نے پہلے بھی کچھ نہیں کہا اور نہ اب کہنا چاہتا ہوں۔ اور صرف اسی پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں کہ تمام باتیں قومی پنچایت یا کسی ایسی ہی غیر جانب دار جماعت کے ذریعے سے تحقیق ہو جائیں۔ پھر بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں پر ہر طرف سے جو یہ اعتراض ہو رہے ہیں کہ بحیثیت قوم کے انہوں نے ہندوؤں کے خلاف تشدد کا استعمال کیا تو اگر مسلمان ان الزامات کی تردید کریں اور یہ کہیں کہ ان کے افعال خواہ کیسے ہی مجرمانہ ہوں بغیر اشتعال

نہیں سرزد ہوئے، اور تشدد کی ابتدا ان کی جانب سے نہیں ہوئی اور اگر ہندوؤں کو شخصی مصیبت کا سامنا ہوا تو تنہا انہیں کو نہیں مصیبتیں اُٹھانی پڑیں تو کوئی شخص انکی صحت کو نا معقول نہیں کہہ سکتا۔

میں نے جس ریزولیوشن کو ترتیب دیا تھا اس میں انہیں خیالات کا اظہار منظور تھا لیکن یہ ریزولیوشن میرے خیال کا آئینہ نہ تھا۔ بلکہ میں نے اُسے اس طرح ترتیب دیا تھا کہ مسلم لیگ جو مختلف عناصر سے مرتب ہے اور جو بمقابلہ خلافت کمیٹی کے قوم کی پوری نمایندگی نہیں کرتی ہے اس ریزولیوشن کو قبول کریگی۔

اشتعال کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ یہ واقعہ ناقابل تردید ہے اور ہندو جتنا اسکی تردید کرنا چاہتے ہیں اُتنا ہی اپنے معاملہ کو خراب کرتے ہیں۔ جو شخص بھی اس قسم کی اشتعال انگیز تحریروں کی تائید کرے گا۔ اس پر بھی یہی دھبّہ لگیگا۔ لالہ لاجپت رائے نے دبی زبان سے "ہندو نوجوان" کا ذکر کیا ہے جسکو صرف "بے شعور اور احمق" کہہ کر نظم کے شایع کرنے کے کل قصہ کو ختم کر دینا چاہا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی اکثر باتیں" اس سے پہلے بھی ملک کے اکثر حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے شایع کی ہیں،، اور پھر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ" اس پمفلٹ کو اُن افعال کی صفائی میں پیش کرنا جو اشتعال مذکور کے بعد فریق ثانی سے سرزد ہو سخت حیرت انگیز ہے"

لالہ جی نے جو حمایت" نوجوان،، بے شعور،، اور" احمق ہندو" کی جو" مذکورہ (یا مفروضہ) اشتعال،، کا سبب ہوا، کی ہے اور جو اشارہ" ملک کے مختلف حصوں"

کی طرف کیا ہے جس سے اُن کا مقصود بلاشبہہ پنجاب کی مہذب اور تعلیم یافتہ سرزمین ہے جہاں اس سے پہلے اس قسم کی اکثر تحریریں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے شایع ہوتی رہتی ہیں۔

ان باتوں کو دیکھ کر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ویسی ہی باتیں نہیں ہیں جیسی کہ سناتن دھرم سبھا کوہاٹ کے کارکن سکریٹری نے اُسی روز جب کوہاٹ میں بلوہ ہوا تھا چیف کمشنر پنجاب کے پاس ایک درخواست لکھ کر بھیجی تھی اس درخواست میں بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ نظم بالکل

"ایک معمولی قسم کی عبارت ہے جو عام طور پر اخباروں پمفلٹوں اور ٹریکٹوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے،، ———— ،،

اسکے بعد سکریٹری مذکور کا بیان ہے کہ :۔

"پراچا قوم (تاجران کوہاٹ) کے بعض خودغرض افراد نے اسسٹنٹ کمشنر سے ملکر اُنکو یہ یقین دلایا کہ اگر سناتن دھرم سبھا نے معافی نہ مانگی تو سخت بلوے کا اندیشہ ہے۔ اس پر اسسٹنٹ کمشنر نے سبھا سے جائز یا ناجائز طور پر اظہار افسوس حاصل کیا...... نظم مذکور کا ترجمہ حکام، اور مسلمانوں نے غلط کیا ہوگا یا اسکا غلط مفہوم پیش کیا ہوگا۔ ورنہ یہ ایک معمولی قسم کی نظم ہے جس کا مقصد اشاعت مذہب ہے،،

اس مبلغ سے قطع نظر کرکے لالہ جی جیسے آزاد خیال شخص سے ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اُن کا بھی یہ خیال نہیں ہے کہ اس قسم کی نظمیں جو پنجاب میں "اشاعت مذہب کے لئے" لکھی جاتی اور چھاپی جاتی ہیں۔ جب صوبہ سرحدی میں اُن کی اشاعت ہوگی تو اسی قسم کا تشدد رونما ہوگا

جن کا کہ کوہاٹ میں تجربہ ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نظم کو ''ان واقعات کے عذر میں پیش کرنا جو بعد کو ظاہر ہوئے''، ضرور بعید از عقل ہے اور جو مسلمان اس قسم کا عذر کرتے ہیں سب سے پہلے اسکو مورد الزام قرار دونگا۔

فیر کرنے کے متعلق ایک قوم پرست پشاوری ہندو نے جو مہاتماجی کے روز کے ابتدائی زمانہ میں آیا تھا، کہا کہ پہلا فیر ایک سربرآوردہ ہندو کے مکان سے ہوا۔ اور جن مسلمانوں کو اس سے زخم پہنچا وہ غیر مسلح تھے میرا خیال ہے کہ ہندو اس واقعہ سے انکار کرتے ہیں اور بطور خود اگرچہ میں اس ضروری واقعہ کا ذکر ریزولیوشن میں کرنا پسند کرتا اور کل معاملہ قومی پنچایت پر چھوڑ دیتا لیکن مجھے علم تھا کہ ایسی صورت میں کہ سناتن دھرم کانفرنس اور ہندو مہا سبھا تمام الزام مسلمانوں پر رکھ کر یک طرفہ فیصلہ دے رہی ہیں مسلم لیگ میرے ہم خیال نہیں ہو سکتی تھی

جو ریزولیوشن میں نے مرتب کیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوؤں کے مصائب بمقابلہ مسلمانوں کے بہت عظیم تھے اور برخلاف سبجکٹ کمیٹی کے چھپے ہوئے ریزولیوشن یا مولانا ظفر علی خاں کے ریزولیوشن کے اس میں صرف ہندوؤں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا خلاف انصاف ہے کہ اس ریزولیوشن سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ دونوں قوموں کو برابر نقصان پہنچایا۔ اگر یکساں نقصان نہ بھی پہنچا تو ہندوؤں کے مصائب کسی خاص ذکر کے مستحق نہیں۔

جب کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد ہوا ہے تو مجھے ہمیشہ یہ فکر ہوا کہ اگر خاص اس مقام پر دونوں قومیں باہم صلح کر سکیں اور اپنی اپنی بداعمالیوں پر افسوس کرنے کے لئے تیار ہوں تو ایک غیر جانبدار پنچایت کے ذریعے سے تحقیقات ہونا ضروری

ہوتا ہے مغربی یورپ میں ترکوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں کی شہرت کا جو پروپیگنڈہ ہوتا رہتا ہے۔ اسکے تجربہ کی بنیاد پر مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ تشدد پر یقین رکھنے والے کا نامۂ اعمال ہر نئے الزام کی وجہ سے نہ صرف زیادہ ضخیم ہوتا جاتا ہے۔ بلکہ وقوعہ کے فوراً ہی بعد اگر پورے طور پر اس الزام کی تحقیقات نہ کی جائے تو زیادہ سیاہ بھی نظر آنے لگے گا۔

وفد خلافت کے ساتھ جب میں یورپ گیا تو میں نے ترکوں کی ان ظالمانہ کارروائیوں کی شہرت دینے والوں سے کہا کہ اگر وہ سچے ہیں تو ایک ایسا بین الاقوامی کمیشن مقرر کرائیں جس میں ہندوستان اور دوسری جگہ کے مسلمان بھی شریک ہوں۔ اور جو مظالم آرمینیا کی پوری تحقیقات کرے۔ میرا یہ یقین ہے کہ یہ بات خود مسلمانوں کے لئے مفید ہے کہ ہر مقام میں جہاں ہندو مسلم فساد ہوں وہ ایسی تحقیقات پر زور دیں۔ اس صورت میں انکی خطا کچھ ہی کیوں نہ ہو میرا گمان ہے کہ تحقیقات کے بعد ان کا جرم اس سے کہیں کم ثابت ہو گا جتنا کہ ان کے مخالفین اخباری پروپگنڈا کے ذریعے سے اُن پر عاید کرتے ہیں۔

(۳)

مجھے افسوس ہے کہ چھپے ہوئے ریزولیوشن کے مسودے اور مولوی ظفر علی خاں کے ریزولیوشن دونوں میں سے کسی میں حادثہ کوہاٹ کی تحقیقات پر توجہ نہیں کی گئی تھی۔ میرے ریزولیوشن نے اس کمی کو پورا کیا۔ لیکن مجھے اقرار ہے کہ عجلت میں میں نے ایک ایسا فقرہ استعمال کیا ہے جس سے ممکن ہے کہ غلط فہمی پیدا ہو میرے الفاظ یہ ہیں:۔

"مسلم لیگ اسوقت گورنمنٹ یا دونوں قوموں کے شایع کردہ بیانات کی تفصیلات کے متعلق کوئی رائے نہیں قایم کر سکتی" اور اسکے بعد میں نے ملک سے درخواست

کی ہے کہ جب تک ایک کمیٹی جس میں ہندو مسلمان کافی نمایندگی کریں، تمام واقعات کی تحقیقات کر کے اپنے نیتجۂ تحقیقات سے اطلاع نہ دے لوگ اپنا فیصلہ ملتوی رکھیں۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے اور مسٹر جینا نے جلسۂ لیگ میں دوران مباحثہ میں کہا بھی کہ اگر تین نہیں تو دو فیصلہ تو اس ریزولیوشن میں موجود ہی ہیں یعنی اول یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو سخت اشتعال دلایا گیا۔ اور ہندوؤں نے تشدد کی ابتدا کی اور یہ کہ صرف ہندوؤں ہی کو نقصان نہیں پہنچا ایک معنی میں یہ بالکل صحیح ہے۔ پہلے دونوں باتوں کا تعلق حادثہ کی ابتدا سے ہے۔ اور آخری حصے میں ایک عام حالت بیان کی گئی ہے جس سے کسیکو انکار نہیں ہے بلکہ درحقیقت مسلم ہے۔ میں جس مطلب کو ادا کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلم لیگ ان واقعات پر کوئی رائے نہیں قایم کر سکتی جو اشتعال اور فائر کی ابتدا کے بعد ظہور میں آئے۔

بعد کے واقعات کچھ کم نہیں ہیں۔ اور ان کے متعلق لفظ تفصیلات میں نے بالکل غلط استعمال کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ دو ہفتہ تک متواتر کام کرنے اور راتوں کو جاگنے کے بعد سال کے اس آخری دن میں بھی دو بجے رات تک بیٹھنے سے میرا دماغ پریشان ہو گیا تھا۔ اور صحیح لفظ میرے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ میرے ابتدائی مسودہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میں صحیح لفظ کی تلاش میں تھا لیکن نہیں ملتا تھا اسلیے کہ بجائے واقعاتِ مابعد کے پہلے میں نے الفاظ دیگر تفصیلات، استعمال کیے لیکن جب پورا اطمینان نہیں ہوا تو لفظ "دیگر" میں نے خارج کر دیا

میں نے جو لفظ استعمال کیا اس سے میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ اشتعال اور تشدد کی ابتدا ہی خاص واقعات تھے اور جو باتیں بعد کو ظہور پذیر ہوئیں وہ محض

تفصیلات ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر خاص خاص واقعات کی صحیح طور پر تصدیق ہو جاتی، اور صرف تفصیلات کی تحقیق باقی رہتی تو کمیشن تحقیقات ایک زائد چیز رہجاتی۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جس صحیح لفظ کی تلاش میں نے اسی رات ہی میں نہیں بلکہ ۸ جنوری تک کی وہ سبجکٹ کمیٹی کے چھپے ہوئے اسی کمبخت ریزولیوشن میں موجود تھا جسکی وجہ سے میں نے تمام محنت گوارا کی کہ اس سے بہتر اور زیادہ منصفانہ ریزولیوشن مرتب کروں

۸۔ جنوری کو جب میں اس تصریح کے لکھنے کے لئے بیٹھا تو میں نے سبجکٹ کمیٹی کے ریزولیوشنوں کو نکال کر کوہاٹ والے ریزولیوشن کو دوبارہ پڑھا اور اسی میں یک بیک الفاظ "ابتدائی" اور "واقعات مابعد" مجھے صاف نظر آئے اور اسوقت میں نے اپنے پر نفرین کی کہ پہلے یہ الفاظ کیوں نہیں سوجھے۔

ہندوؤں کو کوہاٹ واپس بلانے کے متعلق میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہندو پناہ گزینوں کو مدعو کریں لیکن اس طریقہ پر نہیں کہ شہر میں اپنی کثیر تعداد ہونیکا ذکر فخریہ طور پر کرکے یہ کہا جائے کہ ہندو بھائیوں کو ہم کشادہ آغوش میں لینے کے لئے تیار ہیں بلکہ ان کو اس طور پر واپس بلانا چاہیے جیسا کہ متاسف اور پشیمان آدمی کا فرض ہے خصوصیت کیساتھ اس امر کا احساس کرتے ہوئے کہ کثیر تعداد آبادی کے لئے کسی قسم کے اشتعال پر بھی ہندوؤں کی قلیل تعداد کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا روا نہیں ہے۔ جسکی وجہ سے وہ اپنا گھر چھوڑ کر دسویں میل پر جاکر پناہ لیں۔

میں اس قسم کے احمقانہ بیانات پر یقین نہیں کرتا کہ کسی ہندو کی گولی ہٹی کے تیل کے کنستر میں جالگی اور اس سے آگ بھڑک اٹھی۔ لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں

کہ اسکی بھی تحقیقات ہونی چاہئے کہ کس حد تک جان بوجھ کر آگ لگائی گئی۔ اور خاصکر اس بات کا فیصلہ ضروری ہے کہ آیا مندر اور گردوارے صرف اتفاقیہ جل گئے، یا عمداً انکی بیحرمتی کی گئی۔

میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میں جائداد کے نقصان کے ذکر میں مندروں اور گردواروں کو بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جائداد کے ساتھ معابد کا محض ذکر ہی کافی نہیں ہے بلکہ انکی بیحرمتی پر نفرین بھی ہونی چاہئے تھی۔ اور اسی وجہ سے میں نے گردواروں اور مندروں کا ذکر نہیں کیا لیکن میں اس بات کو بیان کردینا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی بھی معابد کی بے حرمتی کو مجھ سے زیادہ نفرت سے نہیں دیکھ سکتے۔ جن لوگوں نے دہلی کے مندر کی بیحرمتی پر میرے اظہار نفرت کو پڑھا ہوگا (حالانکہ مسلمان لوگ اسکے سخت خلاف تھے کہ فیصلہ عدالت سے پہلے اس قسم کا اظہار ملامت کیا جائے) وہ ہرگز یہ یقین نہیں کرسکتے کہ میں کوہاٹ میں ان باتوں کو روا رکھوں گا۔

مجھے اب صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے۔ میں حکام کے مناسب تدابیر کے نہ اختیار کرنے کو مذموم قرار دیتا ہوں اسلئے کہ وہ لوگ کوہاٹ کے ہندو، اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت اور وقوعہ کو روکنے سے قاصر رہے۔ لیکن میں اس قصور کو بہت زیادہ سختی کے ساتھ اس وجہ سے مذموم قرار دیتا ہوں کہ میرے ہموطنوں کے سخت مصائب میں مبتلا ہونے کے علاوہ گورنمنٹ نے اسلام اور ہندوستان کو دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے لیگ کے جلسہ میں کہا تھا۔ گورنمنٹ کا فرض تھا کہ کوہاٹ کی تمام فوجی قوتوں سے کام لیکر ہر ایسے مسلمان کو گولی سے مار دیتی جو

ہندوؤں کو خارج البلد کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد رائٹر یا انگریزی اخبارات کے نامہ نگاروں کو ولایت میں ایسی خبروں کے بھیجنے کا موقعہ نہیں ملتا جس سے مسلمانوں اور ہندوستان کا نام قوموں کے درمیان بدنامی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اخبارات اور جو پارٹی برسر حکومت ہے حادثہ کو ہاٹ کو اپنے حصول غرض کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ اخباروں کے اڈیٹروں نے اس حادثہ کی دہشت انگیز سرخیاں بنا کر شائع کیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے وقار کو دنیا کی نگاہوں میں سخت صدمہ پہنچایا لیکن دنیا میں صرف احمق ہی آباد نہیں ہیں۔ فوری شدید اثر کے ختم ہونے کے بعد جب دنیا ہماری باہمی عدم رواداری اور نالائقی کے یقین سے گزر کر مزید حالات پر غور کرے گی تو لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ایسی زور آور گورنمنٹ جس کے اتنے کثیر فوجی اخراجات ہیں کیونکر اپنے اس اولین فرض سے قاصر رہی یعنی ایک چھوٹے سے قصبہ کے ایک فرقہ کے ہاتھوں سے اپنی رعایا کی جان ومال نہ بچا سکی۔

میں نے اس تصریح کی ابتدا میں کہدیا ہے کہ میں اسے اپنے ان شرکار کار کے واسطے لکھ رہا ہوں جو مجھ سے بجائے مسلم لیگ کے ریزولیوشن کے جس کے مسودہ تیار کرنیکا مجھے اقرار ہے۔ کچھ زیادہ توقع کرتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ میں نے کافی طور پر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ایسی اولاد کی نسبت میں نے اپنی طرف کیونکر منظور کی۔ اور میرا اکراہ جلسہ لیگ کے اس طریق عمل سے بھی ظاہر ہے کہ میں نے اسے پنجاب کے دو قوی ہیکل جوانوں کے حوالے کر کے اپنی جان چھڑالی۔

اس تصریح کو ختم کرنے سے پہلے میں یہ بھی کہدینا چاہتا ہوں کہ علاوہ اپنے

ساتھ کام کرنے والوں کے، کوہاٹ کے ان بیگناہ مظلوموں کے خیال سے بھی میں اس
تصریح کو ضروری سمجھتا ہوں جنکو اشتعال دلانے والوں کی مجرمانہ حماقت اور اُن لوگوں
کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے نقصان اُٹھانا پڑا جن کا یہ فرض تھا کہ مجرموں کے ساتھ ملامت
اور تذبذب کے برتاؤ کرنے کی وجہ سے بیگناہ لوگوں کو مصائب کا شکار نہ ہونے دیتے



ہندو مسلم تعلقات اور مسلک خلافت

(ہمدرد ۔ ۲۹ - اپریل ۱۹۲۶ء)

یہ بڑا نازک دور ہے، ہندوؤں کی طرف سے شدھی و سنگٹھن کا کام بڑے زور شور سے ہورہا ہے۔ علی برادران مسلمانوں کو جوابی کارروائی نہیں کرنے دیتے، بلکہ ان مسلمان رہنماؤں کی مخالفت کرتے ہیں جو تبلیغ و تنظیم کا پرچم لیکر میدان میں آتے ہیں۔ محمد علی کی خواہش ہے کہ صحیح الخیال مسلمان رہنما غلط کار مسلمان رہنماؤں کو آگے نہ بڑھنے دیں اور صحیح الخیال ہندو رہنما غلط کار ہندو رہنماؤں کے آڑے آجائیں۔ محمد علی نے بدنامی بھی اور اس مسلک پر قایم رہے۔ لیکن گاندھی جی؟ موتی لال ان حضرات نے مہاسبھا کی سرگرمیوں کی نہ صرف مخالفت نہیں کی بلکہ در پردہ، بالواسطہ مہاسبھائیوں کی حوصلہ افزائی کی۔

اب محمد علی کی رہنمائی میں خلافت کمیٹی کا مسلک بدلتا ہے وہ ہندو رہنماؤں کو دعوت دیتی ہے کہ اگر سوراج حاصل کرنا ہے تو خانگی جنگ بند کرو۔ غلط کار رہنماؤں کو ٹوکو۔ ورنہ ہم بھی مسلمانوں کی تنظیم کا کام اپنے ذمہ لیتے ہیں۔

چنانچہ اس بیان کے چند روز بعد دہلی میں اسپیشل خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا مسیح الملک حکیم اجمل خاں صدر استقبالیہ تھے۔ مولینا ابوالکلام آزاد کی تائید سے مولانا

سید سلیمان ندوی صدر جلسہ ہوئے حکیم صاحب نے بھی ہندو رہنماؤں کی شکایت کی
سید صاحب نے اپنے خطبہ میں کہا، ہم تمہاری طرف ہاتھ بڑھا رہے ہیں اب تمہیں اختیار
ہے کہ اس ہاتھ کو مصافحہ کا ہاتھ سمجھو یا وہ ہاتھ جو ایک پہلوان دوسرے سے ملاتا ہے
مسیح الملک کے اس رویہ، محمد علی کی اس روشن روش، اور خلافت کمیٹی
کے اس مسلک پر ــــــــ جو بہرحال مدافعانہ تھا ــــــــ
ہندو اخبارات نے خوب گالیاں دیں۔ مگر گاندھی جی وغیرہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے
وہ اتحاد سوز ہستیوں ــــــــ مالوی جی اور لاجپت رائے ــــــــ
کی عقیدت میں چُور رہے۔ (مؤلف)



مرکزیہ جمعیت خلافت کے بعض ارکان جو مسز نائیڈو اور پنڈت
موتی لال نہرو سے مشاورہ کرنے کی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں موجودہ صورت
حالات پر غور کر رہے ہیں۔ جو کلکتہ کے فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے
مجلس خلافت کے سربر آوردہ ارکان میں سے ایک کی رائے میں یہ صورت
بہت تشویش انگیز ہے اور ان کو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر اسکے بد سے بدتر ہو جانے کا
احتمال ہے۔ محمد علی نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کے ایک نمایندے سے دوران ملاقات
میں حالات حاضرہ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مرکزیہ جمعیت خلافت جس کے اجلاس دہلی میں ۱۷ سے ۲۱۔ اپریل تک
منعقد ہوئے ہیں اُنکیں بہت طویل غور و خوض کے بعد جو باتیں طے پائی ہیں مجھے امید
ہے کہ اُن سے بہت اہم اور دوررس نتائج پیدا ہوں گے عوام کے دماغ میں تنظیم،

خلافت کا تخیل زیادہ تر "اسلام بیرونِ ہند" سے وابستہ ہے۔ کیونکہ خلافت کمیٹی
جنگ کے آخری مہینوں میں عالم وجود میں آئی تھی۔ تاکہ اسلام کے دنیوی اقتدار کو
نیست و نابود ہونے اور سلطنت خلافت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا جا سکے،
لیکن دو سال ہوئے خلافت کمیٹی نے مسلمانان ہند کے، مذہبی، تمدنی، تعلیمی اور
اقتصادی معاملات کی نگہداشت کا فرض بھی جو کچھ کم اہم نہ تھا، اپنے ذمہ لینے کا
فیصلہ کیا جس سے اس نازک زمانہ میں جب کہ تحریک "عدم تعاون" اپنے عروج پر
تھی۔ مجبوراً بہت کافی غفلت و بے اعتنائی برتی گئی تھی۔ بدقسمتی سے تحریک خلافت
میں اس جدید باب کے آغاز کا اظہار مجلس خلافت کے دستور اساسی میں تبدیلی کرکے
نہ تو بلگام میں کیا گیا اور نہ کانپور میں۔ جیسا کہ قواعد کی رو سے ضروری تھا۔ اور اگرچہ
کمیٹی اپنے جدید فرائض ضروری قوت و مستعدی کے ساتھ انجام دینے کا تہیہ کر چکی
تھی مگر، ناکافی اعلان کی وجہ سے اسکی دعوت پر اس حد تک لبیک نہیں کہا گیا جس حد
تک کہ ان ذمہ داریوں کے قبول کرنے کے لئے ضروری تھا۔ اب اس نے طے کر لیا ہے
کہ اس واقعہ کا خاطر خواہ اعلان کر دے کہ اس نے مسلمانان ہند کی تمام مذہبی،
تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی ضرورت پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے بشرطیکہ
وہ ایسے جامع اقدام کے لئے ضرورت کے مطابق آدمی اور روپیہ فراہم کریں۔
اب تک کوئی ایسی تنظیم نہیں رہی جس نے ایک ایسی جامع نوعیت کی ذمہ داری قبول کی
ہو کہ وہ مسلمانوں کی تمام ضروریات کی کفیل ہوگی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک ضرورت
بھی پوری نہیں ہوئی۔ اور اگر پوری ہوئی بھی تو محض ادھوری۔ اب خلافت کمیٹی
پہلی مرتبہ نہ صرف خلافت کے اقتدار دنیوی کے غازی کی حیثیت سے میدان عمل میں

آتی ہے بلکہ یہ بجائے خود ایک چھوٹے پیمانہ پر خلافت کاملہ ہوگی - یہ خلافت، بنی اُمیہ، بنی عباس، یا عثمانی ترکوں کی سی خاندانی خلافتوں کے مانند نہ ہوگی بلکہ پہلے چار خلفا کی خلافت کا نمونہ ہوگی جو خلفائے راشدین کہلاتے ہیں یا اب سے تقریباً بیس برس پہلے کے محاورہ میں تنظیم "خلافت" اسلامی ہند کی ویلیم دہائٹلے (یعنی تمام قومی ضروریات کو پورا کرنے والی) ہوگی -

اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ تمام قومی کاموں کا بلاشرکت غیرے ٹھیکہ لیگی اور اپنی ہوس کاہی کے لئے اور تمام جماعتوں کو جو اسوقت کام کر رہی ہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے پر مجبور کردے گی -

یہ تنہا کسی چیز کا اجارہ نہیں لے گی مگر ہر چیز میں اعتدال و انضباط پیدا کرے گی - اور اسے منظم بنائے گی اور یہ کسی پرشور وشغب مداخلت کے ذریعہ نہیں بلکہ جس قدر رفاہ عامہ کا کام کرنیوالی جماعتیں اسوقت قوم میں موجود ہیں، اور چھوٹے یا بڑے پیمانے پر مفید کام کر رہی ہیں، یہ اُن سب کی معین و مددگار ہونے کی کوشش کرے گی - سیاست کے دائرہ عمل میں خلافت نے اپنے اغراض و مقاصد کی فہرست میں سوراج کو ہمیشہ سب سے مقدم رکھا ہے - یہ اب بھی سب سے مقدم ہی رہے گا - لیکن اس وقت تک سربرآوردہ مسلمانان ہند جو سر سید احمد خاں کے مسلک سے الگ ہو گئے تھے - اپنا سیاسی مستقبل انڈین نیشنل کانگریس کے حوالے کر چکے تھے - جو مہاتما جی کے آنے پر سب سے پہلی مرتبہ صحیح معنے میں ہندوستانی اور قومی جماعت ہو گئی تھی - مگر ہوا یہ ہے کہ حال میں بعض ہندو اکابرین کی سرگرمیوں کی بدولت ہندو ذہنیت میں ایک [illegible] عظیم پیدا ہو گیا ہے - کیونکہ جب مہاتما گاندھی نے بلا امتیاز تمام

قوموں کی عنان رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ تو یہ سپاہ سالار بلا فوج کے رہ گئے۔
جب مہاتما جی اور دوسرے سربرآوردہ کارکن تحریک عدم تعاون کے دور میں جیل میں
تھے تو ان ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کی نہایت ہی تاریک تصویر کھینچنی شروع کی
اور یہ کہہ کہہ کر کہ " یہ ہیں وہ موذی مسلمان جن کے ساتھ مہاتما جی چاہتے ہیں
کہ تم ملکر کام کرو،، ہندوؤں کو مہاتما جی سے بھی برگشتہ کر دیا۔ جب وہ عام
ہندوؤں کو برافروختہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اسی نمونہ کے مسلمانوں نے بھی
وہی کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ اور وہ اتنے ہی تاریک رنگوں میں ہندوؤں کو پیش
کرنے لگے کہ ایسے ہیں یہ موذی ہندو جن کے ساتھ علی برادران اور دوسرے رہنمایان
خلافت تمہیں اتحاد کرنے کو کہتے ہیں "!

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو قوم میں مہاتما جی کا اور مسلمانوں میں خلافت کے
لیڈروں کا نفوذ و اثر روز بروز کم ہوتا چلا گیا۔ اس سے نہ ہندوؤں کا کچھ فائدہ
ہوا۔ نہ مسلمانوں کو کچھ حاصل ہوا۔ البتہ ایک تیسری ہستی تھی جو جی بھر کر ان حالات سے
محظوظ ہوئی۔ ہاں خلافت کے لیڈروں کے حق میں اتنا ضرور کہنا پڑیگا کہ انہوں
نے تقریباً بلا استثناء اپنی سپاہ کے ہر باغی کو نہایت صاف اور غیر مبہم الفاظ میں بُرا
کہا۔ جب کبھی ہندو مسلم مجادلوں میں کسی مسلمان کی طرف سے زیادتی دیکھی تو انہوں نے
بار بار اظہار بیزاری کیا اور غیر ہر دل عزیز ہو جانے کا خیال ذرا مانع نہیں آیا، جو
ان حالات میں ان کے لئے ایک یقینی چیز تھی۔

بجز مہاتما گاندھی کے اس ذکر کے جو انہوں نے آریہ سماج کے متعلق
ہندو مسلم کشیدگی کے سلسلہ میں اپنے جو ہو والے مضمون میں کہا تھا۔ اور مسز سروجنی

نائیڈو کے اس اظہار نفرت کے جو انہوں نے گزشتہ موسم سرما میں پنجاب کے اندر فرقہ وارانہ جھگڑوں پر کیا تھا، ابتک کسی ہندو لیڈر نے یہ جرأت نہیں کی ہے کہ ہندوؤں کے اندر جو لوگ مذہبی دیوانے ہیں انہیں برا کہہ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف اگرچہ مسلمان مذہبی دیوانے اپنی فرقہ وارانہ انجمنوں کو نہ دوبارہ زندہ کر سکے۔ مگر دوسری طرف ہندو مذہبی دیوانوں نے اپنی ہندو سبھاؤں اور سنگٹھن اور شدھی کی تحریکوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اور ہندو قوم کی ذہنیت کو اس حد تک بدل دیا ہے جس کا کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

مسلمان لیڈروں نے بار بار اس کا اعلان کیا ہے کہ ہندوؤں کی زیادتیوں پر کچھ برا کہنا ان کے لئے نہ مناسب ہے اور نہ مفید، اس لئے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جسے خود ہندو لیڈر ہی بہتر طریقہ پر طے کر سکتے ہیں۔ اور مسلمان لیڈروں کے اس معاملہ میں دخل دینے سے ممکن ہے کہ غلط فہمیاں پیدا ہوں اور ہندو ان افعال کے کرنے پر اور مصر ہو جائیں، جنہیں برا کہا گیا ہے لیکن ہندو لیڈر ان زیادتیوں پر انکو برا کہنے سے قاصر رہے بلکہ برعکس اس کے ان میں سے بعضوں نے ایسا لہجہ اختیار کرنا اور ایسے خیالات کا پھیلانا شروع کیا جن سے وہ شعلے بھڑک اٹھے، لہذا خلافت کمیٹی ان حرکتوں کی بنا پر ان ہندو لیڈروں سے جو ابتک محفوظ رہے ہیں یہ دریافت کرنے پر مجبور ہوئی ہے کہ وہ ان ہندو مجنونوں کو برا کہنے کے متعلق اور ان حرکتوں کے روکنے کے لئے کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ان ہندو لیڈروں سے جو جواب ملیگا اسکے مطابق خلافت کمیٹی مسلمانوں کو ہدایت کریگی کہ وہ اپنی آئندہ سیاسی پالیسی کسطرح بنائیں چنانچہ اس مسئلہ پر غور و بحث کرنے اور آخری تصفیہ کے لئے خلافت کانفرنس کا ایک خاص اجلاس دہلی میں بتاریخ ۷۔۸۔ مئی بروز جمعہ و شنبہ

طلب کیا گیا ہے۔ یہ اطلاع بہت دیر میں دی جا رہی ہے لیکن چونکہ ۱۰ مئی کو یا اسکے قریب خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے وفود موتمر اسلامی میں شرکت کے لئے حجاز روانہ ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس سے زیادہ اطلاع دینی ممکن بھی نہ تھی۔ پھر بھی امید ہے کہ ہر صوبے سے مندوبین کثیر تعداد میں آئیں گے اور اجتماع مختلف صوبوں کی نمائندگی کے اعتبار سے بہت کامیاب رہیگا۔ اکثر مسلمان خلافت کمیٹی کو اس بنا پر پہلے ہی برا بھلا کہہ چکے ہیں کہ اس نے ہندوستان کے تبدیل شدہ سیاسی حالات کا لحاظ نہیں کیا لہذا اب اس سے زیادہ تاخیر ضروری مگر دشوار صبر کا اظہار نہ ہوگا۔ بلکہ یہ فرائض کی ادائیگی میں ایک مجرمانہ غفلت ہوگی۔

مجھے یہ امید ضرور ہے کہ ہندو لیڈر غور و فکر کے بعد یا ہمارے حال کے نیا دلہ خیالات کے بعد اس معاملہ میں اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہیں گے لیکن بہر کیف ہمیں وہ فرض ادا کرنا ہے جو مسلمانوں کی جانب سے ہم پر ہے یہ میرا اعتقاد بھی ہے اور میری دعا بھی کہ ہم دونوں ملکر دفتری حکومت کا مقابلہ کریں گے۔ جو ہماری فوج کی ہر تقسیم و تفریق سے اپنی طاقت کو بڑھا رہی ہے۔ خواہ کسی قسم کے حالات بھی رونما ہوں مسلمان اس محاذ جنگ کی جانب سے تغافل نہیں برت سکتے۔ جس پر ابتک کلیتہً انکی تمام توجہ مرکوز رہی ہے ہندو خواہ کچھ بھی کریں یا کچھ بھی نہ کریں اسکا اثر ہمارے احساسات اور افعال پر جہاں تک غیر ملکی دفتری حکومت کا تعلق ہے کچھ نہ پڑے گا لیکن جس چیز سے زمین اور آسمان کا فرق پڑ جائیگا وہ یہ ہے کہ آیا ہمارے ہندو بھائی اس محاذ پر ہمارے دوش بدوش کھڑے ہو کر لڑیں گے، یا ہمیں اس بات پر مجبور کریں گے کہ ہم ادھر بھی اپنی لڑائی جاری رکھیں اور اس مصیبت میں بھی پڑیں کہ اپنے عقب کی ہندوؤں کے حملوں سے حفاظت کریں مسلمانوں کی جانب سے

بھی ہم پر ایک فرض عاید ہے۔ اور ہندوستان کی جانب سے بھی ہیں یہ دونوں فرائض ادا کرنے چاہیئے۔ لیکن اگر ہم مسلمانوں کے فوائد کو غیر محفوظ چھوڑ دیں اور ہندو سبھا کے مجنونوں کو یہ اجازت دیدیں کہ وہ وطن میں اور زیادہ فسادات پھیلائیں تو ہمارا وہ فرض بھی ادا نہیں ہوسکتا جو ہندوستان کی جانب سے ہم پر عاید ہے۔ دفتری حکومت کے ساتھ ہماری لڑائی درحقیقت ایک ایسی لڑائی ہے گویا ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔ ہمیں اپنے راستہ میں خباثت نفس کو حائل نہونے دینا چاہیئے لیکن اپنے ہی ہموطنوں کے خلاف جنگ تو اس درجہ المناک چیز ہے کہ اسکا خیال تک نہیں کیا جاسکتا اور ہم اس قسم کے تمام امکانات کو جس قدر جلد ممکن ہو اپنے دل سے نکال دینے کے متمنی ہیں۔ مجھے بھروسہ ہے کہ ہمارے ہندو رفقا اس قسم کے غم انگیز امکانات کو دلوں سے دور کرنے میں بلا ایک لمحہ کے توقف کے ہماری مدد کریں گے جس خلافت کانفرنس کو اب مدعو کیا گیا ہے وہ یقیناً ایک تاریخی وقوعہ ہوگی اور مجھے سچے دل سے اعتماد ہے کہ وہ ایک ایسے دور امن وخوشدلی کا آغاز کرے گی جو اس دور پر بھی سبقت لیجائیگا جو ۱۹۱۹ء کے ختم کے قریب امرتسر کی خلافت کانفرنس نے شروع کیا تھا اور ایک ایسے زمانہ کی ابتدا ہرگز نہ کرے گی جو اس موجودہ زمانہ سے بھی جھگڑے اور تکرار میں بڑھ جائے اگر ضرورت ہو تو مسلمانوں کو اپنے ایمان اور اپنی عزت کے سوا ہر چیز دوستی اور رفاقت کے ناقابل انکار مطالبات کے نذر کردینی چاہیئے۔ مگر قوت یا اظہار قوت کے حوالے وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ انہیں بھڑکا کر غضبناک کردینا آسان ہے۔ مگر انہیں پھر قابو میں لانا امر دشوار ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے سر عبدالرحیم اور سر میاں محمد شفیع کی طرح حلقہ کانگریس میں بھی ہندو لبرل اور ہندو انڈی پنڈنٹ اصحاب کے علاوہ اب بہت سے ہندو لیڈروں نے سوراج کا خیال چھوڑ دیا۔

ہے۔ اور صرف عہدوں کے لقمہ ہائے تر کے لئے جھگڑنے کے خواہشمند ہیں۔

انہیں اس دن کا ڈر ہے جبکہ جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں ہندوستان میں انہیں ہندوستان کے مسلمانوں سے بچانے کے لئے جنکی تعداد ہندوؤں کی تعداد کی ایک تہائی ہے، برطانوی دفتری حکومت اور برطانوی سنگینیں موجود نہ ہوں گی۔ نیز ان مسلمانوں سے بھی انہیں خطرہ ہے جو سرحد پار بستے ہیں۔ حالانکہ انکی تعداد اور بھی کم ہے۔ پس یہ لوگ برطانوی حکومت کو ایک مستقل چیز سمجھتے ہیں جو بغیر کسی عالمگیر انتشار کے، جیسا کہ گزشتہ جنگ عمومی تھی ہل نہیں سکتی

اس اثنا میں جو کچھ ان کی خواہش ہے وہ یہ کہ اس غیر ملکی حکومت کے خوان نعمت سے جو ٹکڑے گریں، ان پر پورا پورا قبضہ رہے۔ اور حتی الامکان مسلمانوںکا اس میں کچھ حصہ نہ ہو۔ پھر یہ لوگ تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ غیر ملکی حکومت خود اپنے وجود کی خاطر کسی فرقہ کو کلی طور پر فنا نہ ہونے دیگی قبل اس کے کہ کوئی فرقہ فنا ہو ان کی یہ دلی خواہش ہے کہ مہاتما گاندھی کے اس بہت ہی اہم مقولہ کو غلط ثابت کر دکھائیں کہ ہندو بزدل ہوتے ہیں اور مسلمان لڑاکا۔ ان دونوں صورتوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے صداقت کا رحل کہا جا سکے اور جس میں بجز سچائی اور صداقت کے اور کچھ نہ ہو۔

بہرحال ہندو عوام الناس کو اسوقت متعصب ہندو لیڈران ترغیب دے رہے ہیں کہ ہندو جس قدر لڑاکا بن سکتے ہیں بنیں۔ اور کلکتہ میں جو کچھ زیادتیاں کی گئی ہیں انہیں اس قابل سمجھا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دی جائے۔

خلافت کانفرنس کو مسلمانوں کو قابو میں رکھنا پڑے گا تاکہ وہ متعصب ہندوؤں

کی نقل و حرکت کی نقل نہ کرنے لگیں ۔ لیکن وہ مسلمانوں کو بزدل بنانے کی خواہش نہیں کر سکتی ۔ اور اگر وہ ایسا کرنا چاہے بھی تو اس میں کامیاب نہ ہو گی ۔



یوپی کی پولٹیکل کانفرنس

(ہمدرد - ۱ - ۲ - دسمبر ۱۹۲۶ء)

اس مضمون میں اگرچہ بعض غیر متعلق باتیں بھی ہیں، لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے قابل مطالعہ ہیں۔ اور کانفرنس کے سلسلہ میں جو بیان ہے وہ اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے خاص چیز ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ محمد علی کس ماحول میں تھے، اور پھر بھی کیا کرتے رہتے تھے۔

مؤلف

عجیب اتفاق تھا کہ ماہ نومبر کی آخری تاریخوں میں کئی طرف سے میرے لئے بلاوا آیا، اور میں سخت کشمکش میں مبتلا ہوگیا کہ کہاں جاؤں اور کہاں نہ جاؤں۔ صوبجات متحدہ میں سہارنپور کے ضلع نے خلافت کی تحریک میں جو حصہ لیا تھا۔ اس سے اچھی طرح ثابت ہوگیا تھا کہ یہاں کے مسلمان کیسے پرجوش، جفاکش، اور ایثار کرنے والے ہیں اور گو سہارنپور، دہلی سے

کچھ دور نہیں، لیکن یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے کہ مجھ جیسا سارے ہندوستان میں گھومنے والا آجتک سہارنپور نہیں گیا۔ گو مرحومہ "بی اماں" اور میری اہلیہ ہمارے قید کے زمانے میں اس ضلع کے گوشہ گوشہ میں گھوم چکی تھیں۔ اور خلافت کے لئے بہت سا روپیہ اور منوں چاندی کا زیور جمع کر چکی تھیں۔

سنہ ۱۹۲۴ء کے محرم میں، سہارنپور کے فسادات نے، مسلمانوں کو جس قدر تباہ و پریشان کر ڈالا، اسکا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس سے قبل کے جوش کا آج کی افسردگی سے مقابلہ کرکے دیکھتے ہیں۔ جو لوگ باجے گاجے، اور علموں کی اونچائی نیچائی پر مسلمانوں کو لڑنے مرنے پر تیار کراتے ہیں۔ گو وہ خود اکثر اس میدان میں قدم رکھنے کے لئے تیار بھی نہیں ہوا کرتے۔ اور اس میں اسوقت قدم رکھتے ہیں جب ان کی لیڈری کے فریب خوردہ مسلمان جیلوں میں ٹھونس دئے جاتے ہیں اور کوئی انکی ضمانت تک نہیں کرتا، نہ ان کے مقدموں کی پیروی کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ اور اسوقت بھی بجائے انکی واجبی مدد کرنے کے، دوسروں ہی کو مدد کو کہتے ہیں۔ اور جب وہ قاصر ہوتے ہیں تو ان پر لعن طعن کرتے ہیں۔ انکو اسکی کیا پرواہ ہے کہ سہارنپور کے مسلمان سنہ ۱۹۲۳ء کے فسادات کے باعث کس قدر تباہ و برباد ہو گئے۔

ہم سے جو اس امت مرحومہ کی تنظیم کی فکر میں گھلے جاتے ہیں کوئی ہم سے پوچھے کہ سہارنپور جیسے پرجوش ضلع کے مسلمانوں کی اس افسردگی سے اس امت مرحومہ کو کتنا نقصان پہنچا۔ میری اہلیہ نے سہارنپور، مظفرنگر، اور بجنور کے اضلاع کے ہمت افزا دوروں کا گزشتہ چار پانچ سال میں نہ ذکر کیا ہوگا تو پندرہ بیس بار ذکر کیا ہوگا۔ اور ہر بار میرے دل پر اس زمانے کے جوش و ایثار کا خیال کرکے اور اسکا مقابلہ آجکل کی

افسردگی سے کر کے ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ اور میں سوچا کرتا تھا کہ کیا ان اضلاع میں جہاں گنگوہ، اور دیو بند واقع ہیں، جنکی بدولت ہمارے خزاں دیدہ چمن میں بھی ایک بہار سی نظر آنے لگی تھی۔ اب ہمیشہ افسردگی ہی افسردگی رہیگی؟ حال ہی میں میرے پاس مولانا سید طفیل احمد صاحب ایم۔ ایل۔ سی۔ کا دعوت نامہ پہنچا۔ کہ منگلور میں مسلمانوں کا ایک اجتماع ہونیوالا ہے وہ تم کو بھی بلاتے ہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب صدر جلسہ ہوں گے، تم بھی شریک ہو۔

مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی جانشین حضرت شیخ الہند مرحوم اور مولانا سید طفیل احمد صاحب سابق سب رجسٹرار کا اجتماع نہایت ہمت افزا تھا۔ ایک سچا فاؤنسٹ مسلمان کیا کچھ کر سکتا ہے اسکا اندازہ میرے محبس کراچی کے رفیق مولانا حسین احمد صاحب کی گزشتہ چند ماہ کی کارگزاریوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ آپنے سلہٹ میں چند سال قیام فرمایا تھا تو بنگال اور آسام کے ان حصوں میں جو سلہٹ سے متصل تھے پھر قومی اور ملی تحریک کی ایک لہر سی پیدا کر دی تھی۔ اب پھر اپنے اُستاد اور پیر کی قیام گاہ میں آپکو رونق افروز ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے لیکن اتنے ہی عرصہ میں آس پاس کے ضلعوں میں آپنے اس حکومت پرستی کے پرخچے اڑا دئے تھے جسے حکومت کے گرگوں اور مسلمانوں کے گمراہ کرنیوالوں نے ایک عرصہ سے پھر یہاں پھیلانا شروع کر دیا تھا۔

دہرہ دون اور سہارنپور میں مولانا کی دل سے نکلی ہوئی، اور دل میں گھر کرنیوالی تقریروں نے ان لوگوں کے جادو کو ہرگز نہ چلنے دیا۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بھی جو نام نہاد مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ کی تعلیم کے سوا بظاہر ہر چیز میں دلچسپی لیتے پھرتے ہیں۔ سہارنپور سے خاسر اور نامراد ہو کر واپس ہوئے تھے۔ الحمد للہ کہ طفیل احمد صاحب

بھی ہمارے ہم خیال ہو گئے تھے۔ میں ہمیشہ سے سید صاحب کی محنت، دیدہ ریزی اور خاموشی کے ساتھ کام کرنیکا قائل تھا۔ لیکن افسوس کیا کرتا تھا کہ وہ سیاست ملّی میں ایک غلط راستہ پر پڑ گئے تھے۔ اب جبکہ وہ بھی ہمارے رفیق سفر تھے اور مجھے منگلور مدعو فرمارہے تھے میں کس طرح اس دعوت کو رد کرسکتا تھا۔ لیکن اپنی منجھلی لڑکی کی علالت کی وجہ سے مجھے ایک ماہ شملہ پر گزارنا پڑا تھا۔ اور اسکے علاوہ بھی وسط اگست سے بار بار شملہ جانا پڑا تھا۔ اور دوسرے دور دراز سفر بھی کرنے پڑے تھے حقیقتاً وسط جولائی سے ہی سے سفر شروع ہوگیا تھا۔ اور اس سے پہلے بھی وسط مئی سے وسط جون تک سفر ہی سفر رہا تھا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ "ہمدرد" کا تو ذکر ہی کیا ہے صوبہ دہلی کی خلافت کمیٹی کا بھی کوئی کام نہ کرسکا تھا۔ سالانہ انتخابات اب تک نہیں ہوئے تھے۔ نہ سال نو کے لئے دہلی کے مسلمانوں کو خلافت کا ممبر ہی بناسکا تھا۔

شملہ سے آتے ہی انتخابات کے لئے ۲ دسمبر کی تاریخ مقرر کی تھی حالانکہ ستمبر ہی میں یہ سب کچھ ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے ۲۵ نومبر کو جامع مسجد دہلی میں تقریر کرکے سال نو کے لئے ممبر بنانا تھے۔ وہ تاریخ یوں گئی ۲۶ کو ایک عزیز دوست کی صاحبزادی کے نکاح میں معہ اہل و عیال شرکت کا وعدہ کرچکا تھا۔ ۲۷ کو یہاں جمعیت خلافت کی مجلس عاملہ کا جلسہ تھا۔ ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ کو علی گڑھ میں صوبجات متحدہ کی پولیٹکل کانفرنس تھی۔ بادل ناخواستہ منگلور کی دعوت کو رد کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ انہیں تاریخوں میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تھا۔ مجبوراً اسکی دعوت کو بھی رد کرنا پڑا۔

انہیں تاریخوں میں پارلیمنٹ میں آئینی کمیشن پر "مباحثہ" ہونیوالا تھا۔

"ہمدرد" کے لئے خود اپنے قلم سے اس پر کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ اگر خود نہ بھی لکھتا۔ اور کسی سب ایڈیٹر کو اپنے خیالات سے مطلع کرا کے کچھ لکھوا ہی دیتا تو شاید کام چل جاتا۔ مگر میرے سفر کے ایام میں ایک سب ایڈیٹر کو جنہیں ایک ضروری خانگی کام کے لئے گھر جانا ضروری تھا۔ یہاں میں نے قید کر دیا تھا۔ میری شملہ سے واپسی پر اس غریب کو رہائی نصیب ہوئی۔ اب جو سب ایڈیٹر وغیرہ یہاں تھے ان پر اتنا بوجھ آ پڑا تھا کہ وہ تنہا اسے نہ اُٹھا سکتے تھے۔ مجبوراً یہ کیا کہ دن بھر اور کام کر کے رات کو "ہمدرد" کے لئے مضمون لکھنے بیٹھا۔

کیا قارئین کرام اس انسان کے دماغ کی حالت کا اندازہ فرما سکتے ہیں جو قہوہ پی پی کر رات کو جاگے اور صبح کے ساڑھے تین بجے اپنا مضمون ختم کر کے سونے کے لئے جائے اور پھر علی الصباح اُٹھکر سفر کے لئے بستر باندھے اور یہاں سے روانہ ہو؟

دوسری شب کو اپنے عزیز دوست کی صاحبزادی کے نکاح میں شریک ہوا۔ ایک بجے کے بعد فراغت ہوئی۔ دوسرے دن دہلی آیا۔ اعلیحضرت بادشاہ ملک خداداد افغانستان کے استقبال کے سلسلہ میں کام کیا۔ جمعیت خلافت کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہوا۔ اور رات کو گھر آیا۔ ابتک پارلمنٹ کے "مباحثہ" میں جو تقریریں ہوئی تھیں ان کو نہ پڑھ سکا تھا۔ ان کا ایک ایک حرف پڑھا۔ اور جب اس خرافات کو ختم کر چکا تو معلوم ہوا کہ گھڑی میں ایک بج چکا تھا۔ اور اب دماغ بھی "گڈ نائٹ" کہہ کر رخصت ہو رہا ہے۔ مجبوراً پلنگ پر لیٹ رہا۔ صبح کے ۶ بجے اُٹھا۔ اور جانے سے پیشتر "ہمدرد" کے لئے مضمون لکھا۔ جب وہ ختم ہوا کہ نو ۹

بج چکے ہیں۔ گاڑی سوا نو بجے چھوٹتی تھی۔ کپڑے بدلے اور بلا ناشتہ کئے ہوئے تانگہ
دوڑاتا ہوا اسٹیشن پر پہنچا۔ اسٹیشن کی گھڑی نے کہا کہ ٹرین نو پانچ منٹ ہوئے
چل بھی دی۔ مگر اس مایوس کن اطلاع پر بھی افتاں خیزاں سب سے آخری پلیٹ فارم
پر پہنچا تو گاڑی ابھی موجود تھی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ ٹکٹ منگوایا اور علیگڈھ کو روانہ
ہوا۔ خورجہ کے اسٹیشن پر اہل و عیال کو ساتھ لیا۔ آمنہ مرحومہ کی قبر پر جاکر ان کو بھی
فاتحہ پڑھنا تھی۔ علیگڈھ پہنچکر ایک موٹر منگائی تاکہ جلد فاتحہ سے فارغ ہوکر صوبجات
متحدہ کی پولیٹیکل کانفرنس میں شریک ہوں۔

حاجی موسیٰ خاں صاحب کی طرف سے ڈاکٹر انصاری شعیب قریشی صاحب اور
عبدالرحمن صدیقی صاحب کے ساتھ ہم سب کی بھی دعوت تھی۔ مگر ہم نے وقت بچانے
کے خیال سے اسٹیشن ہی سے کچھ خرید کر کھا لیا۔ اور قبرستان گئے زندوں کے لئے نہ
معلوم اب علیگڈھ کی نام نہاد مسلم یونیورسٹی کیا کرتی ہے؟ مگر مردوں کے لئے تو بظاہر
اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔

قبرستان منٹو سرکل کے قریب ہی ہے اور مرحوم سرفراز خاں کے بنگلہ "سرفراز منزل"
کے پاس سے راستہ مڑتا ہے مگر سڑک ابتک تیار نہیں کی گئی ہے۔ ریت اور خاک اور
گڑھوں میں سے جس طرح ہو سکا موٹر کو نکال کر قبرستان پہنچا۔ وہاں کی زمین اسقدر
بنجر واقع ہوئی ہے کہ کوئی درخت نہیں اُگتا۔ ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ نظر آتا ہے
اور چونکہ بارش کے موسم میں پانی سب طرف بھر جاتا ہے اور کیچڑ کی وجہ سے قدم
یا تو زمین پر جم ہی نہیں سکتا یا اس قدر پھسلتا ہے یا جم جاتا ہے کہ پھر اُٹھانا ناممکن
ہو جاتا ہے۔ مانسون کے آتے ہی مردوں تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اور

انہیں دور ہی سے سلام ہوتا ہے۔

خیر اب تو موسم سرما شروع ہو گیا تھا۔ "السلام علیکم یا اصحاب القبور" کہتے ہوئے ہم لوگ بڑھے۔ ان کے لئے دعا مانگی۔ قرآن کریم کے چند رکوع پڑھ کر بخشے اور ان سے پھر چند ماہ کے لئے رخصت ہوئے۔ یہ دیکھ کر کسی قدر اطمینان ہوا کہ جس یونیورسٹی میں پروفیسروں پر ہر مہینے ہزاروں روپیہ صرف ہوا کرتے ہیں اب اسکے مردوں کے لئے بھی ایک شخص بطور ملازم قبرستان رکھا گیا ہے۔ اس سے عرض کیا گیا کہ اگر ہو سکے تو ایک مولسری کا درخت ہماری دور افتادہ آمنہ مرحومہ کی قبر پر بھی لگا دے۔ اور اگر مٹی بدلنے پر بھی نہ اُگ سکے تو ببول ہی کا درخت لگا دے تاکہ اسی کا سایہ اسکی قبر پر ہو سکے اور ہم کہہ سکیں گے ؎

جنوں پسند، ہوا ہے ہمیں ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد، زرد پھولوں کی

میری اہلیہ کی طبیعت پر تو اس فاتحہ خوانی کا اس قدر اثر ہوتا ہے کہ وہ پھر کسی سے بات کرنے کے قابل بھی نہیں رہتیں، گو میں خود اب سخت سنگدل ہو گیا ہوں انہوں نے کہا کہ مجھ سے اب کہیں نہ جایا جائیگا۔ مجھے اسٹیشن ہی بھیجدو، تاہم اسی بہانہ سے کہ کم از کم مجھے تو جلسہ گاہ میں آپ چھوڑ آیئے، پھر موٹر میں چلے جائیگا۔ میں مع ان کے اور اپنے لڑکی کے جلسہ گاہ آیا۔

جو باتیں وہاں پہونچکر سننے میں آئیں انہوں نے قلب کو اور بھی مضمحل کر دیا معلوم ہوا کہ ابھی تک سبجکٹ کمیٹی ہی میں بحث ہو رہی ہے، جلسہ ساڑھے بارہ بجے سے شروع ہونیوالا تھا۔ مگر سبجکٹ کمیٹی ہی میں اتنا وقت گزر جانے کے باعث، اب

جلسہ ڈھائی بجے منعقد ہوگا۔ ملک و مِلّت کی جو حالت ہو رہی ہے اس کے باعث اپنے ذاتی غم میں ایک آنسو بھی گرانا اب حرام ہو گیا ہے بقول غالب

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں اس صوبہ کا نام "صوبجات متحدہ" رکھا گیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اس سے زیادہ "صوبجات غیر متحدہ" کے نام کا کوئی صوبہ بھی پنجاب کے سوا مستحق نہ ہوگا۔

جب سبجکٹ کمیٹی کی کارروائی کا حال سنا تو سوچنے لگا کہ آمنہ مرحومہ کے لئے روؤں یا اپنے صوبہ کا غم کروں؟ یہ جلسہ صوبہ کی ہندو سبھا یا مسلم لیگ کا نہ تھا۔ کانگریس کا جلسہ تھا، اگر یہاں بھی باوجود آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ ہائے منعقدہ بمبئی و کلکتہ ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں اسقدر شدید اختلافات موجود ہیں اور حکومتہائے برطانیہ و ہند نے، ہندو مسلمان دونوں کی جس طرح تذلیل کی ہے اسکے بعد بھی خود صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں ہندو مسلمان اسطرح ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں تو پھر اس ملک میں امن و امان کب قایم ہوگا؟ اتفاق و اتحاد کیسے ہوگا؟ اور اس ملک والوں کو آزادی کس طرح نصیب ہوگی؟

جلسہ گاہ سے حاجی موسیٰ خاں صاحب کے مکان پر آیا جہاں ڈاکٹر صاحب اور شعیب قریشی صاحب نہایت افسردہ دل بیٹھے ہوئے تھے۔ چار ہفتوں میں منعقد ہونیوالے کانگریس کے صدر کے دل کو خاک اطمینان ہوگا۔ جب اسکا اپنا صوبہ اسطرح میدان کارزار بنا ہوا ہے کہ وہ خود سبجکٹ کمیٹی کے جلسے کے بعد اس قابل نہیں رہا کہ جلسہ گاہ تک جا سکے،

اور جلسہ میں شریک ہو سکے،

صوبہ کی کانفرنس میں پیش ہونے کے لئے سجکٹ کمیٹی نے وہ ریز ولیوشن تو بخوشی منظور کر لیا تھا، جسے بمبئی والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ نے منظور کیا تھا۔ اور جس میں دہلی کی تجاویز شامل تھیں، گو بعض ہندو سبھائیوں کو اس میں بھی تامل تھا۔ اور سنا گیا ہے کہ مولنا حسرت موہانی بھی صوبہ کے مسلم لیگ میں ان تجاویز کو منظور کرانے کے بعد اب پھر کسی قدر متامل تھے۔ اور جس شکل میں ریز ولیوشن پیش ہونیوالا تھا اسکے آخر میں بھی "اصول سے اتفاق ہے"، کی بحیر لگا دی تھی جس سے اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید اسکے حقیقی اصول سے اتفاق نہ ہو۔ جو یہ ہے کہ اگر ہندو پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں تو مسلمان بھی باقی دس صوبوں میں غیر مسلم اکثریت پر اعتماد کرنیکو آمادہ ہیں۔ بظاہر "اصول سے اتفاق ہے"، کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں، جو ہندو مہا سبھا والوں نے بھی لئے تھے، کہ مخلوط انتخاب سے اتفاق ہے اور صوبجات سرحد و بلوچستان کو اصلاحات دئے جانے اور بالخصوص سندھ کے بمبئی سے علیحدہ کئے جانے سے اتفاق نہیں۔ خیر یہ بمبئی والے ریز ولیوشن کا حال تھا۔

لیکن جونہی کلکتہ والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کے ریز ولیوشن کا وقت آیا۔ صاف معلوم ہونے لگا کہ اکثریت کی ذہنیت بالکل ہندو مہا سبھائی ہے، اور اب تو بے اصولی اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ جن الفاظ میں کلکتہ کے ریز ولیوشن کے اصول سے اتفاق کیا گیا وہ بدیہی اور بین اختلاف تھا۔ وہ الفاظ اسی قسم کے تھے کہ "اصول سے اتفاق ہے مگر مقامی دستور اور احساسات کا لحاظ رکھا جائے"، حالانکہ کلکتہ کے ریز ولیوشن میں ہنود کے احساسات کا جس قدر لحاظ رکھنا ممکن تھا رکھا گیا تھا۔ مگر مقامی

دستور،، کی غلامی سے پوری پوری آزادی حاصل کی گئی تھی اب یہ ہندو کانگریس والوں کی اکثریت باوجود آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلے کے پھر "مقامی دستور،، کا طوق غلامی ہماری گردن میں ڈال رہی تھی۔ اور لطف یہ ہے کہ باوجود شدید اختلاف کے ان "اصول سے اتفاق" والوں نے اس بے اصولی پر بھی اصرار کیا تھا کہ جو ریزولیوشن محض اکثریت سے سبجکٹ کمیٹی میں منظور ہوا تھا۔ اسے صاحب صدر پیش فرمائیں۔ اور اس لغویت کے لئے برہان قاطع کیا ظاہر فرمائی گئی؟ یہی کہ اس طرح اختلاف ظاہر ہوگا نپولین بھی دنیا سے اختلاف مٹانا چاہتا تھا۔ اور اسکی اس نے یہ ترکیب سوچی تھی کہ ساری دنیا کا خود بادشاہ بن بیٹھے۔ پھر اختلاف کون کرے گا! جبتک پنجاب اور بہار سی پی اور یوپی کی ہندو اکثریت کے اکثر افراد کی یہی ذہنیت ہے، ہندو مسلم اتحاد کس طرح ہوگا؟ اور یہ ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد کیونکر ہوگا؟

میں نے پنڈت مدن موہن مالوی کے دونوں مضامین پڑھ ڈالے لیکن میرے دل پر ان کے ایک حرف کا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس لئے کہ گو انہوں نے بزدلی سے بہادری کی طرف تو قدم بڑھانے پر آمادگی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور گورنمنٹ کی غلامی سے نکل کر وہ ہم "باغیوں،، میں شامل ہونا تو چاہتے ہیں (یا کم از کم ان جیسی باغیانہ باتیں کرتے ہیں) مگر ان کے ایک نقطے سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جس چیز کا مہاتما گاندھی حکومت سے مطالبہ کرتے چلے آئے ہیں یعنی دل کی تبدیلی وہ خود مالوی جی میں پیدا ہوگئی ہے۔ اور وہ مسلمانوں پر مذہبی سیاسی اور اقتصادی غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کے خیال کو چھوڑنے کے لئے بھی آمادہ ہو گئے ہیں۔

جب سبجکٹ کمیٹی نے ہندو مہا ئیت کا اسطرح ثبوت دیا تو ہم لوگوں نے طے کرلیا

کہ ہم تو آب کانفرنس میں نہ جائیں گے اور باقی ماندہ مسلمان اس لغو ریز ولیوشن کی مخالفت کرکے ووٹ دینے سے پہلے یہ کہہ کر اُٹھ آئیں گے کہ دلیل و برہان میں ہم آپ کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اسی لئے کانگریس کے ممبر بنے ہیں کہ دلیل و برہان ہی سے کام لیا جائیگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اعداد میں ہم آپ سے کہیں کم ہیں اسلئے ووٹ دینے کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں۔ آپ جس طرح چاہیں کانگریس کو چلائیں اور ارل ونٹرٹن کے دعوے کا جواب دیں کہ انگریزی پارلیمنٹ اقلیتوں کے حقوق کا محافظ ہے۔

لیکن جونہی اس فیصلہ کے بعد باقی ماندہ مسلمان جلسہ گاہ میں گئے اور جناب صدر کو معلوم ہوا کہ حسب وعدہ ہم انکی تشریف آوری کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے اور اب جلسہ میں شریک نہ ہوں گے۔ تو گوندبابھ پنتھ صاحب ایم۔ ایل۔ سی۔ حاجی موسیٰ خاں صاحب کے مکان پر تشریف لائے اور غلط فہمی کی معذرت کی اور کہا کہ خود میں تو اس ریزولیوشن کو پیش نہ کروں گا۔ اور اسوقت اسے پیش بھی نہ ہونے دونگا رات کے جلسے سے پہلے سبجکٹ کمیٹی کا ایک اور جلسہ کرا کے اکثریت کے افراد کو اس پر راضی کرونگا کہ یہ مبحث ہی خارج کر دیا جائے اور اس پر کوئی ریزولیوشن بھی پیش نہ ہو۔ اگر وہ لوگ راضی ہو گئے تو فبہا۔ ورنہ آپ حضرات اسکے بعد شریک جلسہ نہ ہوں۔ اور اس طرح اپنی بیزاری کا اظہار فرمائیں۔ ان میں سے اکثر راضی ہو گئے ہیں۔ مگر ایک صاحب ابتک اڑے ہوئے ہیں۔

اب میں ان صاحب کا کیا نام لوں۔ کو کناڈا میں یہ سری جت وبھ بھائی پٹیل۔ سری جت راجگوپال اچاریہ، اور سریجت شنکر لال بینکر سے بھی زیادہ "نو چینجر،" اور سوراجیوں کے مخالف تھے۔ اور ان کے ریزولیوشن کی جو

جو سوراجیوں کو کانگریس سے خارج نہ کرنے کے بارے میں تھا انہوں نے سخت مخالفت فرمائی تھی۔ مگر اب یہ پکے ہندو سبھائی اور مالوی جی اور ڈاکٹر مونجے جیسے جوابی تعاون والوں کے چیلے ہیں۔ اور مسلمان کیخلاف جو کانگریسی ہندو کا مقابلہ کرنے کے لئے کانگریس کی کانفرنسوں، اور کانگریس کمیٹیوں میں خم ٹھونک کر اکھاڑے میں کودا کرتے ہیں۔ اور صوبجات متحدہ کو ان سے جتنا ہو سکتا ہے غیر متحدہ بناتے ہیں۔

بہرحال ہم نے اسی کو غنیمت جانا، اور اس امید پر کہ یہاں نہ سہی مدراس ہی میں کلکتہ کا ریزولیوشن پاس ہو جائیگا۔ اور مالوی جی راہ راست پر آجائیں گے جلسہ میں شرکت کی۔

(۲)

اسوقت کسانوں کی طرف سے جناب صدر کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جارہا تھا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس زبان میں لکھا گیا تھا۔ میں سات برس تک گجرات میں رہا ہوں اور بڑودہ میں چند ماہ کی امیدواری کے بعد جو پہلا عہدہ مجھے ملا، اس کا تعلق کسانوں ہی سے تھا۔ اس لئے سر صوبہ نے جو میرے محکمہ کے افسر اعلیٰ تھے، اور جن سے مشورہ کئے بغیر مہاراجہ گائیکواڑ نے یہ محکمہ یکایک میرے سپرد فرمادیا تھا۔ بجا طور پر شرط لگادی کہ جب تک میں اتنی گجراتی نہ سیکھ لوں کہ کسانوں سے بات چیت کرسکوں، ان کی عرضیاں خود پڑھ سکوں اور دفتر کی یادداشتوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ سکوں، میرے دفتر کا محاسب جو میرے بعد اس دفتر میں سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔ ہر دفتر کی یادداشت پر میرے ساتھ ساتھ دستخط کیا کرے تاکہ اسکی تحریری شہادت موجود ہو کہ اس نے مجھے اس یادداشت کا مفہوم

اچھی طرح سمجھا دیا ہے، اور وہ خود بھی اسکے صحیح ہونیکا ذمہ دار ہے "سرصوبہ" صاحب
ممبرے کرمفرما بھی تھے۔ اور آجتک میرے ان کے تعلقات نہایت گہرے دوستوں
کے جیسے تعلقات ہیں۔ گو عمر میں میں اُن سے کم از کم بیس پچیس سال چھوٹا ہوں گا۔
وہ یقیناً میری توہین و تذلیل ہرگز نہیں چاہتے تھے، لیکن جو لوگ انتظامی امور کا
تجربہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی تنخواہ کے ماتحت کو ذمہ داری
میں شریک کر دینا بہت سی خرابیوں کے لئے فتح باب کر دیتا ہے۔ اس حقیقت سے
متاثر ہو کر میں نے گجراتی زبان جلد سے جلد سیکھنے کی اور بھی کوشش شروع کر دی
میں نے بچوں کی پہلی کتاب سے ابتداء کی تھی اور اسکے ختم کرنے سے پہلے ہی یہ ترکیب
نکالی کہ ہندوستان کی تاریخ کی ایک گجراتی کتاب پڑھنا شروع کی۔ جس کے باعث
یہ سہولت میسر آئی کہ تاریخ کا مفہوم پہلے ہی سے معلوم ہونے کی وجہ سے میں لغت
اور صرف و نحو سے اور بھی جلد واقف ہونے لگا۔ اسکے علاوہ میں نے دیہات
میں گھوم گھام کر کسانوں سے بات چیت کرنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح اس محکمہ کا
چارج لینے کے ایک دو ماہ ہی میں مجھے گفتگو کرنے میں کافی مہارت پیدا ہو گئی۔
اور دفتری کاغذات بھی خود پڑھنے اور سمجھنے لگا اور "سرصوبہ" صاحب کو مطمئن کر دیا
کہ اب محاسب کی ذمہ داری میں شرکت کی حاجت باقی نہیں رہی۔ اور اس کے دستخط
ہونا بند ہو گئے۔

گجرات کی روزمرہ گفتگو اور معمولی تحریر میں یقیناً اس سے کہیں زیادہ
سنسکرت کے الفاظ آتے ہیں۔ جتنے کہ صوبجات متحدہ کی روزمرہ اور معمولی تحریر
میں آتے ہیں۔ اور سات برس گجرات میں رہکر اور ریاست بڑودہ کے مختلف

محکموں میں کام کرکے اور خود اپنے ہاتھ سے مقدمات تک کے فیصلہ لکھنے کے بعد یقیناً میں صوبجات متحدہ کے اُن ہنود سے بھی زیادہ سنسکرت کے الفاظ سے واقف ہوں جنہوں نے سنسکرت نہیں پڑھی ہے۔ گو مذہبی اصطلاحات کی واقفیت میں ہرگز انکی برابری تک کا دعوٰی نہیں کرسکتا۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ مہاتما جی تقریر فرما رہے ہیں اور پنڈت موتی لال نہرو نے مجھ سے پوچھا ہے کہ مہاتما جی نے جو فلاں لفظ بولا اسکے کیا معنی ہیں۔ جواہر لال جی نے اپنے والد ماجد کی طرح فارسی نہیں پڑھی بلکہ سنسکرت پڑھی ہے لیکن جتنے سنسکرت کے الفاظ انکی تقریر میں آتے ہیں ان سے کہیں زیادہ سنسکرت الفاظ ہندو مسلمانوں کے جلسہ میں میری تقریر میں آجایا کرتے ہیں۔

لیکن میں سچ عرض کرتا ہوں کہ کسانوں کی طرف سے جو ایڈریس صدر پولیٹیکل کانفرنس کی خدمت میں پیش ہوا اس میں متعدد الفاظ ایسے تھے جنہیں میں بھی نہ سمجھ سکا اور یقیناً پنڈت موتی لال نہرو بھی ہرگز نہ سمجھ سکے۔

یہی حال گزشتہ سال سرجیت شو پرشاد گپتا جیسے وطن پرور اور مسلم دوست ہندو صدر پولیٹیکل کانفرنس کے خطبۂ صدارت کا تھا۔ جس کا ایک اردو رسم الخط میں چھپا ہوا نسخہ عبدالرحمٰن صدیقی صاحب جیسے گجراتی داں سے نہ پڑھا جا سکا۔ یقیناً یہ صوبجات متحدہ کے کسانوں کی تو زبان نہ تھی۔ البتہ سرجیت گووند بلبھ پنتھ صاحب نے اس اڈریس کا جو جواب دیا وہ بالکل اسی زبان میں تھا جو ڈاکٹر انصاری اور میں بھی بولتے ہیں۔ اور ہر شخص جو جلسے میں حاضر تھا اسے اچھی طرح سمجھ سکا۔

میں پوچھتا ہوں کہ اس سنسکرت نوازی سے کیا حاصل؟ بظاہر یہ بھی ہندو سبھائی

ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب بھی اتنے سنسکرت کے الفاظ اپنی تقریروں میں نہیں ٹھونسا کرتے۔ اور لالہ لاجپت رائے تو شاید ٹھونس بھی نہیں سکتے۔ یہ تو "ناگری پرچار سبھا" کا بھی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ناگری ایک رسم الخط ہے نہ کہ زبان۔

لارڈ اینٹ میکڈانیل جب صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ اسوقت مالوی جی نے اردو رسم الخط ہی پر ناگری پرچارنی سبھا کے ذریعے سے دھاوا بولا تھا۔ اور بہار کیطرح اس صوبہ میں بھی جو اردو کا گہوارہ اور اس کا مرکز تھا ناگری ہی کو دفاتر اور عدالتوں میں رائج کرانے کی انہوں نے ٹھانی تھی۔ مگر اس پر بھی سر جیمیس لاٹوش کی لفٹنٹ گورنری میں اتنا ہی ہوا کہ نستعلیق کی طرح ناگری رسم الخط میں بھی عرایض لکھنے کی عرضیاں گذارنے والوں کو اجازت مل گئی۔ مگر جو ہندو سبھائی ذہنیت اس تحریک کی روح رواں تھی اس نے متعصب ہنود کو اس پر آمادہ کر دیا کہ اپنے پاس سے تنخواہیں دیکر ناگری میں عرضیاں لکھنے والے منشی مقرر کر دیں تاکہ وہ ضعیف العمر مسلمان کلرک موقوف کر دئے جائیں جو ناگری رسم الخط سے واقفیت پیدا نہ کر سکیں، اور ہندو کلرک ہی انکی جگہ دفتر میں گھس جائیں۔ اسی ذہنیت کا ثبوت افسوس ہے کہ ڈاکٹر مراری لال صاحب جیسے صدر استقبالیہ کمیٹی نے کانپور کی کانگریس میں خطبہ دیا تھا۔ جبکہ تمام کتبے ناگری رسم الخط ہی میں تھے ایک بھی اردو میں نہ تھا۔ اور جن ایک دو مسلمان لیڈروں کی تصویریں پنڈال میں آویزاں کی گئی تھیں وہ بھی ڈائیس پر یا ڈائیس کے سامنے ستونوں پر آویزاں نہ تھیں۔ گوہاٹی میں بھی تصویروں کے متعلق یہی کارروائی کی گئی تھی۔ حالانکہ ان ہندو سبھائی لیڈروں تک کی تصاویر خوب نمایاں کی گئی تھیں جنہوں نے یا تو گوہاٹی تشریف لانے سے انکار

فرمایا دیا تھا۔ یا آئے بھی تھے تو کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کے سخت مخالف تھے، اور جنہوں نے اسی سال انتخابات میں کانگریس کے امیدواروں کی دل کھول کر مخالفت کی تھی۔ اور شمالی ہندوستان میں انہیں شکست دی تھی۔ اور اپنے تعصب اور تنگ نظری کا خوب ہی ثبوت دیا تھا۔ یہی ذہنیت علی گڑھ کی پولٹیکل کانفرنس میں نمایاں تھی سارے کتبے ناگری رسم الخط ہی میں آویزاں تھے۔ حالانکہ جو لوگ علی گڑھ کے گردونواح میں رہتے ہیں۔ اور جو لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے ان میں سے اکثر اردو رسم الخط سے، بخوبی واقف ہیں اور ان کی ایک بڑی تعداد اسی رسم الخط کا آجتک استعمال کرتی ہے میں نے زبان اور رسم الخط کے متعلق اتنی تفصیل سے صرف اس لئے لکھا ہے کہ اگر کارکنان کانگریس کی وہ ذہنیت نہیں ہے جو ظاہر ہوئی تو آیندہ وہ زیادہ احتیاط سے کام لیں اور اس میں بھی مالوی جی کا نہیں بلکہ مہاتما جی کا اتباع کریں۔

جب کسانوں کے ایڈریس کا روزمرہ کی اردو یا ہندی یعنی ہندوستانی میں جناب صدر کی طرف سے جواب دیا جا چکا تو پھر کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ سیٹھ جمنالال جی بزاز نے کھادی کے متعلق ایک مختصری تقریر فرمائی اور چونکہ انہیں پانچ بجے سے قبل ہی کی گاڑی میں روانہ ہوجانا تھا، انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں تو اب جاتا ہوں مگر امید ہے کہ محمد علی کھادی کے متعلق زیادہ تفصیل سے تقریر کریں گے۔

(۳)

اس کے بعد وہ ریزولیوشن پیش ہوا جو دہلی کی تجاویز کے متعلق تھا۔ اور جس میں بمبئی والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ریزولیوشن سے اتفاق ظاہر کیا گیا تھا۔ گو جیسا کہ میں کل عرض کرچکا ہوں آخر میں "اصول سے اتفاق ہے" کی بھی پخ خواہ مخواہ لگادی گئی تھی

مجھ سے جناب صدر نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں اسکی تائید کروں، اور میرا ارادہ تھا کہ کم از کم آدھ گھنٹہ تقریر کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو سمجھادوں کہ کلکتہ کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کے ریزولیوشن کی طرح یہ رزولیوشن بھی دونوں ملتوں کی آزادی پر مبنی تھا۔ دونوں ملتیں آزاد کردی گئی تھیں کہ اگر چاہیں تو تعصب اور تنگ نظری سے کام لیکر جہاں جہاں انہیں اکثریت حاصل ہو اقلیت کے خلاف کارروائیاں کریں اور اس پر زیادتی کریں اور اسکے ساتھ ناانصافی کریں اور جہاں جہاں ان کی اقلیت ہو اسکی مخالفت، زیادتی اور ناانصافی کا خمیازہ اٹھائیں۔ دونوں کی شرافت اور دونوں کی شرارت کا امتحان ہے۔ اگر اقلیت کے ساتھ شرافت کا برتاؤ کریں گے تو جہاں انکی اقلیت ہوگی اس کے ساتھ ہی شرافت کا برتاؤ کیا جائیگا۔ اور اقلیت کے ساتھ اگر وہ خود شرافت کا برتاؤ نہ کریں گے، شرارت کا برتاؤ کریں گے تو لامحالہ جہاں انکی اقلیت ہوگی اسکے ساتھ بھی شرارت ہی کے برتاؤ کی توقع رکھنا پڑیگی حقیقتاً دونوں ملتوں کے مچلکے لئے جارہے ہیں لیکن فرق اتنا ہے (اور یہ ایک عظیم الشان فرق ہے اور ہندوستان کی امن و امان اور ہندوستان کی آزادی کے لئے اسی فرق کی ضرورت ہے) کہ دونوں کے مچلکے ایک تیسری جماعت، ہمارے اجنبی حکمرانوں کی جماعت حسب دستور سالہا سال دفترہا فرن نہیں لے رہی ہے، بلکہ ہم خود ایک دوسرے سے مچلکے لے رہے ہیں۔ بالکل یہی کلکتہ کے رزولیوشن میں کہا گیا ہے۔ اگر ہندو باجے گاجے کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ شرافت کا برتاؤ کریں گے تو یقیناً مسلمان بھی ان کے ساتھ گائے کی قربانی اور گائے کے ذبیحہ کے معاملے میں شرافت کا برتاؤ کرینگے لیکن اگر انھوں نے مسلمانوں کے فرائض مذہبی کی ادائیگی کا لحاظ نہ کیا تو پھر ان کو

بھی مسلمانوں سے اپنے احساسات کے لحاظ کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ اور بالکل اسی طرح اگر مسلمانوں نے ہنود کے ساتھ شرارت کا برتاؤ کیا تو ان کو بھی ہنود سے سوائے شرارت کے کسی اور چیز کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔

حقیقتاً یہ مچلکے اور یہ ضمانتیں جو ہم ایک دوسرے کو دے رہے ہیں، وہ یہ مچلکے اور ضمانتیں نہیں ہیں جو ہمارے اجنبی حکمران ہم کو مجرم سمجھ کر ہم سے طلب کیا کرتے ہیں، بلکہ یہ وہی مچلکے اور ضمانتیں ہیں جنکی طرف ہر ایک مذہب کے اس سنہری قاعدے،، نے اشارہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں

اسی میں صلح و آشتی کا راز مضمر ہے، اور یہی سرّ حیات ہے جن صاحب نے اس رزولیوشن کو علی گڑھ کی کانفرنس میں پیش فرمایا ان کو غالباً اسکا علم نہ تھا کہ مجھے بھی پانچ بجے سے پہلے ہی چھوٹنے والی گاڑی میں جانا ہے۔ اس لیئے انکی تقریر غالباً آدھ گھنٹہ تک جاری رہی اور مجھے دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ مل سکے۔ لیکن اتنے وقت میں بھی میں نے چند ضروری امور کی طرف سامعین کو متوجہ کرالیا۔ اور جس طرح انہوں نے میری مختصر سی تقریر کا استقبال کیا اس سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ بحیثیت مجموعی وہ اس کے قائل ہو گئے تھے کہ ہندوستان میں صرف اسی طرح امن و امان قایم ہو سکتا ہے، اور صرف اسی طرح ہندو مسلمان سب مل کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکتے ہیں۔

معزز محرک نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ مصر میں بھی مسلمان رہتے ہیں، اور وہاں عیسائی قبطیوں کی بھی ایک جماعت ہے جو اقلیت میں ہے لیکن مصری مسلمانوں نے عیسائی قبطیوں کی اقلیت کے لیئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب قایم نہیں کیا۔ پھر ہندوستان کے مسلمان کیوں جداگانہ حلقہائے انتخاب کے اسقدر دلدادہ ہیں ؟ چین

میں بھی مسلمانوں کی ایک جماعت ہے جو اقلیت میں ہے۔ مگر وہاں کے مسلمان بھی اپنے لئے بدھ مذہب والوں، اور کنفیوشس کے ماننے والوں کی اکثریت سے جداگانہ حلقہائے انتخاب نہیں مانگتے۔ پھر ہندوستان کے مسلمان جداگانہ حلقہائے انتخاب کیوں مانگتے ہیں؟

اس کے بعد انہوں نے آجکل کے ہندو مسلمان فسادات کو جداگانہ حلقہائے انتخاب کا نتیجہ بتایا۔ (حالانکہ یہ ایک حد تک ہی صحیح ہے کہ جداگانہ حلقہائے انتخاب خود اس ہندو مسلم کشیدگی کا نتیجہ ہیں جو غدر کے بعد سے چلی آتی تھی) کشیدگی کے زمانہ میں یہ جداگانہ حلقہائے انتخاب، جس طرح تعصب، تنگدلی۔ اور فرقہ وارانہ بغض و عناد کو بڑھاتے ہیں اسکو محرک نے اچھی طرح ثابت کیا۔ آخر میں انہوں نے نہایت منصفانہ طریقہ پر فرمایا کہ اگر مدراس کے مسلمان اس بنا پر اس صوبہ میں "اصلاحات" کے نفاذ کی مخالفت نہیں کرتے کہ وہاں صرف ۷ فیصدی مسلمان ہیں اور ہنود کی اس قدر بڑی اکثریت ہے تو پھر صوبجات سرحد و بلوچستان کے ہندو اسی بنا پر کہ وہاں انکی اتنی ہی حقیر اقلیت ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اسی قدر بڑی ہے ان صوبجات میں "اصلاحات"، کے نفاذ کی کیوں مخالفت کرتے ہیں؟ سندھ کے بھی بمبئی سے علیحدہ کئے جانے پر ہنود کو چراغ پا نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ہر علاقہ کے باشندوں کو اس کا اختیار ہونا چاہئے کہ وہ کسی دوسرے علاقہ کے باشندوں کے ساتھ ایک ہی صوبہ کے ماتحت رہیں۔ یا اپنی حکومت الگ قایم کرلیں۔

میں نے اپنی تقریر کی ابتداء ہی میں عرض کردیا کہ معزز محرک نے پورے زور اور پوری تفصیل کے ساتھ اس ریزولیوشن کی تحریک فرمادی ہے اگر میں بھی تفصیل کے ساتھ اس ریزولیوشن کی تحریک پر تقریر کروں تو اول تو وقت کافی نہیں ہے دوسرے زیادہ

انہیں منازل کو طے کرنا پڑے گا جنکو معزز محرک ابھی طے فرما چکے ہیں۔ میں صرف چند منٹ تقریر کر سکتا ہوں اور ان چند منٹ میں معزز محرک کی تقریر کے ایک حصہ کے متعلق کچھ عرض کروں گا جس کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ سامعین کہیں غلط فہمی میں گرفتار نہ ہو جائیں سامعین نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ارل ونٹرٹن نائب وزیر ہند نے دارالعوام میں اسکا دعویٰ کیا ہے کہ وہی اقلیتوں کے امین ہیں۔

میں سامعین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں؟ ہنود کی طرف سے آوازیں آئیں کہ "نہیں ہم اس دعوے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے!" تب میں نے عرض کیا کہ اس ادّعا کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان خود کہیں کہ ہم تم کو اقلیت کا امین نہیں مانتے، تمہاری امانت داری پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے، یہ ونٹرٹن صاحب وہ بزرگ ہیں کہ جب ۱۹۲۰ء میں نہ صرف ۷ کروڑ مسلمانان ہند بلکہ ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں کی طرف سے انڈین خلافت ڈیلی گیشن یورپ کو گئی تھی اور انگلستان، فرانس اور اٹلی کے وزیر اعظم اور بعض دیگر وزراء، اور روم کے پاپائے اعظم سے ملاقاتیں کی تھیں تو ان بزرگ نے ہم سے ملنے تک سے انکار فرما دیا تھا۔ اسوقت مسلمانان ہند کے مذہب پر حملہ ہو رہا تھا خلافت عظمیٰ کا قلعہ قمع کیا جا رہا تھا۔ اور جزیرۃ العرب کی مقدس سرزمین پر خلاف وصیت رسول اکرمؐ کفار کے تسلط کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور کوئی مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا تھا جب تک کم از کم دل میں ان باتوں سے بیزار نہ ہو۔ اسوقت ہمارے ساتھ ان ونٹرٹن صاحب کا یہ سلوک یقیناً اس امانت میں خیانت تھا جس کا آج یہ اس بلند آہنگی سے ادّعا فرما رہے ہیں اور اسی وقت بہت سے ہندو لیڈر ہماری پر زور حمایت کر رہے تھے۔ لیکن ممکن ہے کہ آج چند گمراہ کن اور حکومت پرست مسلمان لیڈر ایسا نہیں

ونٹرٹن صاحب کو ہندو اکثریت کے مقابلہ میں مسلم اقلیت کے حقوق کا امین تسلیم کرلیں، آپ اس رزولیوشن کو منظور کرکے کہدیں گے کہ نہیں، ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کے حقوق کی امین ہے۔ لیکن آج فقط رزولیوشنوں سے کام نہیں چلتا۔ رزولیوشن تو ونٹرٹن صاحب بھی دارالعوام میں، اور برکن ہیڈ صاحب دارالخواص میں منظور کرا چکے ہیں۔ آج ضرورت قول کی نہیں ہے بلکہ فعل کی ہے۔ اور اگر قول صرف فعل ہی کا ترجمان ہوگا، تو مسلم اور اچھوت ہندو اقلیتیں دونوں خود ونٹرٹن صاحب کو جواب دیدیں گے کہ تم ہمارے حقوق کے امین نہیں ہو۔ ہندو اکثریت اور برہمن اقلیت تم سے زیادہ ہمارے حقوق کی امین بننے کی مستحق ہیں۔

معزز محرک نے مصر کی مثال دی تھی۔ مصر میں سر ایلڈن گوسٹ کے زمانے میں انگریزوں نے قبطی عیسائیوں کی اقلیت کو مسلم اکثریت کے خلاف اُبھار کر اپنے تئیں اسکے حقوق کا امین تبلایا تھا۔ لیکن کیا ہوا؟ جب سنہ ۱۹۲۰ء میں اسی طرح کا آئینی کمیشن جیسا کہ سر جان سائمن کی سرکردگی میں ہندوستان آرہا ہے لارڈ ملنر کی سرکردگی میں مصر پہنچا۔ اور لارڈ برنہم مالک "ڈیلی ٹیلیگراف" کی طرح میرے کرمفرما مسٹر اسپنڈر "ولیسٹ منسٹر گزٹ"، کے اڈیٹر ان کے ساتھ تشریف لے گئے تو ایک مصری نے بھی ان سے بات نہیں کی، نہ مسلم اکثریت والے نے، نہ قبطی اقلیت والے نے، اور ایک عیسائی نے نہیں کہا کہ لارڈ کرزن ہماری اقلیت کے حقوق کے امین ہیں۔ سب نے یہی کہا کہ جو کچھ پوچھنا ہو اسی سعد پاشا زاغلول سے پوچھو جسکو تم نے انگلستان اپنا وفد تک نہ لیجانے دیا تھا اور جسے جبل الطارق میں معہ وفد کے تم نے قید کردیا تھا۔ وہی ہماری اقلیت کے حقوق کا بھی امین ہے۔ عیسائیوں نے یہ کیوں کیا اس لئے کہ باوجود

مسلمانوں کی ۹۱½ فیصدی اکثریت اور عیسائیوں کی صرف ۸ فیصدی اقلیت کے مصر میں انکو اس اقلیت سے کہیں زیادہ عہدے دئے جاتے تھے، اور وزارتیں تک دی جاتی تھیں۔ اور مخلوط حلقہائے انتخاب سے بھی مسلمان رائے دہندگان انکا اس سے کہیں زیادہ تعداد میں مصری پارلیمنٹ کے لئے انتخاب کرتے تھے۔ اگر مالوی جی اور لالہ جی اور ڈاکٹر مونجے بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرنے لگیں تو مسلمان اقلیت بھی ہرگز گمراہ نہ ہو۔ اور ونٹرٹن صاحب اور برہمن ہیڈ صاحب۔ سر جان سائمن اور لارڈ برہنم مسٹر داش اور میجر اٹیلی کو اپنے حقوق کا امین کبھی تسلیم نہ کرے۔ بلکہ وہ بھی کہے کہ تمہیں ہمارے حقوق کی حفاظت کے متعلق جو کچھ پوچھنا ہو۔ مالوی جی۔ لالہ جی۔ اور مونجے جی سے پوچھو۔ اس پر مجھے یہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی کہ ہنود نے بھی نہایت گرمجوشی سے داد تحسین دی۔

اسکے بعد میں نے پھر اپنی تقریر جاری رکھی، اور عرض کیا کہ مصر میں تو معزز محرک نے مسلمان اکثریت اور غیر مسلم اقلیت کے تعلقات کی مثال دی تھی جس سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں غیر مسلم اقلیت کو ان پر ان کے عمدہ برتاؤ کے باعث کسقدر اعتماد ہے۔ لیکن دوسری مثال مسلم اقلیت اور غیر مسلم اکثریت کی ہے چین میں خود مسلم اقلیت جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب نہیں مانگتی کیوں؟ اس لئے کہ چین کی غیر مسلم اکثریت انکی اقلیت کا بیجا فائدہ نہیں اٹھاتی۔ جنگ عمومی میں برطانیہ ساری دنیا کو اپنا حلیف بناکر جرمنوں اور ترکوں کو شکست دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چنانچہ چین کو بھی اسی فریب میں مبتلا کرنا چاہا۔ چین کی جمہوریت کا بانی۔ اور اسکی روح و رواں سن یٹ سین، جو امریکہ کا تعلیم یافتہ عیسائی تھا۔ اسوقت برسر

حکومت تھا۔ اس نے حکومت برطانیہ سے کہدیا کہ تم نے ہمارا نیا چینی جھنڈا بھی دیکھا ہے؟ اس میں پانچ دھاریاں ہیں۔ سبز دھاری۔ ہمارے مسلمان باشندوں کی ہے تم ترکی سے لڑ رہے ہو جس کا بادشاہ ان کے رسول کا خلیفہ ہے اور امیر المومنین کی حیثیت سے ان کا مذہبی پیشوا ہے۔ اس کے خلاف تلوار اُٹھانا اور مسلمانوں کا ناحق گلا کاٹنا ان کے مذہب میں حرام ہے پھر ہم کس طرح تمہارے حلیف بن سکتے ہیں؟

ہندوستان سے تو ہندو ہی نہیں مسلمان بھی اپنا دین خراب کر کے ترکوں سے لڑنے گئے۔ اور اسوقت کسیکو خیال نہیں آیا کہ خلیفۃ الرسولؐ اور امیر المومنین کے خلاف تلوار اُٹھانا حرام ہے۔ اگر چین کی طرح ہندوستان بھی جنگ سے انکار کرتا تو ہندوستان کی مسلم اقلیت بھی، چین کی مسلم اقلیت کی طرح مخلوط حلقہ ہائے انتخاب پر قانع ہوتی اس سے پہلے بھی چینی مسلمان، وطن دوست، اور قوم پرور ثابت ہو چکے تھے۔ جب ۱۹۰۰ء میں "باکسرون" کی جنگ ہوئی اور یورپ والے بالآخر جیت گئے تو بطور تاوان جنگ جن جنگی جوانوں کے سر، دول یورپ نے مانگے ان میں اپنی اقلیت کے تناسب سے کہیں زیادہ تعداد مسلمانان چین کے سروں کی تھی۔

آپ نے دیکھ لیا کہ مصر میں مسلمان اکثریت نے غیر مسلم اقلیت کے ساتھ کیسا سلوک کر کے ان کے دلوں کو موہ لیا۔ اور چین میں غیر مسلم اکثریت کے سلوک کے باعث مسلم اقلیت نے کس طرح اپنے سر دیکر اپنی وطن پروری کا ثبوت دیا۔ نہ اکثریت میں مسلمان دشمن ثابت ہوئے نہ اقلیت میں۔ خدا کرے کہ ہندوستان میں بھی یہی حالت پیدا ہو جائے جو مصر اور چین کی حالت ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجھے کامل یقین ہے

کہ ہندوستان میں بھی مسلمان اسی طرح، وطن دوستی اور قوم پروری کا ثبوت دینگے
جس طرح کہ انہوں نے مصر و چین میں دیا ہے۔

اسی حالت کے پیدا کرنے کے لئے ہم نے دہلی میں وہ تجاویز منظور کی
تھیں جنہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی واجبی اور مناسب، اور صلح و آشتی اور
اتحاد و اتفاق کے قایم کرنیکا بہترین ذریعہ سمجھ کر بمبئی میں منظور کر لیا ہے۔ جنہیں اس
صوبہ کی مسلم لیگ نے میرٹھ میں منظور کیا ہے۔ اور اس صوبہ کی کانفرنس بھی انشاءاللہ منظور
کریگی۔ اگر ان تجاویز پر عملدرآمد شروع ہو گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے،
ہندوستان ہی میں مصر بھی نکل آئیگا اور چین بھی نکل آئیگا۔ پانچ صوبوں میں انکی
اکثریت ہوگی۔ دس میں اقلیت، اور وہ خود بھی انصاف کریں گے۔ اور دوسروں
سے بھی انصاف کی توقع رکھیں گے نہ کہ آجکل کی طرح وہ ہر صوبہ میں اقلیت
میں ہوں گے۔ اور ہر صوبے کی غیر مسلم اکثریت کے دست نگر اور اس کے رحم و کرم
پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور رہوں گے اور اسی لئے بجائے اس پر اعتماد کرنے کے
اسکی ناانصافی کے اندیشہ کا شکار ہوں گے۔

آخر میں میں نے معزز محرک کے ایک جملہ سے اختلاف کرنے کی جرات کی وہ یہ
تھا کہ "مذہب کا بھوت ہمارے سروں پر سوار ہے"، میں نے عرض کیا کہ کاش مذہب
کا "بھوت"، ہی ہمارے سر پر سوار ہوتا۔ آج تو دنیا طلبی کا بھوت ہمارے سروں
پر سوار ہے اور وہی دنیا طلب اور خود غرض لیڈروں سے مذہب کا جامہ پہنکر
ہماری سیاسی سبھاؤں اور لیگوں میں سوانگ بھرواتا ہے۔ آج باجے گاجے کے متعلق
باجے سے بھی بلند تر آواز ان مسلمانوں کی ہوتی ہے جو مشکل ہی سے کبھی نماز پڑھنے

مسجد میں جاتے ہوں گے۔ اور گئو رکشا کے لئے بھی بعض اوقات وہی آج سب سے
زیادہ جوش کا اظہار فرماتے ہوں گے جو کل ہمارے ساتھ ولایت میں خوب "بیف"
اڑایا کرتے تھے!

میں نے تو لارڈ ارون کو بھی کہلوا بھیجا تھا کہ آپ نے اسمبلی کے سامنے
۲۹ اگست کو تقریر فرماتے ہوئے ایک سخت غلطی کی یہ صحیح نہیں ہے کہ مذہب سیاست
میں مداخلت بیجا کا مرتکب ہوا ہے۔ بلکہ سیاست ہی نے مذہب میں مداخلت بیجا کی ہے،
اور ہندو سبھا ہو یا مسلم لیگ دونوں کی کوشش سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل کرنے
یا اس سے محفوظ رہنے کی ہے۔ ع

ایک مجرم نہیں مذہب کی طرفداری کا

مذہب پر بڑا احسان ہو گا اگر یہ جماعتیں اس کی طرفداری چھوڑ دیں اور "دنیا
داری کے بھوت" کو "دینداری کا بھوت" معزز محرک سے نہ کہلوائیں۔

کانگریس کا سابق صدر

ایک عجیب وغریب مخلوق

(ہمدرد ۲۶ مارچ ۱۹۲۹ء)

کانگریس کی طرف سے نہرو رپورٹ کی تائید وحمایت کے جلسوں میں شریک ہونے سے محمد علی نے مسلمانوں کو منع کیا تھا۔ اس پر جواہر لال بپھر پڑے اور کہا کہ کانگریس کے ایک سابق صدر (محمد علی) بھی کانگریس کے فیصلے کے خلاف سرگرم کار ہیں۔

محمد علی سے بھلا چپ رہا جاتا تھا۔ وہ اسوقت رنگون میں تھے۔ وہیں سے انہوں نے اس عجیب وغریب مخلوق یعنی سابق صدران کانگریس کے باب میں ایک مدلل اور برجستہ جواب ارشاد فرمایا۔ جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

(مؤلف)

پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک بیان میں کہا تھا کہ کانگریس کے ایک سابق صدر (مولانا محمد علی کی طرف اشارہ ہے) نے اس اعلان پر دستخط کئے ہیں جس میں مسلمانوں سے درخواست کی گئی ہے کہ کانگریس نے نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں پروپگنڈا

کے لئے جو جلسے اور جلوس نکالنے کی تجویز کی ہے ان میں مسلمان کوئی حصہ نہ لیں۔
مولانا محمد علی سے اس معاملے میں دریافت کیا گیا تو مولانا نے فرمایا "ہم لوگ یعنی کانگریس کے صدر صاحبان عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ اور میں حیران ہوں کہ کانگریس کا سکریٹری ایسا باخبر شخص جسے ۱۹۲۳ء میں میں نے سکریٹری منتخب کیا تھا۔ اور بعد ازاں مختلف پریذیڈنٹ اسے منتخب کرتے رہے۔ کانگریس کے سابق پریذیڈنٹوں کے عجائب خیز اعمال سے ناواقف ہے

پنڈت مدن موہن مالوی کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں۔ مگر جب کانگریس کے اجلاس ناگپور میں ترک موالات، عدم تشدد، اتحاد ہندو مسلم اور اچھوت ادھار کے فیصلے کئے تو پنڈت جی ان فیصلوں کے مقابلے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

پنڈت جی نے بنارس یونیورسٹی میں شہزادہ ولیعہد کا استقبال کیا اور حال ہی میں آپ ایک غیر ملکی دفتری حکومت سے اپنی یونیورسٹی کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ کی رقم وصول کر چکے ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جس نے عدم تشدد کے اصول کے خلاف خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ایک ایک ہندو خاتون کو پستول بندھوا دوں گا۔ اور یہ وہی شخص ہے جس نے کانگریس کے اصول اتحاد کے مطابق آجتک کسی ہندو مسلم فساد میں ہندوؤں کے خلاف کبھی ایک حرف بھی نہیں کہا۔ چھوت چھات کے متعلق میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ پنڈت جی شاید مہاراجہ بنارس کے محل میں بھی اسوقت تک پاؤں نہیں دھرتے جب تک شطرنجی کو الٹ نہ لیں گے۔ آج انہیں کو کانگریس کی مجلس عاملہ کا ممبر بنایا گیا ہے۔ حالانکہ وہ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ساتھ بھی نہیں بیٹھتے۔ بلکہ مہاسبھائی پارٹی کے لیڈر ہیں۔

پھر ہمارے سکریٹری کے والد بزرگوار کی حالت سامنے لائیے وہ بھی کانگریس کے

پریزیڈنٹ رہ چکے تھے۔ مگر انہوں نے کونسلوں میں داخلہ کی ممانعت کے متعلق کلکتہ کانگریس اور گیا کانگریس کے فیصلوں کی مخالفت کی۔ اور ترک موالات کی تحریک کا گلا گھونٹ ڈالا جس طرح کہ وہ آجکل کانگریس کا گلا گھونٹ کر اسے ہندو مہاسبھا میں ضم کر رہے ہیں، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ راسخ العقیدہ ہندو کی طرح ہندو مذہب پر ان کا ایمان نہیں ہے۔

مدراس کانگریس کے پریزیڈنٹ نے بھی مدراس کانگریس کے قرار داد کے خلاف مخالفت کی جس میں ہندو مسلم قضیہ کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اور میں نے اس فیصلے کے لئے مسلسل غیر منقطع کوششیں کی تھیں۔ ایک سابق پریزیڈنٹ (موتی لال نہرو) نے نہرو رپورٹ مرتب کی۔ اور دوسرے سابق پریزیڈنٹ (ڈاکٹر انصاری) نے اسے قبول کر لیا حالانکہ یہ رپورٹ تصفیہ مدراس کے خلاف تھی۔

مہاتما گاندھی نے بھی یہی کیا۔ وہ بھی کانگریس کے پریزیڈنٹ رہ چکے ہیں۔ وہ مدراس کے مناقشت سے پہلے الگ رہے۔ آخری وقت میں ثالث بنے۔ مگر بعد ازاں انہوں نے تصفیہ مدراس میں تغیر پر اصرار کیا۔ حالانکہ اس تصفیہ کے پہلے مجلس عاملہ کانگریس تصدیق کر چکی تھی۔ نیز آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے دو اجلاسوں میں (ایک اجلاس بمبئی اور دوسرا کلکتہ) اسکی منظوری دے چکی تھی۔

سب سے آخر میں تمام ہندو مسلم پریزیڈنٹوں کے نام لے سکتا ہوں جو ہر شب کو کانگریس کے فیصلۂ امتناع مسکرات کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس حالت میں سیاسیات کے متعلق بحث پر مجبور ہوا جبکہ میں ہندوستان کو چھوڑ کر آرام کے لئے برما آیا تھا لیکن میں کسی معترض کے رحم کا ملتجی نہیں ہوں اور نہ کسی کے ساتھ نرمی برتنے

پر آمادہ ہوں۔

دوسرے سابق پریزیڈنٹوں کی طرح مجھے بھی کانگریس کی اکثریت کے فیصلوں کے خلاف اظہار رائے کرنے اور ان فیصلوں کو تبدیل کرانے کے مساعی عمل میں لانے کا پورا حق حاصل ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے والد بزرگوار کی طرح میں یہ نہیں کہتا کہ جب تک کانگریس میرے حکم کے مطابق نہیں چلے گی۔ اسوقت تک میں اس سے دو سو میل دور رہوں گا۔ جس طرح کہ پنڈت موتی لال نہرو نے دہلی کے اجلاس خاص (منعقدہ ستمبر ۱۹۲۳ء) میں کونسلوں میں داخلے کے مسئلہ کے متعلق مجھ سے کہا تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کے اعلان کے دوسرے دستخط کنندگان کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے انتخاب کے وقت خاص عہد کئے تھے، میں اسکے متعلق یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان دستخط کنندگان میں سے ایک شخص بھی کانگریس کا ممبر ہونے کیوجہ سے اسمبلی کا ممبر نہیں منتخب ہوا۔ یہ لوگ جداگانہ حلقوں کی طرف سے منتخب ہوئے جہاں کانگریس کا ممبر ہونا وجہ امداد نہیں بلکہ وجہ مخالفت ہے۔

مولوی سید مرتضیٰ بہادر ۱۹۲۳ء میں سوراج پارٹی کی مدد سے منتخب نہیں ہوئے تھے۔ مگر وہ سوراجیوں کے ساتھ ووٹ دیتے رہے۔ تا آنکہ پنڈت موتی لال نہرو نے انہیں پارٹی سے خارج کر دیا۔ اس لئے کہ سید صاحب صوبہ سرحد کی ۹۲ فیصدی مسلم اکثریت کے ساتھ ناانصافی کے لئے تیار نہ تھے۔

مولوی شفیع داؤدی ۱۹۲۳ء میں سوراجسٹ کی حیثیت سے منتخب ہوئے لیکن جب انہیں اصلاحات سرحد کے مسئلہ پر پارٹی سے خارج کر دیا گیا تو انہوں نے فی الفور ممبری سے استعفیٰ دیدیا۔ اور ۱۹۲۶ء میں مستقلاً دوبارہ منتخب ہوئے۔ اس انتخاب میں انہیں کوئی

وقت پیش نہ آئی ۔ البتہ جب وہ ہماری درخواست پر کانگریس کی طرف سے امید وار تھے ۔ گو اسوقت انہیں مشکلات کا سامنا ہوا تھا۔ اگر کسی شخص کو ان لوگوں کی حیثیتوں کے متعلق کوئی شبہ ہو تو وہ ان کے رائے دہندوں میں سے ایک فیصدی ہی کے نام شایع کردے ۔ جو ان کے اس وجہ سے مخالف ہوں کہ وہ نہرو رپورٹ کی جنگی گاڑی کے ساتھ باندھے جانے کے لئے تیار نہیں ہیں ۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو چاہئے کہ وہ باپ کے نقش قدم کی پیروی کو چھوڑ کر بہادرانہ میدان عمل میں آئیں ۔ وہ واقعی بہادر ہیں اور اپنے سچے خیالات کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کریں ۔ ان لوگوں کی رہنمائی کریں جنہوں نے مدراس کی قرار داد منظور کی تھی اور محض غیر ملکی پارچہ کو نہ جلائیں ۔ بلکہ کانگریس کی اس آخری قرار داد کو بھی جلا دیں ۔ جس میں ڈومینین اسٹیٹس کو قبول کیا گیا ہے ۔ اور مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی برتی گئی ہے ۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں انکی پیروی کروں گا ۔ اور وہ مسلمان بھی ان کی پیروی کریں گے جنہیں مجھ پر اعتماد ہے ۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے والد، اور مہا سبھا کے جلسوں اور جلوسوں میں جتنے لوگ شریک ہوتے، جواہر لال کے جلسوں اور جلوسوں میں ان سے زیادہ لوگ شریک ہوں گے ۔

مجھے افسوس ہے کہ جواہر لال نے کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں اپنی جگہ اپنے والد کو غصب کرنے کی اجازت دی ۔

کانگریس کی تعمیر میں مسلمانوں کا حصّہ

(ہمدرد - ۲۵ - ستمبر ۱۹۲۷ء)

محمد علی پشاور گئے۔ بڑا شاندار، اور شاہانہ استقبال ہوا۔ ایک عدیم النظیر اجتماع میں انہوں نے ایک دل افروز تقریر کی۔

یہ تقریر متعدد حیثیات سے اہم ہے۔ ایک خصوصیت اسکی یہ ہے کہ اس میں گاندھی جی اور کانگریس کے بارے میں بعض ایسے حقایق بیان فرمائے ہیں جن کا کم لوگوں کو علم ہے۔

یہ پیش نظر رہے کہ یہ تقریر انہوں نے اسوقت کی ہے، جب وہ گاندھی جی کے رفیق کار تھے، دوست تھے، پیرو تھے۔ ابھی ان میں اور گاندھی جی میں مخالفت نہیں ہوئی تھی، وہ ان کے بدستور سابق وفادار تھے لیکن اسلامیت، اور حق گوئی، ہر چیز پر بالا رہتی ہے۔ وہی اس تقریر میں بھی نمایاں ہے۔ (مؤلف)

اس غریب، اور اس کے رفقائے کار کا آپ نے جو استقبال کیا ہے اس نے ہمیں حیرت میں ڈالدیا ہے۔ اور گزشتہ ۲۴ گھنٹوں میں اسی کا تذکرہ رہا ہے۔ ہندوستان بھر میں کسی اور جگہ ہمارا استقبال اس گرم جوشی اور خوش سلیقگی کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ باوجودیکہ شہر پشاور، اور

بمبئی، اور کلکتہ، وغیرہ شہروں سے بڑھ کر نہیں۔ ہم جب جلسہ گاہ کی طرف آ رہے تھے تو سنا جاتا تھا کہ شریک ہونے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ جس کے لیئے جلسہ گاہ کافی نہیں ہے۔ تو ہم نے خیال کیا کہ شاید جلسہ گاہ چھوٹی ہوگی جہاں چار پانچ ہزار سے زیادہ لوگ سما نہ سکتے ہوں۔ اور دو تین ہزار لوگ زیادہ آجائیں تو انہیں جگہ نہ ملے اور کھڑا رہنا پڑے لیکن یہاں آکر میدان کھچا کھچ بھرا دیکھ کر اس خوف سے لرز رہا ہوں کہ میری آواز تمام سامعین تک نہیں پہنچ سکے گی، اب میری آواز آپ کے کانوں تک پہنچنے کی صرف یہ صورت ہے کہ آپ کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔

برادران ملت! آج ہندوستان کی فضا ایسی بگڑی ہوئی ہے کہ جب تک کوئی مقرر الفاظ سوچ سوچ کر اور تول تول کر نہ بولے اصلاح کی بجائے فساد کا اندیشہ ہے میں بہت زود نویس ہوں۔ مگر پھر بھی "ہمدرد" کے مضامین چار پانچ کالموں کے لکھنے میں پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے پوچھا کہ اتنی محنت کیوں کرتے ہو؟ تو میں نے جواب دیا کہ باوجود اخبار کی اشاعت کم ہونے کے ہر لفظ کے انتخاب میں یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ہندو اس پر کیا کہیں گے، کانگریس والے کیا خیال کریں گے؟ خلافت والوں پر اس کا کیا اثر ہوگا مسلم لیگ اور ہندو سبھا اور حکومت کے دل میں یہ کیا اثرات پیدا کریں گے۔ اور سب سے آخر یہ کہ خدا کیا کہیگا۔ آج تقریر کرتے ہوئے بھی یہی حالت ہے میں دشمنوں کے نرغہ میں ہوں۔ مگر میری تقریر آپ کو یا ہندوؤں کو یا حکومت کو خوش کرنے کے لیئے نہیں۔ میری کوشش محض یہ ہے کہ خدا راضی ہو۔ اور اسی پر بھروسہ

رکھتے ہوئے ہیں اپنے خیالات، اس امر کا لحاظ نہ کرتے ہوئے کہ آپ انہیں پسند کریں گے یا ناپسند آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں دعا کریں کہ خدا مجھے اس مقصد میں کامیاب کرے۔

جب ہندو، اور مسلمان متحدہ و مشترکہ طور پر غلامی کا جوا گردن سے اتار پھینکنے کی جدوجہد میں مصروف تھے، اسوقت بعض خودغرض مسلمان ہم کو کہتے تھے کہ تم نے ہندوؤں کی غلامی قبول کرلی۔ تم گاندھی پرست ہوگئے۔ اور مسلمانوں کو برباد کر رہے ہو۔ اسی طرح بعض ہندو بھی ایسے تھے جو مہاتما گاندھی کو متہم کرتے تھے کہ علی برادران کی رفاقت قبول کرکے وہ ۲۲ کروڑ ہندوؤں کو سات کروڑ کا غلام بنا کر ان کا ستیاناس کر رہے ہیں۔

لیکن میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جسوقت محمد علی شوکت علی اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ اسی تحریک کی وجہ سے جیل میں گئے تھے تو تم میں سے کسی نے اس وقت فضا کی خرابی کی شکایت کی تھی (''نہیں نہیں'' کی آوازیں) اچھا اگر نہیں تو تم ہی ایمان سے بتاؤ کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔

کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے اس سے پہلے وہ خوش وضع عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی۔ جو تیار کردہ تقریریں شاندار الفاظ میں کرنے اور چند تجویزیں منظور کرنے کی خواہش سے سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر ''نشستند و گفتند و برخاستند'' کا نظارہ پیش کرتے تھے۔ مگر جس دن سے شوکت علی اور محمد علی اس میں شامل ہوئے۔ امرتسر اور کلکتہ کانگریس کو یاد کرو اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی۔ چنانچہ کلکتہ میں صدر لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے

باوجود کانگریس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا۔ اور یہ حقیقت ہمیں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہند و رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا۔ کیونکہ وہ کہتے تھے اور بالکل بجا کہ یہ تمام تحریک خلافت سے متعلق ہے۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی نے دورے کے مصارف خلافت کے سرمائے سے لئے۔ حتیٰ کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے آپ کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کئے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی اور یہ پہلا موقعہ تھا جب حکومت کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ہندوستانی فی الواقع کچھ کر سکتے ہیں۔ مجھ سے نہیں لارڈ ریڈنگ اور سرجان سیفی سے دریافت کر لیجئے کہ اسوقت حکومت کی قوت کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا تھا۔ مگر اب کہ تحریک خلافت سرد پڑ گئی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر تحریک کانگریس بھی چیف کمشنر کو میرے آنے پر کوئی تشویش نہیں، اور وہ آرام کی نیند سو رہے ہیں۔

مجھے ہندوؤں یا مسلمانوں سے کوئی شکایت نہیں دونوں نے حتی المقدور ملک کی خدمت کی (اسوقت دیہات کے اور لوگ جلسے میں آ شامل ہوئے جنکو جگہ ملنے کی کوشش میں جلسہ کا سکون ایک دو منٹ کے لئے زائل ہوا اور حکیم عبدالحکیم ندوی، اور خان علی گل خاں نے سکون پیدا کیا) جس کا حکومت پر یہ اثر ہوا کہ ایک سب سے بڑا قانون داں ہندوستان میں وائسرائے بنا کر بھیجنا پڑا کہ ہندوستان سے سمجھوتہ کرے۔ حالات نہایت ہمت افزا تھے۔ لیکن چونکہ بیس پچیس ہزار فرزندان ہند جیل میں جا چکے تھے اور ہندوستان نے بحیثیت مجموعی اتنی ترقی نہ کی کہ اس سے

زیادہ آبیاری کر سکے اس لیے جو جماعت پیچھے رہگئی تھی۔ اس نے غلامی کی محبت سے رشتہ جوڑا۔ خودغرض مسلمانوں نے مسلمانوں کو اور خودغرض ہندوؤں نے ہندوؤں کو کانگریس اور قومی تحریک سے بدظن کیا۔ کانگریس اور خلافت کی ساکھ بگڑی اور چند خود غرض اور شہرت پسندوں کی ساکھ بڑھی۔ یہ خرابی آجتک چل رہی ہے۔ آپ کو ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ یہ لوگ ہندو مسلمانوں کے دوست نہیں جن کے دوست آج بھی کانگریس اور خلافت کی مجلس ہیں۔ چنانچہ آج بھی جو لوگ اخلاص اور ایثار سے تنظیم اور تبلیغ وغیرہ کے کاموں میں منہمک ہیں اسی جماعت خلافت سے تعلق رکھتے ہیں جو جیل خانہ اور پھانسی پر لٹکائے جانے کے لیے تیار ہیں۔

جب میں رہا ہوکر آیا تو کارکنوں نے کہا کہ تمہیں کیا خبر ہے کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔ ہم بہت پریشانی کی حالت میں ہیں۔ خودغرض لوگوں نے موقع پاکر بدنام کردیا ہے اور ہر طرف سے ہم پر لے دے ہو رہی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ اللہ اور اسکے رسول کا کام ہے۔ اگر "بے ایمان" کہلانا تم خدا کے کام کے لیے برداشت کر سکتے ہو تو کام کرو ورنہ آپ کی ضرورت نہیں، اور الزام لگانیوالوں سے میں نے کہا کہ ہم چندہ اگر کھا بھی جاتے ہیں تو چکی بھی ہم ہی پیستے ہیں۔ اور خدا کا کام کرتے ہیں۔ اگر تم جیل کی چکی پیسنے کے لئے تیار ہو تو اچھا، ورنہ تمہیں ان کھانے والوں کو چندہ دینا پڑیگا۔ ہر انسان کو رسول کی طرح حق کہنا چاہیئے اگر اس پر اسکی جان چلی جائے تو اُسے ذرہ بھر تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ تمہارے دشمن نہ انگریز ہیں نہ ہندو، تم خود اپنے سب سے بڑے دشمن ہو۔ تم سنگھٹن اور شدھی سے ڈرتے ہو جس سے بڑھکر اسلام کی توہین نہیں ہو سکتی۔

عام کی متابعتِ ضبط و انضباط کی ایک بے مثال تعلیم ہے۔ یہ بینت عمل کا ایک عدیم النظیر نمونہ ہے۔ پھر السلام علیکم و رحمۃ کے ساتھ نماز ختم کی جاتی ہے تو اس کے نتیجے پر نگاہ دوڑاؤ۔ تم ہر روز پانچ وقت اپنے دائیں بائیں کے مسلمانوں کو ان کی جان و مال اور آبرو کی سلامتی کا یقین دلاتے ہو۔ رسولِ کریم تیر سے صف سیدھی کرتے تھے تاکہ مسلمانوں کو باطل قوتوں کے خلاف صف آرا ہونے کی ترتیب سکھا دیں۔ مگر آج یہ بات ہے کہ نہ تم میں امام کی متابعت ہے اور نہ کوئی ضبط۔ اور مسلمان بھائیوں کی جان اور مال و ایمان اور آبرو جسکی سلامتی کا تم پر نماز میں اور دن میں سیکڑوں دفعہ چلتے پھرتے السلام علیکم کہہ کر یقین دلاتے ہو، تمہارے ہی ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے۔ تم باہم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر ایک دوسرے کی جان لینے، اسے لوٹنے اور اسکی آبرو برباد کرنے کے درپے ہو۔ تم بھی اگر ایسی تنظیم کر لو تو مالوی اور موبخے کے سنگھٹن کے ارادے دھرے کے دھرے رہ جائیں کیونکہ جن لوگوں میں سنگت ہی نہیں وہ سنگھٹن کیا خاک کریں گے مسلمانوں کو یہ حالت پیدا کرنی چاہیئے کہ نماز میں وہ گویا خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر کی ملاقات کے لئے کتنے کتنے جتن کئے جاتے ہیں۔ ڈالیاں دی جاتی ہیں۔ خانساموں تک کی منت کی جاتی ہے۔ مگر احکم الحاکمین کی بارگاہ ہے کہ آپ دن میں پانچ دفعہ بلا واسطہ ذات باری تعالےٰ سے انٹرویو کر سکتے ہیں جس طرح پانچ وقت کی نماز ۲۴ گھنٹے آپکو پرہیزگار رکھنے کے لئے ہے اسی طرح ایک ماہ سالانہ روزے رکھنے کے لئے ہے تاکہ سال بھر آپ تقویٰ کی آغوش میں رہیں۔ آپ نے پٹھانوں کو مبارکباد دی کہ انہوں نے تجارت کو عار سمجھا ترک کر کے اپنی تجارت کرنا

شروع کر دیا ہے۔ اور سرحدیوں کی مردانگی، شجاعت، اور شرافت کی تعریف
کرتے ہوئے کہا کہ حکومت "فسادات" کو بہانہ بنا کر سرحدیوں کو اصلاحات سے
محروم کرنے کی فکر میں ہے۔ مگر کیا پنجاب اور صوبۂ بہار سے اصلاحات چھین لی جائینگی
جہاں بتیا، اور لاہور کے حیرت انگیز فسادات ہوئے اس لئے سرحد میں کسی جھگڑے
فساد کو کیوں بہانہ بنایا جائے۔ مگر خدا کے لئے آپ جھگڑے فساد سے بچے رہیں۔
روزہ کے فوائد میں ضبط و کفایت شعاری ہے جس کی بجائے ہم معمول سے زیادہ خرچ
کرتے ہیں۔ زکوٰۃ خدائی انکم ٹیکس ہے اسکا جمع کرنا ایسا ضروری ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے
اس سے انکار پر کلمہ گویوں کی جماعت کے خلاف تیغ کو بے نیام کر کے جہاد کا اعلان کیا
تھا۔ یہ محصول سرمایہ ہے جو بالشویکوں کا اصول ہے۔ جہاں دوسرے مذاہب میں ہر
تیرتھ سالانہ ہے۔ اسلام نے حج عمر بھر میں ایک دفعہ لازمی قرار دیا ہے۔ جو اسلام
کا شان امتیازی ہے۔ مسلمانوں کی اس تنظیم کو جو ارکان خمسہ نے بنائی ہے واضح کر کے
اسکے مقابلے میں کوئی سائنس اور کوئی اقوام تنظیم پیش نہیں کر سکتی۔ اگر تم اس تنظیم سے
فائدہ اٹھاؤ، تعلیم اسلامی پر عمل پیرا ہو جاؤ تو شدھی اور سنگھٹن کیا تمام دنیا کا اتحاد بھی
تمہاری مخالفت میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسلام مکمل ترین نظام ہے اگر تم اس پر
عمل کرنا شروع کر دو تو کسی اقتصادی اصلاح اور شدھی اور سنگھٹن کا تمہیں فکر ہی
نہیں رہے گا۔

میں پنجاب میں اس سے بھاگا تھا۔ اور یہاں بھی وہی اقتصادی رٹ ہے جس
سے رذیل تر حالت کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیا مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ بنئے بن جائیں
کیا اقتصادی حالت درست کرنے سے مسلمانوں کی حالت سدھر جائیگی۔ میں یہ نہیں

چاہتا کہ تم کفر آموز حالت میں مبتلا رہو۔ مگر اصلی چیز جو توجہ کے قابل ہے وہ روحانی اور دینی تربیت ہے۔ جب اسلام کی تنظیم سیکھ گئے تو بنئے بقال کیا۔ یورپ اور امریکہ کے تجار بھی تمہاری ٹھوکریں کھائیں گے۔

میں مسلمانوں ہی کو مجرم ٹھہراتا ہوں۔ ہندوؤں کا گھوڑا آگے ہے۔ اور اس سفر میں تمہارا گھوڑا بہت پیچھے ہے۔ ایڑ اور چابک کس کو لگانا چاہیئے۔ آگے نکلے ہوئے ہندوؤں کے گھوڑے کو؟ یا بے اعتنائی سے پیچھے والے مسلمان کے گھوڑے کو "پیچھے چلنے والے گھوڑے کو" کی آوازیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ تم کو اپنی کمزوریوں سے صاف الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ میرے خیال میں سب سے بڑا اسوراج یہ ہے کہ اس تعلیم سے پیچھے پڑ جاؤ، جو رسول نے بتائی ہے۔ میں تجارتی بائیکاٹ کا حامی نہیں ہوں لیکن لعنت ہے مجھ پر اگر مسلمانوں کو دوسروں کا اقتصادی دست نگر دیکھنا گوارا کروں۔

مسلمانوں کو آٹا دال اور دیگر سامان کی تجارت، اور بزازی میں غیروں کا ہرگز ہرگز دست نگر نہیں ہونا چاہیئے۔ ان اشیاء کی ہر محلہ میں مسلمانوں کی دکانیں ہونا چاہئیں۔ خواہ اس پر عزیز سے عزیز دوست بھی خفا کیوں نہ ہو جائے۔

طریقۂ تجارت اسلامی ہونا چاہیئے۔ یعنی سنت محمدیہ کی متابعت کرنی چاہیئے نہ کہ سنت مالویہ کی۔ میں بائیکاٹ کا سخت مخالف ہوں۔ مگر ایک بائیکاٹ کا زبردست حامی ہوں۔ وہ سود کا بائیکاٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان ایک پیسہ بھی کسی سے سود نہ لے۔ اور اسی طرح ایک کوڑی بھی کسی کو نہ دے۔

سیاسیاتِ بین الملّی

فہرست مضامین

۱	مسئلہ نیابت	۱۸۷
۲	قولِ حق	۲۰۸



مسئلہ نیابت

(ہمدرد ۸ - ۹ - اپریل ۱۹۲۸ء)

محمد علی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے اسکے تمام پہلو آئینہ کی طرح واضح کر دیتے تھے۔

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں رہنماؤں کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں بعض شرائط کے ساتھ محمد علی کی کوشش سے مسلمانوں کی طرف سے مخلوط انتخاب قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا گیا۔

اس فیصلہ پر انہوں نے اپنے متعدد مقالات میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے "مسئلۂ نیابت،، پر بھی سیر حاصل اور فاضلانہ گفتگو کی ہے۔

ذیل میں وہ مضامین درج کئے جاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا محمد علی کی دور رس نگاہ کہاں تک پہنچی تھی اور وہ ہر مسئلہ پر بجائے خود ایک "انسائکلوپیڈیا،، کی حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں؟

(مؤلف)

میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں تک میں حقیقی حکومت اب تک انگریزی حکام ضلع کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے باوجود نیابت اور نمایندگی کے اصولوں پر عمل کئے جانے کے ہندوستانی اکثریت کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے لیکن جوں جوں اختیارات ہندوستانیوں کے نمایندوں کو حاصل ہوتے گئے اکثریت کی اہمیت کو بھی وہ سمجھتے گئے۔ اور جب قانون ساز مجالس بھی جان مارلے کی وزارت ہند کے زمانہ میں پہلی بار ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے ذریعہ سے جمعیتیں بنیں تو باوجودیکہ امپیریل کونسل میں عمداً سرکاری اکثریت ہی رکھی گئی، اور صوبجات کی مجالس مقننہ میں بھی اکثریت غیر سرکاری ہونے پر بھی حقیقتاً سرکاری ہی تھی۔ ہندوستانیوں کو اس کا احساس ہونے لگا کہ اکثریت کیسی اہم چیز ہے، اور گو انگریزی عمال حکومت کے پیش نظر مختلف ملتوں کے ساتھ انصاف کرنے سے کہیں زیادہ "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کا اصول تھا۔ تاہم ان کو اس کا فیصلہ کرنا پڑا، کہ مسلمانوں کی اقلیت کی ہندو اکثریت سے کس طرح حفاظت کی جائے اور انہوں نے برطانوی طریقۂ انتخاب اور ہر ملت کو تناسب آبادی کے لحاظ سے نمایندگی دینے کے اصول میں تبدیلی کو گوارا کیا۔ اور مخلوط ملکی حلقہائے انتخاب کے ذریعہ سے بھی چند نشستیں عطا فرمائیں۔ اور انکی نمایندگی کی مقدار کو ان کی آبادی کے تناسب سے بھی کسیقدر زیادہ رکھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو ذہنیت ہندو اکثریت کی تھی اور آج بھی ہندو مہاسبھائی نیتاؤں میں سے اکثر کی ہے اسکو مدنظر رکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ یقیناً بڑی ناانصافی ہوتی۔

افسوس مسلم لیڈروں نے ۱۹۱۶ء میں جو میثاق ہندو لیڈروں کے ساتھ لکھنؤ میں کیا اور جس کے مطابق ۱۹۱۹ء کی اصلاحات ہم کو عطا فرمائی گئیں اس میں

گم کردہ راہ رہنماؤں نے انگریزی طریقۂ انتخاب میں اس تبدیلی کو کہ جداگانہ ملی حلقہائے انتخاب بھی قایم کئے جائیں حد سے زیادہ نوازا اور مشترک و مخلوط ملکی حلقہائے انتخاب کی شرکت سے قطعی دست برداری کو قبول کر لیا۔ اور اکثریت کی اہمیت کو مطلقاً نہ سمجھ کر بنگال اور پنجاب میں اپنی اکثریت کو اس حقیر قیمت پر ہنود کے ہاتھ بیچ ڈالا کہ اور صوبجات میں ہماری حقیر ترین اقلیتیں کسی قدر کم حقیر کر دی جائینگی۔ اور آبادی کے تناسب سے نمایندگی کے اصول کو بالکل ترک کر دیا۔

ان دو مہلک غلطیوں کا ہمارے لیڈروں کو چند ہی سال بعد احساس ہونے لگا۔ اور اسیوقت سے یہ جدوجہد جاری ہے کہ ہماری اقلیت کو تو آبادی کے تناسب سے زیادہ نیابت عطا فرمائی جائے لیکن ہماری اکثریت کو کسی صوبہ میں اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے۔ گو اس میں اتنی تخفیف کر دی جائے کہ وہ ۵۱ فیصدی رہ جائے۔

میں کئی بار اسکے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ملت اسلامیہ کے حقوق کی حفاظت کا یہ صحیح طریقہ ہرگز نہیں ہے۔ اکثریت کی اہمیت کو کما حقہا ہمارے لیڈروں نے اب بھی نہیں سمجھا ہے۔ ملت اسلامیہ کے حقوق کی حفاظت صرف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ وہ ہر جگہ اقلیت میں نہ رہے کہیں کہیں اسے اکثریت بھی نصیب ہو جائے اور اس طرح ہندو مسلمانوں کو بھی مچلکے دیں اور مسلمان ہندوؤں کو، تاکہ دونوں کی اکثریتیں دونوں کی اقلیتوں کے ساتھ انصاف اور روا داری کا برتاؤ کریں اگر ہر جگہ ایک ہی ملت کی اقلیت ہوگی اور دوسری ملت کی اکثریت، اور ہر امر فیصلہ طلب کا فیصلہ کثرت رائے سے کیا جائیگا۔ اور ہندو اکثریت کی ذہنیت وہی رہی جس کا ہم کو اسقدر تلخ تجربہ ہوا ہے۔ تو اقلیت پر ہر جگہ ظلم ہو سکیگا۔

اگر کہیں ایک کی اکثریت ہے اور کہیں دوسری کی تو انگریزی ضرب المثل صادق آئیگی
کہ " یہ کھیل تو دونوں کھیل سکتے ہیں "، اسی کا خوف دونوں ملتوں کو ناانصافی اور
ناروا داری سے روکیگا۔ الحمد للہ کہ ۲۰۔ مارچ ۱۹۲۷ء کو مختلف الخیال مسلمانوں کو
خداوند کریم نے ایک ایسی اسکیم سجھادی جو دونوں ملتوں میں ایک حد تک توازن قایم
کر دیتی ہے۔ اگر مسلم اقلیت ایک ہی تناسب کے ساتھ سارے ہندوستان میں پھیلی
ہوئی ہوتی تو مسلمانوں کے تحفظ کا کوئی طریقہ نہیں نکل سکتا۔ یا تو ہندو اکثریت کے
رحم وکرم پر اپنے تئیں چھوڑ دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ یا پھر انگریزی اقلیت
ہی کی غلامی دونوں ملتوں کو بدستور قبول کرنی پڑتی ۔

صوفیان باصفا کا صدقہ کہ مسلمان ہر صوبہ میں ایک ہی تناسب سے
منقسم نہیں ہیں صوبجات متحدہ میں جو صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت کا مرکز رہے
اگر ہماری تعداد ۶۴ لاکھ ۱۸ ہزار ہے اور ہنود کی تعداد ۳ کروڑ ۸۶ لاکھ ۱۰ ہزار ہے
(جو اس کا بین ثبوت ہے کہ ہم نے بزور شمشیر اسلام نہیں پھیلایا) تو بنگال میں جہاں
اسلام کے مبلغ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھیل گئے اور جہاں مزدوروں اور کاشتکاروں
کو انہوں نے کمین برہمنوں کے پنجے سے چھڑایا۔ اگر ہندو ۲ کروڑ ۲ لاکھ ۶ ہزار ہیں تو
مسلمان ۲ کروڑ ۵۲ لاکھ ۱۰ ہزار ہیں ۔

اسی طرح پنجاب میں جہاں افسوس ہے کہ پیر پرستی کی بدعت آج بہت رائج
ہے۔ زیادہ تر انہی پیروں کے آباواجداد کی خدا پرستی نے یہ صورت پیدا کر دی کہ اگر
ہندو ۶۵ لاکھ ۷۹ ہزار ہیں تو مسلمان ایک کروڑ ۱۴ لاکھ ۴۴ ہزار ہیں۔ میں
ترکوں کا بڑا مداح ہوں، اور میرا خیال ہے کہ عرب اور عجم کو جو کچھ بھی ان پر فضیلت ہے وہ

لیکن روزمرہ کی زندگی جتنی اناطولیہ کے ترکوں کی صدیوں سے اسلامی ہے اتنی نہ عربوں کی رہی ہے نہ ایرانیوں کی۔ اگر یورپ کے نصاریٰ اس سبب سے ترکوں کے دشمن ہوتے تو سمجھ سکتا تھا۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ وہ ترکوں پر مذہبی ناروداری کا الزام لگاتے ہیں۔ اور انہیں نصرانیت کا دشمن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ترکی ہی وہ ملک ہے جہاں ترکوں کی رواداری کے باعث نصاریٰ کا ہر فرقہ جو آجتک موجود ہے جو نصرانیت کے سوادِ اعظم سے علیحدہ ہو کر نکلا تھا اور جو یورپ کے کسی نصرانی ملک میں آج باقی نہیں۔ اور روما اور روس اور "ریفرمیشن" کی ناروداری کا عرصہ ہوا کہ تسکار ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ چکا۔

خیر یہ تو ایک دوسری بحث ہے۔ مگر جو مجھے یہاں عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ترکوں کو انکی اسلامی زندگی پر عربوں اور ایرانیوں پر افضلیت تو حاصل ہے مگر ان کی مذہبی رواداری یقیناً حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور انہوں نے ہرگز تبلیغ اسلام کا وہ کام نہیں کیا جو عربوں نے کیا۔ عرب جہاں پہنچے انہوں نے اس مذہبی فریضہ کو انجام دیا۔ اور آج جہاں جہاں اسلام ہے وہ زیادہ تر عربوں ہی کی تبلیغ کا طفیل ہے۔ جہاں جہاں ترک گئے وہاں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم بڑھی۔ ایران اور افغانستان اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کی تعداد کس قدر کم ہے اور خود ترکی اور ہندوستان کی طرح ان ممالک میں جنہیں ترکوں نے فتح کیا غیر مسلموں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے۔ ایران اور وسط ایشیا اور افغانستان کا اسلام تو عربوں کی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ لیکن ترکی اور ہندوستان میں غیر مسلموں کی اکثریت ترکوں کی اور ایرانیوں کی ممنون احسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان

اور صوبہ سرحد میں تو ہنود کالعدم ہیں۔ لیکن پنجاب تک میں ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔

صوبہ سرحدی چونکہ آج ہندوستان میں شامل ہے اسلئے باوجود ہنود اور سکھوں کی اس طرف پنجاب سے ہجرت کر کے سکونت اختیار کرنے کے وہاں کی مسلم آبادی ۲۰ لاکھ ۶۲ ہزار ہے اور ہنود کی تعداد ایک لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ سندھ کو عربوں نے فتح کیا تھا اور اگرچہ یہ اسی کے دریا "انڈس" کا طفیل ہے کہ دنیا اس ملک کے باشندوں کی اکثریت کو ہندو کہتی ہے اور اس ملک کو ہندوستان کے نام سے پکارتی ہے تاہم علاقہ سندھ کے باشندوں کی اکثریت عربوں کی فتح اور مبلغین اسلام کے طفیل سے آجتک مسلم ہے اور کل ۳۲ لاکھ ۷۹ ہزار کی آبادی میں ہنود غالباً ۲۸ فیصدی کی اقلیت میں ہیں۔

ان اعداد و شمار کا خلاصہ یہ ہے کہ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو ۵۵ فیصدی کی۔ صوبہ سرحدی میں ۹۲ فیصدی کی۔ اور سندھ میں ۷۲ فیصدی کی اکثریت حاصل ہے اور اگر بلوچستان کی مختصر سی ۴ لاکھ ۲۰ ہزار کی آبادی کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہاں بھی تقریباً ۸۰ فیصدی کی اکثریت حاصل ہے۔ لیکن اگر سارے ہندوستان کی آبادی کو جس پر برطانیہ کی حکومت ہے دیکھا جائے تو ہنود کو ۶۶ فیصدی کی اکثریت حاصل ہے اور مسلمانوں کی ۲۵ فیصدی کی اقلیت ہے۔ اگر ہر صوبہ میں یہی تناسب ان دو ملتوں کے درمیان ہوتا تو مسلمان ہر صوبہ کی حکمراں کونسل میں اقلیت میں ہوتے اور اکثریت ہنود کو حاصل ہوتی اور اگر ہنود کی ذہنیت وہی ہوتی جو ہندو سبھائیوں کی بالعموم ہے۔ تو ہر امر فیصلہ طلب کا فیصلہ اسطرح ہوتا کہ مسلمانوں کی طرف سے ۲۵ ہاتھ اٹھائے جاتے اور ان کے خلاف

ہنود کی طرف سے ۶۶ ہاتھ اُٹھتے۔ اور اگر دوسری ملتوں کے نمایندے بھی مسلمانوں
کے ساتھ ہاتھ اُٹھاتے تب بھی ۳۴ سے زیادہ ہاتھ اسطرف نہ اُٹھتے اور ہنود ۳۲
کی نہایت کافی اکثریت سے ہر امر کا فیصلہ اپنی مرضی کے موافق کراتے۔ اور اگر
دوسری ملتیں بھی اس اکثریت سے مرعوب ہوکر اسکی طرفداری کرتیں تو مسلمانوں کی
طرف سے ۲۵ ہاتھ اُٹھتے اور ہنود کے موافق ۷۵ ہاتھ اُٹھائے جاتے۔ اور ۵۰
کی زبردست کچل ڈالنے والی اکثریت سے ہر امر کا فیصلہ ہنود کی منشار کے موافق ہوا
کرتا۔

اب قارئین کرام غور فرمائیں کہ مسلم اقلیت کی یکساں تناسب سے سارے
ہندوستان میں تقسیم نہ ہونے نے ہمیں کس طرح کچلے ڈالے جانے سے محفوظ رکھا ہے
اور وہ اس نکتہ کو ہرگز ہرگز نہ بھولیں کہ ایک اقلیت کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ
ملک میں غیر مساوی تناسب سے پھیلی ہوئی ہو۔ ایک مساوی تناسب سے پھیلا ہوا
ہونا ایک اقلیت کے لئے مہلک ہے۔ آیندہ اس نکتہ کا بار بار ذکر آئیگا اسلئے
میں چاہتا ہوں کہ اکثریت اور نیابت کی بحث میں قارئین کرام اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن
نشین رکھیں اور ہرگز نہ بھولیں کہ جب ہر امر کا فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا تو اکثریت کو
کس قدر اہمیت حاصل ہے اور اقلیت کس قدر کم وقیع ہے۔ اور خواہ اقلیت کی سطح کتنی
ہی بلند کیوں نہ ہو، اقلیت کا ناہموار ہونا اسکے مسطح ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔

لکھنؤ کے میثاق میں مسلم لیگ کے لیڈروں نے اکثریت کی اہمیت کو نہیں سمجھا
بنگال اور پنجاب میں اپنی اکثریت کو کھو کر صرف یہ کیا کہ دوسرے صوبوں میں اپنی
اقلیت کی سطح کو کس قدر اونچا کرالیا۔ اور ملت اسلامیہ اور ہندوجاتی کے تناسب کو

کسیقدر ہموار کرا دیا۔ لیکن ہر صوبہ میں ہنود کی سطح کو سطح مرتفع بنا کر چھوڑا اور اپنی سطح کو سطح اسفل کرا لیا۔

۲۰۔ مارچ ۱۹۲۷ء کو اس غلط کارروائی کی اصلاح اسطرح کرانا تجویز کیا گیا کہ ہنود اور مسلمانوں کے تناسب کو پھر اسی طرح ناہموار کر دیا جائے جسطرح قدرت نے اسے ناہموار کیا ہے۔ اور یہ نہ کیا جائے کہ خدا کے عالی بنائے ہوئے کو سافل اور سافل بنائے ہوئے کو عالی کر دیا جائے۔ اور خدا کی طرح میثاق لکھنؤ بنانے والے ہی کہیں کہ "فجعلنا عالیھا سافلھا وامطرنا علیھم حجارۃ من سجیل" اور مسلمانوں کو ہر جگہ اقلیت میں رکھوا کر انکو کچلوا ڈالیں۔ بلکہ جہاں وہ عالی تھے انکو عالی ہی چھوڑا جائے۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ امریکہ میں ایک لفظ "جیری مینڈر" گھڑا گیا تھا جو اب یورپ کے مختلف ممالک میں بھی زبان زد خلایق ہو گیا ہے۔ تاکہ سیاسیین کی اس بے ایمانی کو ہی ایک نام دیدیا جائے جس کا اکثر ارتکاب ہوتا رہتا ہے۔ اور وہ اسطرح کہ حلقہائے انتخاب کی حدود کو اس انداز سے بدل دیا جائے کہ ایک اقلیت اکثریت میں اور ایک اکثریت اقلیت میں بدل دی جائے۔

فرض کیجئے کہ کسی علاقہ میں ایک فرقہ کے ۱۳ ہزار لوگ ہیں۔ اور دوسرے فرقہ کے ۱۲ ہزار۔ انکی ایک تقسیم تو اسطرح ہو سکتی ہے کہ جس فرقہ کی اکثریت ہے ساری کی ساری نشستیں اسی کو ملجائیں۔ اور ایک تقسیم اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ سوائے ایک کے ساری نشستیں اس فرقہ کو ملجائیں جسکی اقلیت ہے۔

مثال کے طور پر ذیل کا نقشہ دیا جاتا ہے:۔

ایک تقسیم

نمبر حلقہ انتخاب	فرقۂ (الف) کے ووٹ	فرقۂ (ب) کے ووٹ	نشست کسکو ملی
۱	۲۶۰۰	۲۴۰۰	فرقۂ (الف) کو
۲	۲۶۰۰	۲۴۰۰	"
۳	۲۶۰۰	۲۴۰۰	"
۴	۲۶۰۰	۲۴۰۰	"
۵	۲۶۰۰	۲۴۰۰	"
میزان کل	۱۳۰۰۰	۱۲۰۰۰	پانچوں فرقہ (الف) کو باوجودیکہ میزان کل میں اسکی صرف ایک ہی ہزار کی اکثریت ہے

دوسری تقسیم

نمبر حلقہ انتخاب	فرقۂ (الف) کے ووٹ	فرقۂ (ب) کے ووٹ	نشست کس کو ملی ہے
۱	۴۰۰۰	۱۰۰۰	فرقہ (الف) کو
۲	۲۴۰۰	۲۶۰۰	فرقۂ (ب) کو
۳	۲۳۰۰	۲۷۰۰	"
۴	۲۲۰۰	۲۸۰۰	"
۵	۲۱۰۰	۲۹۰۰	"
میزان	۱۳۰۰۰	۱۲۰۰۰	صرف ایک فرقہ ا کو باقی ۴ فرقۂ ب کو باوجودیکہ میزان کل میں اسکی ایک ہزار کی اقلیت ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دو فرقوں کی مختلف حلقہائے انتخاب میں تقسیم کس طرح کی جا سکتی ہے۔ اور ایک تقسیم کا نتیجہ دوسری تقسیم کے نتیجہ سے کس قدر تعجب انگیز طریقہ پر مختلف ہو سکتا ہے۔ اب قارئین کرام سمجھ سکتے ہیں کہ لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں کیا کیا تھا وہ بھی جیری مینڈرنگ تھا کہ بنگالی ہندو کو مشرقی بنگال اور آسام میں اقلیت میں رکھ کر وہاں کے مسلمانوں کو اکثریت میں رکھا گیا۔ اور مغربی بنگال و بہار میں انہیں اقلیت میں رکھ کر بہاریوں اور مسلمانوں کو اکثریت میں رکھا گیا۔ اور وہ جو تقریباً ۹ کروڑ آبادی میں باوجود صرف ۲ کروڑ ہونے کے سب پر مسلط تھے ۱۹۰۵ء میں ہر جگہ اقلیت بن گئے۔ اور اسلئے چیخ اُٹھے۔ انہوں نے جان توڑ کر حکومت کا مقابلہ کیا اور بالآخر لارڈ کرزن تقسیم بنگالہ کو دسمبر ۱۹۱۱ء میں منسوخ کرا کے اس "جیری مینڈرنگ" کا خاتمہ کرایا۔ اور اسکے بعد صوبوں کی صحیح تقسیم ہوئی اور مسلمان پورے بنگال میں چھوٹی سی اکثریت حاصل کر سکے اور بہار واڑیسہ میں اور اسی طرح آسام میں ہندو کو اکثریت حاصل ہوئی۔

"ہم جیری مینڈرنگ،، نہیں چاہتے۔ لیکن قدرت نے ہمیں اسطرح تقسیم کردیا ہے کہ دو بڑے صوبوں میں یعنی بنگال و پنجاب میں ہمیں تھوڑی سی اور سرحد کے مختصر سے صوبہ میں ایک بہت بڑی اور سندھ میں بھی جو ہر طرح علیحدہ مستقل صوبہ بننے کا مستحق ہے ہمیں ایک بڑی اکثریت حاصل ہے۔ ابتک جبکہ ہم میثاق لکھنؤ کے مطابق ہر صوبہ میں ناحق اقلیت میں رکھدیئے گئے تھے ہمکو اقلیت کے حقوق کی حفاظت کے لئے شور مچانا پڑتا تھا۔ لیکن ہندو اکثریت اسے قوم پروری کے خلاف سمجھتی تھی۔ اگر صوبہ سرحدی کو بھی حق انتخاب مل جانا اور سہیں وہاں اتنی ہی بڑی اکثریت

حاصل ہو جاتی جو ہنود کو متعدد صوبوں میں حاصل ہے تو وہاں کی ہندو اقلیت اپنے بھی حقوق کی حفاظت کا ہماری ہی طرح مطالبہ کرتی۔ اور اسکی قوم پروری کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہنود نے صوبۂ سرحدی کو حق انتخاب دیئے جانے کی مخالفت کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ سندھ کی حلقۂ بمبئی سے علیحدگی کی بھی مخالفت کر رہے ہیں لیکن ہم اپنے دونوں مطالبات میں حق بجانب ہیں ہم "جبری مینڈرنگ" کے خواستگار نہیں، لیکن خداوند کریم نے ہماری اقلیت کو خود غیر مساوی طریقہ پر پھیلا کر ہمارے تحفظ کا سامان کر دیا ہے۔ اور ہندو سبھائیوں کی مخالفت قدرت کی اور خدا کی مخالفت ہے۔

(۲)

جو طریقۂ انتخاب برطانیہ میں رائج ہے وہ اسی کا مصداق ہے کہ "آب، جو از سر گزشت، اچہ یک نیزہ وچہ یک دست"، اسی طریقہ کو برطانیہ نے ہندوستان میں رائج کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسکے نقایص پر آجتک غور نہیں کیا۔ اگر اس پر کبھی کسی قدر غور کیا گیا تھا تو وہ ۱۹۰۶ء کے بعد ہی کیا گیا تھا۔ اور جان مارلے جو باوجود مِل کے بڑے مداح ہونے کے اسکے شاکی تھے کہ مِل نے سیاسی عقاید اور سیاسی مطامح نظر کی اصلاح کے ساتھ ساتھ سیاسی مشین کے کل پرزوں کی ساخت پر غور کر کے ان کی اصلاح کرانے کی کوشش میں اپنا قیمتی وقت ضایع کیا۔ ان تک کو وزارت ہند کا قلمدان ملنے پر ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے مسئلہ پر غور کرتے ہی رائج الوقت سیاسی مشین کی ہندوستان میں اسطرح اصلاح کرنی پڑی کہ مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت کے

ہاتھوں کچلے جانے سے بچانے کے لئے انہوں نے پہلے انتخابی حلقوں میں تناسب آبادی کے لحاظ سے مسلم اقلیت کے لئے رائے دہندوں کی تعداد کا تعین اگر ضرورت پڑے تو سرکار کی طرف سے نامزدگی تک کے ذریعے سے کرنا چاہا۔ اور بالآخر جداگانہ ملی حلقہائے انتخاب کے قیام کو گوارا کر لیا۔

لیکن تقسیم کا جو دوسرا نقشہ کل پیش کیا گیا تھا۔ اس سے قارئین کرام پر یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ برطانیہ میں جو طریقہ انتخاب رائج ہے اس میں صرف یہی نقص نہیں ہے کہ ایک مختصر سی اکثریت اقلیت کو نمایندگی سے بالکل محروم کر سکتی ہے بلکہ اس میں اس سے بھی بڑا نقص یہ ہے کہ ایک اقلیت بھی اکثریت کو نمایندگی سے تقریباً بالکل محروم کر سکتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ایک حلقۂ انتخاب میں اکثریت کو ضرورت سے بہت زیادہ اکثریت دیدی جائے۔ اور باقی تمام حلقہائے انتخاب میں اکثریت والے فرقہ کو اقلیت میں چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس مثال میں تیرہ ہزار والے اکثریت کے فرقہ کو ایک حلقۂ انتخاب میں تین ہزار کی اکثریت دیکر اسکی اکثریت کو ضایع کر دیا گیا تھا۔ اور باقی چار حلقہائے میں اس فرقہ کو اقلیت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ حقیقتاً اس طریقۂ انتخاب سے جس طرح فقط پانچ کی اکثریت ایک فرقہ کو پانچوں حلقہائے انتخاب میں ایک ایک ووٹ سے فتح دلوا کر پانچوں نشستوں کو اسی فرقہ کو دلوا سکتی ہے۔ اور بارہ ہزار نہیں بارہ کروڑ کی اقلیت کو نیابت سے قطعاً محروم کرا سکتی ہے۔ اسی طرح کروڑوں کی اکثریت صرف ایک حلقۂ انتخاب میں ضایع کیجا سکتی ہے۔ اور باقی تمام حلقہائے انتخاب میں ایک ایک کی اقلیت اس کروڑوں کی اکثریت والے فرقہ کو شکست دلوا کر نیابت سے محروم رکھ سکتی ہے۔ اگر ایک حلقہائے انتخاب میں ایک فرقہ کی

تعداد ایک کروڑ ہے، اور اس کے مدمقابل فرقہ کی تعداد صرف ایک ہے تب بھی طرزوی طریقۂ انتخاب کے مطابق اس فرقہ کو صرف ایک ہی نشست مل سکتی ہے۔ اور اگر باقی تمام حلقہائے انتخاب میں اسکے مدمقابل فرقہ کو ایک ایک ہی کی اکثریت حاصل ہے تو وہ باقیماندہ تمام نشستوں کو اپنے مدمقابل فرقہ کو دے بیٹھنے پر مجبور ہوگا۔ اس لئے کہ اس طریقۂ انتخاب کا اصول یہی ہے کہ "آب چو از سر گزشت، چہ یک نیزہ و چہ یک دست"، ایک حلقۂ انتخاب میں پانی حریف کے سر سے ہزار نیزہ کے برابر بھی بلند ہو جائے تب بھی حریف کو ایک ہی بار مرنا پڑے گا۔ اور اگر خود اس کے سر سے پانی ایک ہاتھ بھر ہی گزر جائے تب بھی وہ خود موت سے نہیں بچ سکتا۔ مجھے امید ہے کہ قارئین کرام اب اسے اچھی طرح ذہن نشین کر چکے ہوں گے کہ جو طریقہ برطانیہ میں رائج ہے اور جسے برطانیہ نے ہندوستان میں رائج کیا ہے۔ یعنی ہر حلقۂ انتخاب میں امیدواروں کا ایک نشست کے لئے انتخاب ہونا یا اگر ایک سے زیادہ نشستیں ہوں تو ہر نشست کے لئے رائے دہندوں کو ایک ایک ووٹ دینا۔ اس طریقۂ انتخاب سے سب سے زیادہ فائدہ اسی طرح اُٹھایا جا سکتا ہے کہ اکثریت تمام حلقوں میں جہانتک ہو سکے، مساوی طور پر منقسم ہو۔ اور اگر کوئی فرقہ اقلیت میں ہو تو اقلیت مختلف حلقوں میں غیر مساوی طور پر منقسم ہو۔ اور یہ اقلیت کے لئے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ ایک مختصر سی مختصر اکثریت سے ایک یا ایک سے زیادہ حلقوں میں کامیاب ہو کر ایک نشست یا چند نشستیں جیت لے اور باقی حلقوں میں بڑی سے بڑی اکثریت سے ہرا دی جائے۔ بمقابلہ اسکے کہ کسی حلقہ میں اسکی اکثریت نہ ہو۔ مگر کسی حلقہ میں اسکی اقلیت بہت زیادہ حقیر بھی نہ ہو۔

لارڈ کرزن نے ہنود بنگالہ کو ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگالہ کے ذریعہ سے "جیری مینڈر (Gerry mander) کرنے سے مشرقی بنگال و آسام اور مغربی بنگال و بہار میں منقسم کر کے اقلیت میں چھوڑ دیا تھا۔ جسکی وجہ سے یہ ہوشیار فرقہ جو باوجود کل دو کروڑ ہونے کے کئی علاقوں میں نو کروڑ کی آبادی پر مسلط تھا "صوبہ بنگال" کی تقسیم سے بیتاب ہوگیا۔ اور اس نے حکومت کو اپنی جدوجہد اور مقاومت سے پریشان کر ڈالا۔ اور بالآخر اس "جیری مینڈرنگ" کا ایک واجبی تقسیم کے بعد دسمبر ۱۹۱۱ء میں خاتمہ ہوا کہ بنگال میں ۲ کروڑ ہنود کو ایک مختصر سی یعنی ۵۰ لاکھ کی اقلیت میں چھوڑا گیا۔ مگر آسام میں ۴۱ لاکھ ہنود کو ۲۲ لاکھ مسلمانوں پر ۱۹ لاکھ لاکھ کی۔ اور بہار و اڑلیسہ میں ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ہنود کو ۶۳ لاکھ مسلمانوں پر ۲ کروڑ ۵۴ لاکھ کی زبردست اکثریت نصیب ہوئی۔

ہم مسلمان نہیں چاہتے کہ ۱۹۰۵ء کی طرح کی "تقسیم بنگالہ" عمل میں لائی جائے اور جس طرح کرزن نے "جیری مینڈرنگ" کیا تھا، کانگریس بھی کرے، اور جس ملک کی ساخت نباتات، زبان، تاریخ اور اسکے باشندوں کے خصائل اور ان کا لباس اور طرز بود و ماند بنگال کی طرح ایک ہو اسکے دو ٹکڑے صرف اسلئے کر دئے جائیں کہ ایک میں مسلمانوں کو زبردست اکثریت ملجائے۔ لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ صوبہ سرحدی جو اگر ہندوستان کا ایک جزو بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی پنجاب میں حقیقتاً ساخت، نباتات، زبان، تاریخ، اور اپنے باشندوں کے خصائل، لباس اور طرز بود و ماند کی رو سے شامل نہیں ہے اور جو پنجاب سے علیحدہ کیا جا چکا ہے۔ علیحدہ ہی رہے اور بغیر پنجاب کے ساتھ الحاق کی رشوت دئے ہوئے

کم از کم پنجاب ہی کی طرح سرزمین با آئین بنا دیا جائے۔

اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ سندھ جسکو بلا قصد انگریزوں نے "جبری مینڈر" کر دیا تھا گجرات اور مہاراشٹر اور کرناٹک سے جن سے اسے اتنا بھی تعلق نہیں جتنا ان علاقوں کو راجپوتانہ سے ہے، علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ صوبہ سرحدی اور علاقہ سندھ کے اسی طرح واجبی حقوق ہیں جس طرح صوبہ بنگالہ کا یہ حق تھا کہ وہ آسام سے علیحدہ رہے، اور بہار و اڑیسہ سے بھی۔ اور نہ مشرقی اور مغربی حصوں میں توڑا جائے نہ آسام و بہار و اڑیسہ کے ساتھ جوڑا جائے۔

لیکن اس کے تسلیم کرنے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں کہ ہمارے واجبی مطالبات کے قبول کئے جانے کا یقیناً یہ نتیجہ نکلیگا کہ مسلم اقلیت کی غیر مساوی تقسیم اس کے لئے مفید ہوگی۔ مگر ہمارے اس اقبال و اعتراف کے یہ بھی معنے ہیں کہ ہندوان دونوں واجبی مطالبات کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ مسلم اقلیت کی مساوی تقسیم اس کے لئے یقیناً مضر ہے۔ اور ہندو اکثریت ہر جگہ مسلمانوں کو اقلیت ہی میں رکھنا چاہتی ہے۔ خود کہیں بھی اقلیت میں رہنا نہیں چاہتی۔

(۳)

اب تک تو میں نے ہندوستان کی صوبوں میں تقسیم کے متعلق جبری مینڈرنگ کی خرابیاں بتائیں لیکن اگر قارئین کرام ذرا بھی غور فرمائیں گے تو انہیں یقین ہو جائیگا کہ صوبوں ہی کی تقسیم میں مسلمانوں کو "جبری مینڈرنگ" سے نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ اگر مسلم اقلیت کو سارے ہندوستان کے حلقہائے انتخاب میں مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے تو یہی نہیں کہ آج کی طرح ہر صوبہ کی

حکومت میں مسلمان مغلوب اور ہندوان پر غالب رہیں گے۔ جب تک برطانیہ میں رائج الوقت اور نیز ہندوستان میں برطانیہ کی طرف سے رائج کردہ طریقۂ انتخاب جاری ہے ایک مسلمان نمایندہ بھی کسی کونسل کا رکن منتخب نہ ہوسکیگا۔ اگر حلقۂ انتخاب میں ہنود اور مسلمانوں کا تناسب ۶۶ اور ۲۵ کا رہیگا۔ توجس طرح نقشہ میں ظاہر کیا گیا ہے تمام نشستیں ہندو امیدواروں سے پُر ہوجائینگی۔

اس لئے یہی کافی نہیں ہے کہ ہم صوبۂ سرحدی کی آزادی اور علاوہ سندھ کی علیحدگی پر زور دیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم تیسرے امر متنازعہ فیہ پر بھی غور کریں۔ اور اکثریت و نیابت کے مسئلہ پر غور و خوض کرکے دیکھیں کہ کیا برطانوی طریقہ انتخاب کو رائج رکھ کر مخلوط حلقہائے انتخاب کے ذریعے سے مختلف ملتوں کو صحیح اور واجبی نیابت حاصل بھی ہوسکتی ہے یا نہیں۔

میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ برطانوی طریقہ انتخاب، جو ہندوستان میں بھی آج رائج ہے سب طریقوں سے زیادہ ناقص ہے، اور اسکے ذریعہ سے مخلوط حلقہائے انتخاب میں مختلف ملتوں کو صحیح اور واجبی نیابت ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔ لیکن ہم ہندوستان والے اپنی غلامانہ ذہنیت کے باعث انگریزوں کی اسقدر تقلید جامد کرتے رہے ہیں کہ اتنی سی بات سے بھی ہم میں سے بہت ہی کم واقف ہیں کہ اس طریقہ انتخاب کے علاوہ دنیا میں کوئی اور طریقہ . . . . انتخاب بھی کہیں رائج ہے۔ اس طریقۂ انتخاب کے نقائص پر کس قدر غور کیا جاچکا ہے۔ اور کس عرصہ سے غور کیا جارہا ہے

اور انکی اصلاح کے لئے جاپان میں۔ جرمنی میں۔ فرانس میں۔ بلجیم میں۔ سویڈن میں فن لینڈ میں۔ سوئٹزرلینڈ میں اور خود برطانیہ کی نو آبادیوں میں کیا کیا طریقے جاری کئے گئے ہیں۔ اور کس طرح اب سیاسیئین مغرب اس طرف مائل ہو رہے ہیں کہ ہر نشست کے لئے ایک حلقۂ انتخاب مقرر کرنے، یا ایک سے زیادہ نشستوں کے لئے ایک حلقۂ انتخاب مقرر کر کے ہر نشست کے لئے ہر رائے دہندہ کو ایک ووٹ دینے کا حق دینے کے بجائے یہ کیا جائے کہ ہر حلقۂ انتخاب تین یا تین سے زیادہ نشستوں کے لئے مقرر کیا جائے۔ مگر ہر رائے دہندہ کو ہر نشست کے لئے نہیں بلکہ تمام نشستوں کے لئے صرف ایک ہی امیدوار کے واسطے ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اسے یہ بھی حق دیا جائے کہ وہ پرچۂ انتخاب پر یہ بھی ظاہر کر دے کہ اس ایک امیدوار کے بعد وہ کس امیدوار کو ترجیح دیگا اور اسی طرح اگر اسکا جی چاہے تو تمام امیدواروں کے ناموں کے سامنے اپنی ترجیح کا نمبر وار اس طرح اظہار کر دے۔

اسمائے امیدواران	ترتیب ترجیح
زید	۳
عمر	۱
بکر	۴
خالد	۲
عامر	۶
حارث	۵

بظاہر یہ ایک عجیب گورکھ دھندہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ طریقہ اسلئے
ایجاد کیا گیا ہے کہ کسی فرقہ کو، خواہ وہ اکثریت میں ہو یا اقلیت میں اپنے رائے
دہندوں کے ووٹوں کو ضایع نہ کرنا پڑے۔ ہر کامیاب امید وار کے لئے صرف
اتنے ووٹ شمار کئے جائیں جتنے ووٹوں کی اُسے کامیابی کے لئے ضرورت ہے
جو ووٹ اِس سے زائد اُسے ملے ہوں وہ اس دوسرے امید وار کے نام منتقل
کردئے جائیں جسے ووٹ دینے والے نمبر ا کے بعد ترجیح دی ہے یعنی جس کے
نام کے سامنے اس نے نمبر ۲ تحریر کیا ہے اور اسی طرح یہ ضرورت سے زائد ووٹ
بقدر گنجایش تیسرے اور چوتھے اور پانچویں اور چھٹے کے نام منتقل ہوتے رہیں اور
اگر کسی امید وار کو اتنے کم اول نمبر کے ووٹ ملیں کہ وہ ضرورت سے زاید
ہونے کی بجائے ضرورت سے کم ہوں۔ تو وہ بھی دوسرے۔ تیسرے۔ چوتھے
پانچویں اور چھٹے نمبر پانے والے کے نام بقدر گنجایش منتقل کر دیئے جائیں
تاکہ اول نمبر والا نہ سہی دوسرے نمبر والا ہی کامیاب ہو جائے۔ اور اسی
طرح حسب گنجایش اس سے نیچے نمبر والے بھی جس طرح ضرورت سے زائد
ووٹ ضایع نہیں ہونے دیئے گئے۔ اسی طرح ضرورت سے کم ووٹ بھی
ضایع نہیں ہونے دیئے جائیں۔ تا آنکہ اسطرح ہر ایک امید وار کے ووٹ
شمار کرنے اور ضرورت سے زائد اور ضرورت سے کم ووٹ اس طرح
دوسروں کے نام منتقل کرنے کے بعد سب خالی نشستوں کے لئے اتنے ووٹ
ملجائیں جتنے کی انہیں کم سے کم ضرورت ہے اور اسطرح سب نشستیں پُر ہو
جائیں۔ یہ طریقۂ انتخاب چند اور طریقوں کی طرح متناسب نیابت کہلاتا ہے،

اس لیئے کہ ان طریقوں سے ہر فرقہ رائے دہندوں کی تعداد کے صحیح تناسب کے مطابق نشستیں حاصل کرلیتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ مذکورہ نقشوں کی طرح تیرہ ہزار کی اکثریت والا فرقہ بارہ ہزار کی اقلیت والے فرقہ کو نمایندگی سے کلیتہً محروم کر دے۔ یا بارہ ہزار کی اقلیت والا فرقہ تیرہ ہزار اکثریت والے فرقہ کو صرف ایک نشست دے کر باقی تمام نشستوں کو خود جیت لے۔

ان طریقوں سے لازمی طور پر ہر فرقہ کو اتنی ہی نشستیں ملجائینگی جتنی کا وہ اپنے رائے دہندوں کی تعداد کے مطابق بحصہ رسدی مستحق ہے۔ اگر ۲۵ نشستیں ہونگی تو ایک کو تیرہ اور دوسرے کو بارہ ملجائیں گی۔ اگر پچاس ہونگی تو اسی طرح ایک کو ۲۶ اور دوسرے کو ۲۴ مل جائیں گی۔ لیکن اگر صرف پانچ ہونگی تو چونکہ کسور کا کوئی حساب نہیں رہ سکتا اسلئے تین ایک کو ملجائینگی اور دوسرے کو چونکہ اس خاص طریقہ میں ہر رائے دہندے کو ایک ہی امیدوار کے لئے رائے دینے کا حق دیا گیا ہے۔ مگر کسی امیدوار کو ضرورت سے زیادہ یا ضرورت سے کم ووٹ ملیں تو حسب ترتیب ترجیح وہ ایک ووٹ دوسروں کے نام بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس خاص طریقہ کا نام متناسب نیابت بذریعہ یک رائے منقولہ (یا قابل انتقال) رکھا گیا ہے۔ ایک امیدوار کی کامیابی کے لئے اتنے ہی ووٹ کافی ہیں جو تمام ووٹوں کو خالی نشستوں کی تعداد سے ایک زیادہ پر تقسیم کرنے اور حاصل تقسیم میں ایک کا اضافہ کرنے سے ملجائیں۔ مثلاً کسی حلقہ انتخاب میں ساٹھ ہزار رائے دہندے ووٹ دیتے ہیں۔ اور پانچ نشستیں پُر کرنا ہیں تو ساٹھ ہزار کو پانچ سے نہیں بلکہ چھ سے

تقسیم کیا جائے۔ اور حاصل تقسیم یعنی دس ہزار میں ایک کا اضافہ کر دیا جائے تو کم سے کم دس ہزار ایک ووٹ ایک امید وار کی کامیابی کے لئے کافی ہیں دیکھ لیجئے۔ پانچ کامیاب امید واروں میں سے ہر ایک کو اگر دس ہزار ایک ووٹ مل گئے تو کل ۵۰ ہزار پانچ کام آ گئے۔ اور باقی کل ۹۹۹۵ رہ گئے۔ جو اگر سب کے سب بھی صرف ایک امید وار کو ملجائیں تو کسی نشست کو اسے ان پانچ امید واروں سے نہیں دلوا سکتے جن میں سے ہر ایک کو دس ہزار ایک ووٹ ملے ہیں۔

اب اگر کسی فرقہ کے رائے دہندوں کی تعداد تیس ہزار تین سے لے کر چالیس ہزار تین تک ہے تو وہ تین نشستیں ضرور حاصل کر سکتا ہے اور اگر کسی فرقہ کے رائے دہندوں کی تعداد بیس ہزار دو سے لیکر تیس ہزار دو تک ہے تو وہ دو نشستیں ضرور لے جائیگا۔ اور اگر کسی فرقہ کے رائے دہندے دس ہزار سے ایک بھی زائد ہیں تو ایک نشست وہ بھی لے مریگا۔

بظاہر یہ ایک گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے لیکن ووٹ دینے والوں کے لئے اس میں ذرا بھی دقت نہیں البتہ ووٹوں کا ایک امید وار کی طرف سے دوسرے امیدواروں کے نام پر منتقل کرنا جو صرف شمار کنندہ افسر کا کام ہے۔ وہ کسی قدر مشکل ہے جہاں صرف دو فرقوں کا وجود ہے وہاں تو رائج الوقت برطانوی طریقہ انتخاب بھی ایک حد تک کام دے سکتا ہے لیکن جہاں دو سے زیادہ فرقہ ہوں، وہاں برطانوی طریقہ میں اس قدر نقایص ہیں کہ معاذ اللہ اور اب جب کہ برطانیہ میں بھی دو فرقہ کنسرویٹو اور لبرل ہی نہیں رہے بلکہ لیبر بھی اکھاڑے میں کود پڑا ہے اور خم

ٹھونک کر کشتی لڑنے کو تیار ہے تو برطانوی طریقۂ انتخاب ناقابل برداشت ہو گیا ہے
یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارے سامنے صرف یہ مسئلہ نہیں ہے کہ مختلف ملتوں کو واجبی نیابت دلوادیں۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ بھی پیش ہے کہ مختلف ملتوں کو اس طرح شیر وشکر کر دیں کہ مختلف امید واروں کے لئے اس وجہ سے ووٹ نہ دئے جائیں کہ وہ اس ملّت کے رکن ہیں یا اس ملّت کے بلکہ اس وجہ سے ووٹ دئے جائیں کہ وہ سیاسی اصول میں ہمارے ہم خیال ہیں تاکہ نہ انتخاب کے وقت، نہ کامیابی کے بعد، کونسلوں میں ملّتوں کی جنگ وجدل جاری رہے بلکہ سیاسی اصول کی جنگ وجدل ہوا کرے اور سب ایک مشترکہ قومیت کے رنگ میں رنگ جائیں ع

تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

قولِ حق

(ہمدرد ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء)

نہرو رپورٹ شایع ہو چکی ہے۔ محمد علی لندن میں بغرض علاج مقیم ہیں شوکت صاحب اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور سارا اسلامی ہندوستان اس کا مخالف ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی اس طرح ملّت اسلامیہ پر چھائے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر انصاری کانگریس کے صدر ہیں۔ اب موتی لال تخت صدارت پر متمکن ہونے والے ہیں۔ کانگریس آزادی کامل کی بجائے درجہ مستعمرات کو گاندھی جی کی سیادت اور موتی لال کی قیادت میں اپنی منزل مقصود بنا چکی ہے۔

محمد علی لندن سے واپس آئے ہیں۔ عالم اسلام کی سیر کرتے ہوئے کراچی میں انہیں "بہار مسلم کانفرنس" کی دعوتِ صدارت ملتی ہے۔ شوکت صاحب کے اصرار سے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔

ذیل میں پوری اخباری کارروائی درج کی جاتی ہے تاکہ ماحول کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ محمد علی کا خطبۂ صدارت بھی تمام و کمال درج کیا جاتا ہے تاکہ

ان کے تاثرات بھی صحیح صحیح معلوم ہو سکیں۔

مؤلف



آل مسلم پارٹیز کانفرنس صوبہ بہار، محمد علی کی صدارت میں شروع ہوئی۔ پہلے اجلاس کے بعد دوسرے اجلاس کے دن صبح کو مصالحت کی جو گفتگو جناب ڈاکٹر انصاری صاحب صدر مدراس کانگریس اور مولینا محمد علی و مولانا شوکت علی کے مابین عمل میں آئی تھی اسکے کامیاب ہو جانے کے سبب مخالفین بھی سب کے سب شریک اجلاس تھے۔

جلسہ کی کارروائی کے آغاز سے پہلے جناب مولانا محمد شفیع داؤدی نے حاضرین کو مصالحت کی خوشخبری سنائی جسکی تصدیق آنریبل شاہ زبیر نے بھی کی۔ محمد علی نے زبانی خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہا:۔

ممالک اسلامی کی سیاحت کے دوران میں میں ترکی اور اسکے مشہور شہروں مثلاً قسطنطنیہ۔ انگورہ، سمکی شہر وغیرہ گیا۔ پھر وہاں سے شام فلسطین عراق وغیرہ پہنچا۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کی۔

مجھے پہلے تو داخلۂ فلسطین سے روکا گیا۔ لیکن پھر اجازت مل گئی۔ میں تمام راستہ میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ قرآنِ کریم نے تو کہا ہے کہ مرض نفاق کے شکار تو کفار ہیں، اور رہیں گے لیکن کیا وجہ ہے کہ پھوٹ آجکل ہم میں ہے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم سے یہ مرض کبھی دور بھی ہوگا۔ گو میری جسمانی صحت اس قابل نہیں تھی کہ کہیں جا سکتا تاہم اسلامی ممالک کا شوق مجھے کشاں کشاں لے گیا اور میں اس خیال سے کہ ہندوستان میں ایک طرف تو سائمن کمیشن آیا ہوا ہے

اور دوسری طرف مسلم لیگ کا اجلاس ہونیوالا ہے اور آل پارٹیز کانفرنس بھی منعقد ہونے والی ہے۔ اس اہم موقع پر مجھے موجود رہنا چاہئے۔ جلدی کرتا ہوا واپس چلا آیا۔

کہا جاتا ہے کہ دستور خود ہم نے بنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ہی مسلم لیگ کا بانی ہوں اور مسلمانوں کے مفاد کے خیال سے جداگانہ انتخاب کی تجویز بھی میں نے پیش کی تھی۔

میں ابھی راستہ ہی میں تھا کہ صدارت کے متعلق مولینا محمد شفیع داؤدی کا تار موصول ہوا۔ مولانا شوکت علی صاحب نے بھی مجھ سے اسکو قبول کر لینے کے لئے اصرار کیا۔ مثل مشہور ہے کہ "سگ باش، برادرِ خورد مباش"، ناچار قبول کرنا ہی پڑا۔ مجھے راستہ ہی میں اس اختلاف کا حال معلوم تھا جو نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر یہاں رونما ہو گیا تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ کوئی صدارت کا جھگڑا ہے اسلئے میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں اس سے دست بردار ہو جاؤنگا لیکن یہاں آکر پتہ چلا کہ جھگڑا ایک ہی ملک کے اندر دو بادشاہ بننے کا نہیں ہے بلکہ ایک ہی ملک کو دو ملک قرار دینے کا تھا۔ یہ میری بہار، تیری بہار کا جھگڑا میری سمجھ سے باہر ہے۔

حضرات میرا دستور ہے کہ جب میں تقریر کرنے لگتا ہوں تو قرآن شریف کی تلاوت سے شروع کرتا ہوں۔ میں نے ہرگز قاری صاحب سے کسی خاص آیت کے پڑھنے کی فرمایش نہیں کی تھی۔ لیکن حسن اتفاق سے انہوں نے اسی رکوع کی تلاوت کی جو میری تقریر کا موضوع ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس جماعت میں ہر

طبقہ و خیال کے لوگ شریک ہیں وہ بھی ہیں جو حکومت کے باغی قرار پاتے ہیں یعنی قوم پرست، اسی طرح وطن پرست و فرقہ پرور وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ مسلمانوں کی گالیاں کسی نے نہ سنی ہونگی۔ اور اسی طرح جتنی گالیاں میں نے مسلمانوں کو دی ہیں کسی نے اپنی ملت کو نہ دی ہونگی نہ تو مہاتما گاندھی نے نہ پنڈت موتی لال نہرو نے، نہ جواہر لال نہرو نے۔ اور نہ کسی اور نہرو نے۔ اور میں آج بھی گالیاں دینے اور گالیاں سننے کو تیار ہوں

آپ لوگ مجھ سے اور میرے حالات و خیالات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پس سوچئے کہ آپ مجھ سے کس قسم کی بات سننے کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرا مرنا جینا۔ شادی غمی سب کچھ آپ ہی لوگوں کے ساتھ ہے اگرچہ میں کانگریسی ہوں اور ایسا کانگریسی ہوں کہ میرے دل و دماغ، روح و جسم سب ہی کانگریسی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ میرا جنازہ اُٹھائیگی نہ میری چار لڑکیوں میں سے کسی ایک کی بھی شادی کر دیگی۔ کانگریس کبھی مجھے اپنے سے خارج بھی کر دے گی۔ لیکن آپ میری لاش کو اپنے قبرستان سے دھکے دیکر نہیں نکال سکتے۔ جن دنوں آپ سیاسی معاملات میں مجھ سے اختلاف رکھتے تھے اسوقت بھی میں نے آپ سے کہدیا تھا کہ کچھ بھی ہو میں آپ کو چھوڑ نہیں سکتا۔

آج چھ مہینے کی رخصت کے بعد آپ نے مجھے پھر طلب کیا۔ اور میں نے نہایت خوشی کے ساتھ آپ کی طلب پر لبیک کہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے دل کی سنیں، یا یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے دل کی سناؤں بہرحال میں خداوند کریم کو، اور انگریزی جاسوس کو حاضر ناظر جانکر اپنے دل کی بات

کہنا چاہتا ہوں۔ خواہ کوئی صاحب اسکو سیاست سمجھیں یا اقتصادیات سے تعبیر کریں یا کچھ اور قرار دیں لیکن میں تو اسے عین اسلام سمجھتا ہوں۔

میں جن دنوں حجاز میں تھا تو ابن سعود سے بھی کہا تھا کہ تو اپنے بنائے ہوئے قبہ کو توڑ۔ اوروں کے بنائے ہوئے قبوں کو کیوں توڑتا ہے۔ کیونکہ دین کے معاملے میں زبردستی نہیں۔ لا اکراہ فی الدین، قرآن میں آیا ہے۔ قرآن میں جو انسان کو خلیفہ قرار دیا گیا ہے جس پر فرشتوں نے عذر کیا تھا، وہ اسی وجہ سے تھا کہ فطرۃ آزاد ہے۔ خودی کا تو یہ عالم ہے کہ انسان کو اپنے تمام افعال و اعمال کا ذمہ دار بنایا ہے، فعّالٌ لِّمَا یُرِید۔

کیا رسول اللہ صلعم کی یہ دلی تمنا نہ تھی کہ سب مسلمان ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انکو روکا اور سمجھایا کہ کیا تو اس خواہش کے پیچھے جان دیدے گا۔ پس ظاہر ہے کہ جب خدا ہی نے تمام انسانوں کو آپ آزاد پیدا کیا ہے تو میں اپنی رائے پر مجبور کرانے والا کون؟

لیکن یہ ضرور ہے کہ جو بات میری دانست میں حق ہے اسے مع دلائل و براہین آپ کے سامنے پیش کر کے آپ کو قائل کروں گا۔ ماننے نہ ماننے کا آپ کو اختیار ہے۔ میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ اس معاملہ میں یا تو میں غلطی پر ہوں گا یا آپ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں آپ سے جدا نہیں ہوں گا۔ خیال کیجئے کہ کیا ابوجہل اور دیگر اہالیان مکہ کی مخالفت کے باعث رسول اللہ صلعم نے ان کو وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد مدینہ والوں کا خیال ہوا تھا کہ اب رسول اللہ صلعم ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ لیکن کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ لوگ پھر

بکریاں بیچا ئیں گے۔ مگر میں اسی راستہ پر چلوں گا جس پر انصار مدینہ گامزن ہونگے
پس حضرت کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسلئے میری تمام کوششیں
یہی ہونگی کہ سب لوگ ایک کلمۂ حق پر مجتمع ہو جائیں۔

نہرو رپورٹ سے اختلاف ہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ مگر قرآن شریف میں
تو کسی ترمیم کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے میں اسوقت جو کچھ پیش کروں گا۔ وہ
دراصل قرآن شریف ہی کی تفسیر و تاویل ہو گی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ میرا دل و دماغ سب کچھ کانگریسی ہے لیکن پھر بھی
میں کہتا ہوں، اور سب لوگ اسکو سمجھ لیں کہ اسلام دین الفطرۃ ہے جو اس سے
ذرہ بھر بھی ہٹا وہ گمراہ ہوا۔ اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ خواہ مہاتما گاندھی
یا مولانا شوکت علی ہوں خواہ مصطفےٰ کمال ہوں جو لادی اور لاطینی پھیلا رہے ہیں
یا شاہ امان اللہ اور ان کی ملکہ ثریا ہوں جو پردہ کو اٹھا رہے ہیں، اور ہاتھ
کھلے رکھنے کا فیشن اختیار کر رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان اسلام کے جھنڈے کے
نیچے آجائیگا۔ اور سب لوگ مسلمان ہوں گے لیکن جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اس
قسم کی تبلیغ سے جیسی کہ رسول اللہ صلعم کو کرنیکا حکم ہوا تھا جادلھم بالتی ھی احسن
اور یہی بہتر ہے۔ آج جو لوگ ہمارے دشمن ہیں کل وہ دوست ہو سکتے ہیں۔
قرآن کا ارشاد بھی یہی ہے۔ جہاد کا حکم بھی اسلام نے اسیوقت تک کے لئے دیا
تھا کہ فتنہ مٹ جائے۔

قرآن شریف میں فطرت و فتنہ کی دو اصطلاحیں آئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ

فطرت تو سب کی ایک ہے۔ رسول بھی کافروں ہی میں مبعوث ہوئے تھے جو اسقدر متشدد تھے کہ ابن مسعود کو تلاوت قرآن کے جرم میں طمانچوں سے مار کر بیہوش کر دیا تھا لیکن آپ نے رفتہ رفتہ انہیں کفار کو بلا جبر و اکراہ کے مسلمان کر دیا۔ اگرچہ کوئی دو انسان ایک دوسرے سے رنگ و روپ، رفتار و گفتار میں مشابہ نہیں ہے لیکن پھر وہ اتنا مختلف بھی نہیں ہے کہ بجائے انسان کے کتا یا بندر معلوم ہو۔ پس انسان کو اگر فطرت کے خلاف مجبور نہ کیا جائے تو وہ یقیناً اسلام ہی کے اصول پر چلیگا۔

میری فتح تو اس وقت ہوئی تھی جب میری حمایت انتخاب جداگانہ کو دیکھ کر مالوی جی نے ارشاد فرمایا تھا کہ تم اس لئے چاہتے ہو کہ تم انتخاب میں کامیاب ہو سکو۔ تو میں نے اسکا یہ جواب دیا کہ بیشک یہ صحیح ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے ووٹ سے نہیں بلکہ کاشی کے حلقہ سے اور ہندوؤں کے ووٹ سے منتخب ہوؤں اور مالوی جی بھی مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہو کر جائیں۔

مجھکو نہرو رپورٹ سے غرض نہیں وہ صحیح ہو خواہ غلط، لیکن میں آپکو یقین دلاتا ہوں، اور آپ اچھی طرح سن لیں کہ میں انگریزی حکومت کو پسند نہیں کرتا۔ میں ہرگز اس پر راضی نہیں کہ انگریز کا غلام بنوں۔ یہ خلاف اسلام ہے۔ پس جو انگریزی حکومت چاہتے ہیں وہ ضرور ہمارے خلاف ووٹ دیں میں نہ ہندو راج چاہتا ہوں اور نہ مسلم راج بلکہ میں تو سوراج چاہتا ہوں مجھے اسلامی ممالک میں جانے سے بلا وجہ روکا گیا۔ میں اسوقت شام فلسطین ترکی اور عراق وغیرہ کو دیکھ کر آرہا ہوں۔ حجاز سے تو پہلے ہی ہو آیا تھا ان میں سے اکثر ممالک اب دوسروں کے قبضے میں ہیں۔ اگر آپ اسلام کو زندہ

رکھنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی ممالک اسلامی ہی رہیں تو خدا کے لئے ہندوستان کو جسکی بدولت وہ غلام بنائے گئے ہیں آزاد کرائیں۔

عراق میں ہندوستانیوں نے مجھ سے شکایت کی کہ "ہم لوگ یہاں کی ملازمتوں سے علیحدہ کئے جارہے ہیں۔ حکم ہوا ہے کہ عراق میں صرف عراقی ہی ملازم رہیں گے"۔ میں نے کہا بہت درست ہے۔ عراق عراقیوں ہی کے لئے ہے اور ایشیا ایشیائیوں ہی کے لئے ہونا چاہئے۔

اسی طرح ایک پنجابی نے مجھ سے یہ گلہ کیا کہ آپ عراقیوں سے تو ہمدردی کا اظہار فرماتے ہیں لیکن اپنے ہندو بھائیوں کی خبر نہیں لیتے۔ آپ نے ہم سے کبھی دریافت نہیں کیا کہ تم کس حال میں ہو۔ میں نے جواب دیا میں تمہاری حالت سے واقف ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ خدا تمہاری حالت اور بدتر بنادے۔ تم ہی لوگوں نے ان ممالک کو غلام بنایا ہے حجاز والے کبھی مفتوح نہیں ہوئے تھے اور اللہ نے ان پر رسول کی غلامی کا جوا رکھا تھا جس نے ان کو مساوات سکھائی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب بادشاہ یا کسی صوبہ کا گورنر، خود یا اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو دایہ یہ پیغام نہیں سناتی ہے کہ فلاں بادشاہ یا گورنر پیدا ہوا۔ جان، سامی وغیرہ تو انسان کے بنائے ہوئے نام ہیں اللہ نے اسکی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔

یوسفؑ نے اپنے ساتھی قیدیوں سے یہی کہا تھا ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار، ایک خدا کی اطاعت اچھی ہے یا اتنے جدا جدا

لوگوں کی غلامی۔

بہرحال یہی نکتہ تھا جسکو روسیوں نے جب سمجھا تو زار کو نکال دیا۔ یہ زار وہی زار تھا جس کے خوف و عظمت سے لوگ اسکا نام نہیں لیتے تھے، بلکہ اسے زار روس کہا کرتے تھے۔

میری اس بات کو سب سُن لیں کہ میں انگریزی حکومت سے راضی نہیں ہو سکتا۔ مجھے انگریزی قوم سے کوئی بغض نہیں لیکن انکی حکومت سے ضرور عداوت ہے۔

میں نے قیام انگلستان کے دوران میں صرف ایک ہی تقریر کی تھی میں نے حضرت عیسیٰ کی وہ مثال دیتے ہوئے جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ میں صرف یہود (بنی اسرائیل) کو وعظ کہنے آیا ہوں۔ مجھے اوروں سے غرض نہیں ہے، کہا تھا کہ مجھے یہاں کوئی پروپگنڈا نہیں کرنا ہے۔ پروپگنڈا تو تحریک خلافت کے زمانہ میں بہت کچھ کر چکا۔

(۳)

میں نے انگورہ کی سیاحت کے زمانہ میں مصطفےٰ کمال سے کہدیا تھا کہ اس پر فخر نہ کرنا کہ انگورہ ہم نے فتح کیا ہے۔ تم اپنی فتوحات کے لئے ہندوستان کے ممنون ہو۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں ہندوستانیوں نے شط العرب تک پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریزوں نے انکی مدد سے ساری ترکی پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ تم نے اپنی بہادری سے البتہ ایک گیلی پولی میں انہیں شکست دی تھی جہاں ہندوستانی نہ تھے۔ پیرش نے اپنے اثر کو کام میں لاکر لاکھوں والنٹیر

دئے تھے، چنانچہ سر مائکل اڈوائر فخر یہ کہا کرتے تھے کہ پیر اپنے مریدوں پر تعویذ باندھا کرتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان کی برکت سے مسلمانوں کی گولی تم پر اثر نہ کرے گی۔ ظاہر ہے کہ وہ تمہاری گولی کھانے کے لئے ۳۲ کروڑ ہیں لیکن ان کے مقابلے میں تمہارے پاس صرف ۴ کروڑ اشخاص تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ یونانیوں کی امداد کرنے کو آتے تو تمہارے ملک کو اسی طرح فتح کر لیتے۔ جنگ کے اختتام کے بعد صورت حال بہت کچھ بدل گئی تھی۔ لوزان کانفرنس ایک بار ٹوٹ کر دوسری مرتبہ منعقد ہونیوالی تھی۔ اور عصمت پاشا کو حکم مل چکا تھا کہ وہ فلاں فلاں مطالبات پر اڑے رہیں۔ ہندوستان میں تحریک خلافت شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ جمانے کے لئے مسٹر لائڈ جارج نے ہم لوگوں سے امداد طلب کی بلکہ کالونیز (مستعمرات) سے اعانت مانگی۔ ہندوؤں نے ایک موقع پر مسلمانوں سے جاکر لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن وہ ہم مسلمان ہی تھے جو ترکوں سے لڑنے گئے تھے۔ اور اس طرح ہندوؤں نے نہیں بلکہ مسلمانوں نے اپنے دین کو انگریزوں کے ہاتھ بیچا۔

لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں ہیں، سب پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کبھی اور کسی حالت میں بھی خدا کے احکام کے خلاف عمل نہیں کر سکتا۔ چاہے اسکا حکم کانگریس دے۔ خلافت کمیٹی دے یا کوئی اور دے۔

چنانچہ میری نظر بندی کے زمانہ میں مولانا مظہر الحق مسلم لیگ کے صدر تھے انہوں نے چاہا کہ بعض مسائل میں مجھ سے بھی مشورہ کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمود کو میرے

پاس بھیجا۔ میں نے ان سے صاف صاف کہدیا کہ میں اول بھی مسلمان دویم بھی مسلمان، سویم بھی مسلمان، کیونکہ مستحبات الٰہی کی خلاف ورزی میں نہیں کرسکتا لیکن اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آیا جس کا تعلق ہندوستان سے ہو تو میں اول بھی ہندوستانی دویم بھی ہندوستانی اور سویم بھی ہندوستانی ہونگا۔ بلکہ ہندوستانی ہونے کے سوا کچھ نہ ہونگا۔

میں موتی لال سے مصالحت نہ کروں گا۔ کیونکہ انہوں نے ڈومینین اسٹیٹس پر تو مہاراجہ محمود آباد اور حکومت سے مصالحت کرلی ہے لیکن مسلمانوں سے مصالحت نہ کرسکے۔

آجتک ہندوستان میں مجارٹی کی حکومت کبھی نہ ہوئی تھی، نہ ہندوں کے عہد میں پانڈوں کوروں، سری رامچندر، سری کرشن۔ اشوک بدھا، بکرماجیت اور پرتھی راج نے قایم کی، نہ مسلمانوں کے دور میں محمود غزنوی، علاؤالدین خلجی، محمد تغلق، ابراہیم لودھی، بابر، ہمایوں، اکبر وغیرہ نے اور اسی طرح برطانوی حکومت میں رنجیت سنگھ، کلھ ویو، ہسٹنگز ولزلی، کرزن، ریڈنگ اور ارون نے بھی مجارٹی (اکثریت) کی حکومت نہیں بنائی لیکن میں بتائے دیتا ہوں کہ ہندوستان کے آیندہ دستور اساسی کی رو سے جو حکومت قایم ہوگی وہ مجارٹی کی ہوگی لیکن اس صورت میں قیاس کا اقتضا یہ ہے کہ حکومت ہندوں کی ہوگی۔ اقلیت والا بالکل مذبذب ہوگا۔

آج ان کونسلوں میں جہاں ۴۰- اور ۶۰ فیصدی کا تناسب ہے کیا حال ہے۔ ان حالات کے ماتحت اگر اقلیت کچھ تحفظ چاہے تو پھر کس طرح اسے

خلاف فطرت قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم صورت یہ ہے کہ جب صوبہ سرحدی کو اصلاحات دینے کا مسئلہ آتا ہے تو مالوی جی، پنڈت جی ہکو اور مولانا شفیع داؤدی وغیرہ کو اپنی جماعت سے خارج کرتے ہیں۔ مجھے بھی اس معاملے میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

(۴)

سندھ کے مسئلہ کو لیجئے۔ حال یہ ہے کہ اس خطہ پر انگریزوں نے ۱۸۴۹ء سے قبضہ کیا تھا۔ لیکن اگر بمبئی سے پہلے یہ قبضہ میں آیا ہوتا تو یقینی اس سے علیحدہ ہوتا اب جب کبھی اسکو مستقل صوبہ قرار دیئے جانے کا مطالبہ ہوتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ اسکی اقتصادی حالت اس امر کی مقتضی نہیں لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بمبئی کے خزانہ سے تو روپے دیئے جائیں۔ لیکن دہلی کے مرکزی خزانے سے نہ دیئے جائیں۔ پھر یہ کہاں کی دیانت ہے کہ غریب کو محض اسلئے غلام بننے پر مجبور کیا جائے کہ وہ غریب ہے۔

نہرو رپورٹ میں صوبوں کو کامل آزادی نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ دہلی کی مرکزی حکومت کو ان پر مسلط کیا گیا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ حکومت کے لیئے یہ شرط قرار دی جائے کہ حکومت کا اہل وہی ہوگا جو وید جانتا ہو اور ظاہر ہے کہ وید برہمن جانتے ہیں تو کیا حکومت محض اس بنا پر برہمنوں کو دینا کوئی مستحسن کہے گا۔

آج سکھ ۴۰ فیصدی مالگذاری کے مدعی ہیں اور اسی بنا پر مزید نیابت کے طالب ہیں۔ لیکن کوئی پوچھے کہ یہ زمین تمہارے ہاتھ کیسے آئی ؟

بات یہ ہے کہ یہ زمین دراصل مسلمانوں ہی کی ہے، جسے رنجیت سنگھ نے مسلمانوں سے جبراً چھین لیا تھا۔ ان لوگوں نے گائے کی قربانی کی بھی ممانعت کر دی تھی۔ حتیٰ کہ آج بجز انبالہ کے کہیں قربانی مذبح میں لیجائے بغیر نہیں ہوتی۔ بہار کے بھی اکثر مواضعات کا یہی حال ہے کہ پارسال جہاں قربانی ہوئی تھی اس سال وہاں ممنوع قرار پاتی ہے اور محض اس عذر پر کہ فساد کا اندیشہ ہے۔

امریکہ میں شراب کی قطعاً ممانعت ہے اب وہاں کوئی بھی شراب استعمال نہیں کرتا لیکن اسلام بہت عادل ومنصف واقع ہوا ہے اس نے شراب کی ممانعت صرف مسلمانوں تک ہی محدود ورکھی ہے۔ کفار کو ہر طرح اجازت دے رکھی ہے زنا۔ چوری۔ شراب نوشی۔ قتل وخونریزی کے ارتکاب پر مسلمانوں ہی کی گردن ناپی جائیگی لیکن ان سب باتوں کے مکلف ہم کیوں ٹھہرائے گئے محض لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے پڑھنے کے باعث، اور آج اگر اسکو چھوڑ دیں تو پھر کسی بات کے بھی مکلف نہیں رہتے لیکن نتیجہ کیا ہوگا جہنم۔ یہ اسلام کی رواداری کا بین ثبوت ہے لیکن جب سکھوں کی حکومت پنجاب میں قایم ہوئی تھی تو انہوں نے اسکی پابندی مسلمانوں سے جبراً کرائی تھی۔

میں جن دنوں میں انگلستان میں تھا تو وہاں کے رصدخانے میں مریخ والوں سے گفتگو کی کوشش جاری تھی۔ لیکن اگر واقعی مریخ میں کوئی آبادی ہے تو وہ لوگ دوربین کی مدد سے دیکھتے ہوں گے۔ طلوع آفتاب سے پہلے جبکہ ساری دنیا خواب کے مزے لیتی ہوتی ہے، ایک قوم اُٹھتی ہے اذان دیتی ہے۔ وضو کرتی ہے اور

پھر نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسوقت کسی کا منہ مشرق کی طرف ہوتا ہے کسی کا مغرب کی طرف۔ کسی کا شمال کی طرف۔ کسی کا جنوب کی طرف لیکن اس اختلاف کے باوجود حیرت سے دیکھتے ہوں گے کہ مرکز سبھوں کا ایک ہے یہ اس لئے کہ ہم کو حکم ملا ہے اتخذوا من مقام ابراھیم مصلے اس کا خاص مقصد وحدت و اتفاق کی تعلیم تھا۔ آجکل مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جنگ برپا ہے۔ حنفی۔ شیعہ۔ وہابی۔ مقلد، غیر مقلد وغیرہ کا جھگڑا ہے اور لڑائی بھی ذرا ذرا سی باتوں پر ہے مثلاً پاؤں کتنا پھیلایا جائے تاکہ ٹخنے سے ٹخنہ ملا رہے ان نادانوں کو معلوم نہیں کہ ٹخنے سے ٹخنہ ملانے کا حکم اتحاد ہی کے لئے دیا گیا تھا۔

نماز کیا ہے؟ ایک فوجی پریڈ کے مشابہ ہے جس میں امام کے حکم پر مقتدی سر اطاعت خم کرتے ہیں۔ شاہ امان اللہ نے فوجی پریڈ کی نسبت کہا تھا کہ "ایں ہمہ در میدان جنگ بکار نہ آید"۔ لیکن یہ غلط ہے افسر کے لفٹ رائٹ سے سپاہی اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ میدان حرب میں باوجود بیحد تھکے ماندے ہونے کے جبکہ اعضا اسقدر شل ہو جاتے ہیں کہ نقل و حرکت تک دشوار ہو جاتی ہے پھر بھی افسر کی اس صدا پر خود بخود اس حکم کی تعمیل کر بیٹھتے ہیں اور اسطرح گولیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

نماز کا بھی یہی حال ہے اور ہر نمازی ایک خاص سپاہی ہوتا ہے مسلمانوں میں آجکل نفاق و شقاق کا مرض اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی جان و مال پر حملہ کرتے رہتے ہیں حالانکہ اسلام کا حکم ہے کہ "سباب المسلم فسق و قتالہ کفر"۔ یعنی مسلمانوں سے سخت کلامی بدکاری ہے

اور اس سے لڑنا کفر۔

نان کو آپریشن کے زمانے میں ہم لوگوں نے برادران وطن سے کچھ کم قربانی نہیں کی تھی جسکی وجہ یہ تھی کہ قربانی ہمارا دینی شعار ہے۔ غور کیجئے کہ جب ہم جانور ذبح کرتے ہیں تو اسکا گوشت پوست خدا کے یہاں نہیں پہنچ جاتا۔ بلکہ ہمارا تقویٰ ہے کہ جو اس ذریعے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے گلے پر بحکم الٰہی چھری چلائی اور اسی کی یادگار آج ہم حج کے موقعہ پر مناتے ہیں۔ پس یہ جو لاکھوں جانوروں کے گلے پر چھری چلائی جاتی ہے اس میں یہ راز مضمر ہے کہ ہم ضرورت کے وقت اسی طرح جان و مال اور عزیز و اقارب کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ الحاصل روزہ نماز اور اسی قسم کے دیگر مذہبی شعائر اجتماع کے اصول ہیں۔

ہندوؤں کی ذہنیت بالکل خراب ہو گئی ہے اور اسکی مجھکو شکایت ہے کہ مجھ سے نہرو رپورٹ میں ترمیم کرنے کی خواہش کی گئی ہے لیکن مجھ کو اسکی ضرورت نہیں۔ ان کو ایک نہ ایک دن خود اس میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ میں جب علاج کے لئے یورپ گیا ہوا تھا تو میرے معالج ڈاکٹر نے مجھے بیماریوں کی نسبت بتلایا تھا کہ ان کی تعداد ۶۰۰۴ ہے۔ لیکن جو لوگ قدرتی اصول پر علاج کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مرض کی دراصل ایک ہی قسم ہے اور وہ عدم صحت ہے اور اس کا اصول علاج فطرت پر لوٹ آنا ہے۔ یہی حال اس ہماری کانفرنس کا ہے جس میں نہرو رپورٹ تیار کی گئی ہے۔ وہ بیمار تھی اور یہ ہماری عدم صحت کی وجہ تھی۔ میرا مطلب اس سے اسکی ذہنیت ہے۔ چنانچہ اس نے

رپورٹ کو اس طرح مرتب کیا ہے۔ اور اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے
کہ کسی صوبہ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت قایم نہ رہے۔ اور اگر کہیں رہے بھی تو بے
اثر ہو کر رہے۔ چنانچہ اس غرض سے ایک مرکزی مجلس مقننہ بنائی ہے اور یہ ویسی
ہی ہے جیسی کہ انگلستان میں ہاؤس آف لارڈز (دارالامرا) ہے کہ اگر کبھی دارالعوام
میں کسی جماعت کی اکثریت ہاؤس آف لارڈز میں اُسے مسترد کر دیتی ہے۔

یہ بات طے کر لی گئی ہے کہ پنجاب بنگال اور سندھ وغیرہ میں اگر کثرت
ہوئی بھی تو کیا ہوا۔ اسمبلی میں اکثریت کے بل بوتے پر ضرور شکست دیں گے۔
میں ہندوؤں کو مشورہ دیتا ہوں کہ باہمی اشتراک عمل سے سوراج حاصل کرنا
چاہتے ہو تو ذہنیت بدلو۔ آج ہندو کتنے ایسے ہیں جو قوم پرور ہونے کا دعویٰ
کرتے ہیں لیکن وہ فی الحقیقت ملت پرست ہیں۔ اسی طرح بہت سے مسلمان
ہیں جو ملت پرست ہونے کے تو مدعی ہیں لیکن ہیں در اصل نفس پرور۔
مہاتما گاندھی نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ کم از کم جو مطالبہ ہم پیش کر سکتے
ہوں وہ ایک بار پیش کر دیں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے دہلی میں اپنا کم سے کم مطالبہ
پیش کیا جسکو کلکتہ کی مسلم لیگ اور مدراس کی کانگریس نے بھی منظور کیا۔

جس طرح ترک، افغانی، یا ایرانی، کو اپنے ملک کی ایک انچ زمین پر
قبضہ کرنیکا روادار نہیں، اور نہ افغانی یا ایرانی ترک کو یا کسی دوسرے کو
اپنے ملک پر قابض ہونے دینا گوارا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی ہندوستانی
راج کے سوا اور راج تسلیم نہیں کر سکتا۔

ہندوستان سے رسول اللہ صلعم کو محبت تھی، اور اس بنا پر میرا

دلی عقیدہ ہے کہ یہاں کے لوگ ایک نہ ایک دن اسلام کی آغوش میں آجائینگے لیکن زبردستی اور قوت کے زور سے نہیں بلکہ تبلیغ کے ذریعے سے جس طرح اگلے بزرگان دین نے کی تھی اور خود بہار کے جنگلوں میں آپ کے مخدوم، اور دیگر اولیاء کرام نور اسلام پھیلاتے تھے۔ ملوکیت کی خاطر ملکوں کی تسخیر اسلامی اصول کے خلاف ہے۔ ہم نے دنیا کو حکومت کرنے کے لئے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اسلامی عقاید کی تعلیم دینے کے لئے اور گمراہی سے نکالکر نور ہدایت میں لانے کے لئے۔ چنانچہ آج بالشویک اسی اصول پر قایم ہیں۔ ملکوں کی تسخیر تو رہی ایک طرف انہوں نے بخارا وغیرہ کی طرح بہت سے ملکوں کو آزاد کر دیا ہے انہیں سب سے بڑی فکر اس بات کی رہتی ہے کہ سب لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنائیں۔ آج ہمیں بھی اسی رواداری سے اسلام کی تبلیغ کرنی چاہئے۔ جن نیچ ذات والوں کو برہمن ذلیل کیا کرتے ہیں ہم ان کی خدمت کریں انہیں دائرۂ اسلام میں لاکر اپنی لڑکی انکو دیں ان کی لڑکی ہم لیں اور ہر معاملات میں مساوات عطا کریں۔

میں ہندوؤں کو بتائے دیتا ہوں کہ میں محض ان کی خاطر سے ان کا دھرم قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں لیکن اس کے باوجود اگر مجھے یقین ہو جائے کہ ہندوؤں کا غلام بنے بغیر انگریزوں کی غلامی سے ہرگز چھٹکارا ممکن نہیں تو میں ہندوؤں کی غلامی کو ترجیح دوں گا۔ کثرت و قلت سے خوف کھانا مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے۔ ہمارے آباواجداد ایک خدا کو ماننے کے باوجود تین خداؤں سے خائف نہ تھے۔ قرآن میں مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے انتم الاعلون

ان کنتم مومنین،، ظاہر ہے کہ اکثریت و اقلیت کو کامیابی کا باعث نہیں بنایا گیا ہے۔ ایمان ہی کو سبب قرار دیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ایک مسلمان کئی کئی کافروں پر بھاری ہے۔ پس کیا تعجب کی بات نہیں کہ ہم ہندوؤں کے ظلم کی شکایت کرتے ہیں حالانکہ یہ کام ہندوؤں کا تھا۔ کیا بدر، احد، خندق، وغیرہ میں کافروں کی تعداد سے ہماری تعداد بے حد قلیل نہ تھی۔ ؟

میں ہندوؤں کی خوشامد نہیں کروں گا۔ بلکہ میں مجارٹی میں ہوتا تو جو وہ مانگتے دے دیتا۔ آج مسلمانوں کے علماء و لیڈر بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں اور طاقت و لسانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ میں ان کا ساز ور کلام کہاں سے لاؤں کیونکہ نہ میں کلام کا بیٹا نہ کلام کا باپ۔

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کا ہمیشہ خدا پر بھروسہ رہا ہے اور وہ ایک خدا پر ایمان رکھ کر تین تین خدا والوں پر ہمیشہ غالب رہے ہیں۔ اسی بناء پر میں مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ خدا پر بھروسہ رکھ کر ہندو راج قبول کرلیں۔

مسٹر محمود نے اپنے خطبۂ صدارت میں لکھا ہے کہ قبل میں دستور تھا کہ جب کسی بات کا اعلان کرنا ہوتا تھا تو پہلے یہ کہا جاتا تھا" خلق خدا کی ملک انگریز کا حکم کمپنی بہادر کا،، اسی طرح نہرو رپورٹ کا بھی خلاصہ ہے "خلق خدا کی، ملک وائسرائے کا، حکم مہا سبھا بہادر کا،،

میں ڈومی نین اسٹیٹس کا دم لگانا پسند نہیں کرتا۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ کامل آزادی اور درجہ نو آبادیات دونوں ہم معنی ہیں وہ جھوٹ کہتا ہے

دوسرے ڈومینین کی حالت یہاں کی حالت سے بدلی ہوئی ہے۔ کناڈا کا حال یہ ہے کہ وہ امریکہ کی جمہوریت (یونائیٹڈ اسٹیٹس) سے متصل ہے۔ دونوں کا کلچر (تمدن) ملتا جلتا ہے۔ اور اس لئے انگریزوں کو اس بات کا ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ ان سے مل نہ جائیں۔

آسٹریلیا میں سب ان کے بھائی ہی نہیں مادرزاد بھائی بستے ہیں وہ دوسری قومیت والے عیسائیوں کو گھسنے ہی نہیں دیتے۔ افریقہ کے بور وار کی وجہ سے درجۂ نوآبادیات دینی پڑی۔ کیونکہ بور دراصل مفتوح نہیں ہوئے تھے۔ اور یہ نوآبادیات دراصل ایک قسم کی آزاد سلطنتیں ہیں انگریزوں کا اثر ان پر برائے نام ہے۔

میں یونین جیک جس پر صلیب کا نشان ہے ہرگز پسند نہ کرونگا کیونکہ یہ قومی خصوصیت کو فنا کر دینے والی ہوگی۔

حاتم طائی کے پاس ایک سیب تھا۔ اسلام لانے کے بعد محض یہ سوچکر کہ ایک زیور ہے جو پہننے میں خوشنما معلوم ہوتا ہے، وہ اسکو لگائے ہوئے رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوئے لیکن آپ نے ان سے یہ شئے اتروالی۔

میں ہر بات میں مصالحت اور رواداری برتنے کو تیار ہوں چنانچہ جن دنوں مہاتما گاندھی نے کفارے کا برت رکھا تھا تو میں نے انہیں توڑ دینے کا مشورہ دیا تھا۔ جب انہوں نے برت چھوڑا تو میری بیوی نے ان کو خوش کرنے کے لئے قصاب کے ہاں سے خرید کر ایک گائے نذر کی تھی اور اسی دن سے گھر میں گائے کا گوشت نہیں پکوایا۔ دعوت میں باہر ضرور رکھا جاتا ہو

شخصیات

فہرست مضامین



۱ بی اماں ۲۲۸

۲ سید رشید رضا ۲۳۳

۳ فعل فیصل ۲۵۳

۴ غازی امان اللہ خاں ۲۶۵



بی اماں

(ہمدرد۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۲۴ء)

علی برادران کی والدۂ محترمہ کا نام آبادی بیگم تھا۔ چونکہ علی بھائی انہیں،
"بی اماں" کہتے تھے اس لئے وہ سارے ہندوستان کی بی اماں مشہور ہوگئیں، ا
بڑی شیر دل خاتون تھیں۔

مضمون ذیل، مولینا محمد علی نے انکی خطرناک علالت کے موقعہ پر لکھا تھا۔ جو بعد
میں مرض الموت ثابت ہوا۔ اس سے جہاں بی اماں مرحومہ کے خصائص اور عادات
پر روشنی پڑتی ہے۔ وہاں یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہمدرد، اور کامریڈ کا دور ثانی
جو ۱۹۲۴ء کے آخر میں شروع ہوا تھا۔ محمد علی کے لئے کس درجہ جاں گسل اور روح
فرسا تھا ا وہ

"خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"

کے صحیح مصداق تھے۔ سارے کام انہی کو کرنا پڑتے تھے۔ قیادت، اور صحافت کی
مشترکہ ذمہ داریاں بغیر کسی رفیق اور معاون کے وہ تن تنہا اپنے دوش ناتواں کندھوں پہ
اٹھائے ہوئے تھے،

(مؤلف)

محترمہ بی اماں، ایک عرصہ سے مبتلائے علالت ہیں۔ انکی بیماری مارچ ۱۹۲۴ء

میرٹھ سے شروع ہوئی تھی، جس کا سلسلہ ابتک برابر جاری ہے۔ اور درمیان میں دو

دفعہ تو بالکل مایوسی ہو چکی تھی۔ آج بھی سخت خطرناک حالت ہے۔ بھائی صاحب (مولانا

شوکت علی) کے ساتھ سندھ کے دورے پر تشریف لے گئی تھیں۔ وہاں سے پولٹیکل

کانفرنس کی شرکت کے لئے میرٹھ آئیں۔ یہاں پہنچکر ان کو آمنہ مرحومہ کی تشویش

ناک علالت کا تار ملا۔ میرٹھ سے کوئی ٹرین اسوقت نہیں جاتی تھی۔ اس لئے موٹر پر

غازی آباد تک سفر کیا۔ اور باوجود بھائی صاحب کے اصرار کے برقعہ کے سوا کوئی گرم

کپڑا نہ اوڑھا۔

علی گڑھ شب کو پہنچیں، اور دیر تک صحن میں بیٹھی رہیں جسکی وجہ سے طبیعت

خراب ہو گئی۔ آمنہ نے انکو آواز دی تو بلانے کے لئے جو شخص ان کے پاس گیا اس نے

انکو بیہوش سا پایا۔ اس کے دو روز بعد آمنہ کا انتقال ہو گیا۔

اس عرصہ میں بی اماں کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تو غسل کر ڈالا جس سے

پھر طبیعت بگھر گئی۔ اسی حالت میں انکو بغرض علاج دہلی لایا گیا۔ میں نے مزاج پرسی

کی تو فرمایا کہ تو تو میرے ساتھ ہی آیا ہے۔ حالانکہ میں پہلے آچکا تھا۔ اس کے بعد پہلے

مسوری۔ پھر رامپور چلی گئیں۔ وہاں جا کر طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہم

لوگ فوراً رامپور گئے۔ مگر کئی دن تک بوجہ امتناعی احکام کے رامپور میں داخل نہ

ہو سکے اور اسٹیشن ہی پر پڑے رہے۔ بی اماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے بچے مجھ سے

اور میں اپنے بچوں سے نہیں مل سکتی تو وہ اسی حالت میں اسٹیشن پر چلی آئیں اور اصرار

کیا کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ مجبوراً انکو دہلی لانا پڑا۔ یہاں ڈاکٹر

انصاری کا علاج ہوتا رہا۔ اور قدرے طبیعت سنبھل گئی۔ کہ کمرے سے کسی پر سہارا دیکر برآمدے یا صحن میں آجایا کرتی تھیں۔ مگر اب پھر صاحب فراش ہو گئی ہیں۔ اور پرسوں تو اسقدر طبیعت خراب ہو گئی تھی کہ بالکل مایوسی ہو گئی۔ اسلئے بھائی صاحب اور اعزہ کو تار دینے پڑے۔

بی اماں کی عمر گو اسوقت ۷۳۔ ۷۴ برس کی ہے۔ مگر قویٰ ایسے نہ تھے کہ بیماری انکو اس طرح اپنے قابو میں کر لیتی وہ بڑی باہمت اور عزم کی بیکیفیت ہے کہ ہم لوگوں کو جیل جانے کے بعد انہوں نے سارے ملک کا دورہ کیا جلسوں میں شریک ہوئیں۔ اور تقریریں کیں۔ اور جب تک ہم لوگ رہا نہیں ہو گئے برابر اور مسلسل کام کرتی رہیں۔ اور جب بھائی صاحب رہا ہو کر آئے تو باوجود کمزوری و ضعف کے پھر ان کے ساتھ دورہ پر چلنے کے لئے آمادہ ہو گئیں۔ بھائی صاحب نے منع بھی کیا کہ اب ہم لوگ آ گئے ہیں اور پوری ہمت و مصروفیت کے ساتھ قومی کام کریں گے۔ آپ کو اب دن رات کے سفر اور دورہ کی ضرورت نہیں آپ آرام کیجئے اور مطمئن رہئے کہ ہم کوئی دقیقہ ملک و مذہب کی خدمت گزاری کا اٹھا نہ رکھیں گے مگر بی اماں نے نہ مانا اور فرمانے لگیں کہ تو مجھ پر رشک کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک و قوم کی خدمت نہ کر سکے۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو گا کہ گھر پر پڑی رہوں۔ اور اپنے ملک اور مذہب کی کوئی خدمت نہ کروں۔

غرضکہ مجبوراً بھائی صاحب کو اپنے ساتھ صوبۂ سندھ کے دورہ پر لیجانا پڑا۔ جہاں ہر جلسہ میں شرکت کی اور تقریریں فرمائیں۔

اصل یہ ہے کہ ان کو اپنی عمر میں غیر معمولی صدمہ اٹھانے پڑے ان کو

اپنے بچوں سے جو تعلق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت جلد بیوہ ہوگئیں، اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا تمام بار انہی کو اُٹھانا پڑا اس سے غیر معمولی تعلق انہیں پیدا ہوگیا۔ اور ان کی اولاد پر جو مصیبت آئی۔ اس سے بہ نسبت ان کے بچوں کے وہ زیادہ متاثر ہوئیں۔ پہلی نظر بندی کے بعد سے دوسری قید فرنگ تک بھی کچھ قوت باقی تھی لیکن مقدمۂ کراچی کے بعد، گو ہمت بڑھ گئی کہ تمام ملک کا دورہ کیا اور اسطرح ہم لوگوں کے کام کو جہاں تک ان کے امکان میں تھا، سنبھال لیا مگر ضعف و کمزوری برابر بڑھتی گئی۔ یہانتک کہ ریل کی سواری اور قیام گاہوں سے جلسہ گاہوں تک کا پیدل سفر کرنا بھی دشوار ہوگیا۔ بلکہ کرسی پر بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر کمزوری نے مجبور کر دیا۔

اب کیفیت یہ ہے کہ شرائین موٹی پڑگئیں جس سے خون کا دوران صحیح نہیں ہوتا۔ اور سارے جسم میں درد ہے۔ یہ ایک ایسی مصیبت کا اضافہ ہے جو کامریڈ و ہمدرد کی الجھنوں کے ساتھ ملکر بہت زیادہ وزنی ہوگئی ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ کامریڈ و ہمدرد کی مصروفیتوں کی وجہ سے میں پوری طرح خدمت بھی نہیں کرسکتا۔ اور بمشکل ایک دو دفعہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے حاضر ہوسکتا ہوں حالانکہ مجھے شب و روز یہی سعادت اندوزی کے لئے وقف کر دینے چاہئیں۔

بی اماں کی اب یہ خواہش باقی ہے کہ وہ سوراج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی موجودہ حالت نے بھی ان کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا ہے۔

سید رشید رضا

(ہمدرد ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

موتمر اسلامی میں محمد علی کو بعض شخصیتوں کے بارے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے ہیں۔

محمد علی کو علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر سے بڑی امیدیں تھیں، ان کا خیال تھا کہ علامہ موصوف ملوکیت پر جمہوریت کو ترجیح دیں گے لیکن جس طرح ہندوستان کے مولانا ظفر علی خاں وغیرہ سلطان کی ملوکیت کے حامی تھے اسی طرح سید رشید رضا صاحب بھی سلطان کی ملوکیت کے زبردست حامیوں میں تھے۔

سید صاحب، اپنے علم و فضل کے اعتبار سے عالم اسلام کی ممتاز ہستیوں میں تھے۔ انہوں نے اپنے مضامین و کتب کے ذریعے اسلام کی بڑی گراں بہا خدمتیں انجام دی ہیں لیکن آدمی تھے اور غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں ان سے چوک ہوئی اس سلسلہ میں محمد علی کے تاثرات یہ ہیں۔

عضو۔ عربی میں رکن کو کہتے ہیں — مؤلف

موتمر اسلامی میں منجملہ اور نامزدگان سلطان ابن سعود کے سید رشید رضا صاحب مالک و اڈیٹر المنار بھی تھے جسے وہ عرصہ سے مصر سے نکال رہے ہیں اور ان کی شان امتیاز قایم رکھنے کے لئے سلطان نجد نے انہیں بجائے مصر یا عسیر یا شام سے نامزد کرنے کے "عضو مخصوص" کا لقب عطا فرمایا تھا۔

موتمر کے انعقاد سے پہلے بھی اور اس کے دوران میں بھی سید صاحب موصوف حرم شریف میں سلطان نجد کے مذہبی اور سیاسی عقاید کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے اور نجی کی ملاقاتوں میں بھی آپ کا وہی مشغلہ تھا جسے اب مشرقی دنیا اور اسکے علماء بھی "پروپاغنڈا" کے عسیر التلفظ نام سے پکارتے ہیں۔

بیت باناجہ میں جو مجلس موتمر سے قبل بدعات وخرافات کے محو کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ حالانکہ پہلے جلسے میں اسکے صدر بظاہر خود سلطان نجد تھے اور شیخ عبداللہ بن بلیہد نجدی قاضی القضاۃ مکہ مکرمہ کے آنے کے بعد وہ بھی شریک صدارت ہو گئے تھے۔ اور روما کے امپراطور اور پاپائے اعظم دونوں کے مثیل سریر آرائے مجلس مباحثہ تھے۔ تاہم اس کے روح رواں سید رشید رضا صاحب بھی تھے۔ اور دوسرے دن جب سلطان کی غیر حاضری میں مجلس کا انعقاد ہوا تو سید صاحب موصوف کچھ اس طرح کارگزاری کر رہے تھے کہ سب کو آپ ہی کی صدارت کا شبہہ ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ کوئی صدر منتخب نہیں ہوا تھا اس فروگذاشت کا حاضرین جلسہ کو یاد دلانا مناسب سمجھا گیا۔ اس پر غالباً سید صاحب ہی نے ایثار سے کام لیکر شیخ عبداللہ بن بلیہد کا نام پیش فرمایا۔ اور جب سب نے مخالفت نہ کرنے ہی میں مصلحت جانی اور شیخ صاحب کا انتخاب عمل میں آگیا اور اس پر

بھی سید صاحب ہی تمام کارروائی کرتے رہے تو راقم الحروف کو ان دعوے داران توحید کو یاد دلانا پڑا کہ اس جلسہ کا صدر بھی واحد ہے۔ جس پر مولانا ثناء اللہ صاحب نے مسکرا کر اور سید صاحب کی طرف دیکھ کر " فیه اشارة " اور وفد جمعیت العلماء کے ایک رکن نے " لا بل فیه الصراحة " فرمایا۔ سید صاحب علالت کے باعث حج سے پہلے موتمر میں شریک نہ ہو سکے اور کسی وجہ سے صدر منتخب نہ ہو سکے۔ تاہم بعض اصحاب نے آپ کا نام نائب صدر کے دو عہدوں میں سے ایک کے لئے پیش کیا۔ مگر سید سلیمان صاحب ندوی اور ضیاء الدین صاحب روسی کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور سید صاحب "عضو مخصوص" کے امتیاز سے زیادہ کوئی شے حاصل نہ کر سکے۔ حج سے پہلے بھی جزیرۃ العرب کی آزادی کے مسئلہ میں سید صاحب نے ہماری تجویز سے اختلاف کیا تھا اور زمیم کے نام سے ایک میثاق ملی تیار کیا تھا۔ مگر وہ بھی نامنظور ہوا۔ اور آپ نے اس کے منظور کرانے کے لئے کچھ زیادہ کوشش بھی نہ کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت اخرجوا الیھود والنصٰریٰ من جزیرۃ العرب کی طرف اشارہ کرنے سے بھی اور نیز حدود جزیرۃ العرب کے بیان کرنے سے آپ کو خاص چڑ تھی۔ مگر جب عقبہ اور معان کو حدود حجاز میں داخل کرنیکی تحریک خود آپ نے پیش فرمائی تو اسی وصیت کی طرف اشارے کی تلخی کو گوارا فرمالیا گیا۔

جب راقم الحروف نے حجاز میں فرقہ ہائے اسلامی کے لئے مذہبی آزادی کی تحریک پر تقریر کی، اور حاضرین سے استدعا کی کہ حرب العقاید کو بند کیا جائے اس لئے کہ ہمیں ابھی اس جنگ سے نجات نصیب نہیں ہوئی جس میں

کفار یورپ مسلمانوں کے برخلاف نبرد آزما ہیں تو آپ نے دوران تقریر میں حسب معمول مجھے ٹوکا۔ اور بڑے استعجاب سے پوچھا کہ اختلاف عقاید کہاں ہیں اس تجاہل عارفانہ پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے پوچھا کہ اختلاف عقاید نہیں ہے تو یہ قبے مسمار کیوں کئے جا چکے ہیں اور یہ قبریں کیوں توڑی گئی ہیں ماثر کی شکست وریخت کیوں کی گئی ہے۔ حاجیوں کو انت مشرک کیوں کہا جا رہا ہے سگریٹ پینے پر کیوں ہر نجدی حد غیر شرعی قایم کرتا ہے مصری محمل کو صنم کیوں کہا جاتا ہے۔ مصری فوج کے بگل بجنے پر مصری فوجیوں کو کلوخ اندازی کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے۔ اور منحر اسمٰعیلؑ کے قریب مسلمانوں کا خون کیوں بٹتا ہے۔ زمیندار کے پیہم اعتراضوں کے جواب میں اتنا ہی لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہم جتنی تحقیقات کر سکتے تھے کی گئی۔ اور مصری پاشا کا بیان سچا ثابت ہوا۔

ہوا خواہان حکومت نجدی کے بیان ایک دوسرے سے اتنے مختلف اور اتنے متضاد تھے کہ ان سے مصری پاشا کے بیان کی تصدیق و توثیق کے سوا ہم پر کوئی اثر نہ پڑ سکا۔ حکیم نورالدین صاحب نے بھی اکثر اور اہلحدیث حضرات کی طرح نجدیوں کی طرفداری کا بیڑہ اٹھایا ہے اور مصری بگل کو " بالنسری " بنا دینے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے "خشکہ با بر دزہ، اگرچہ گندہ مگر ایجاد بندہ" سچ کس طرف ہے اور جھوٹ کس طرف، اس کا فیصلہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مصریوں نے تو واقعہ محمل کے بعد آیندہ محمل اور صدقات مصر کا اسوقت تک بھیجنا ملتوی کرنا چاہا جب تک کہ حجاز کے لئے ایک مناسب تشکیل حکومت عمل میں نہ

آجائے۔ مگر سلطان نجد نے اپنے ولیعہد امیر سعود کو آنکھوں کے علاج کے لئے مصریوں کا مہمان بناکر بھیجنے اور ان کی ہر طرح تالیف قلوب ہی کو مناسب جانا اگر مصری پاشا کا بیان غلط تھا تو بالصراحت اسکی تردید خود سلطان نجد نے کیوں نہ کی؟ جہانتک مجھے علم ہے یوسف لیسین صاحب اڈیٹر ام القریٰ کے ایک لچر و پوچ مضمون کے سوا اس بارے میں کوئی چیز بھی حکومت کی طرف سے شایع نہیں کی گئی۔ میں اسکا بھی قائل نہیں ہوں کہ نجدیوں اور سلطان نجد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا ورنہ چار سو مصری سپاہیوں کی ۹۵ ہزار نجدی فوج کے سامنے حقیقت ہی کیا تھی۔ جہاں ۹۵ ہزار کہا گیا وہاں پورے لاکھ کہدینے میں کیا ہرج تھا؟

نجدی فوج ۹۵ ہزار کیا، شاید کل حجاز میں ۵۰ ہزار بھی نہ ہو۔ جو ٹڈی دل نجد سے آیا تھا وہ حجاز کا تھا۔ اور گو بعض قوموں کی طرح ہر بالغ نجدی مرد ایک سپاہی کا کام دے سکتا ہے۔ مگر جہانتک میں نے دیکھا نہ سب کے پاس بندوقیں تھیں نہ ان کا بڑا حصہ جنگی قواعد پریڈ سے واقف تھا۔ یہ مصری فوج کو بھون کر کھا لینے کے لئے غالباً یہ سب کافی تھے، مگر مصری جس طرح اپنے محمل اور اپنی جانوں کی حفاظت میں نہ جھجکے اور سلطان نجد کے اظہار لاچاری کے بعد جس طرح پاشائے مصر نے اس ٹڈی دل کی پروا نہ کرکے حملہ آوروں کو پسپا کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو چار سو مصریوں کو شاید یہ نجدی غول بھون کھاتا تاہم اس سے پہلے مصری، نجدیوں کا بھی بھاڑ بھون دیتے۔ توپ اور رکلدار بندوقوں، اور دیگر جدید اسلحہ جنگ اور تربیت یافتہ فوج اگر تھوڑی بھی ہو تب بھی ایک غیر منظم

گنوار دل کو بہت کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سلطان نجد نے دانشمندی سے کام لیا اور اس جھگڑے کو آگے نہ بڑھایا۔ اگر وہ مصری فوج پر باقاعدہ دھاوا بول دیتے تو کوئی تعجب نہیں بلکہ سلطان نجد کی مسلح فوج جسکی ایک خاص وردی ہے گو وہ عام نجدی لباس سے بہت زیادہ ممیز نہیں۔ مصری فوج پر حملہ آور ہوتی تو ایک گھمسان کی لڑائی اسی وقت چھڑ جاتی اور اگر سب کے سب سپاہی مار بھی ڈالے جاتے تب بھی تو یہ یقینی تھا کہ مصری قوم اور مصری حکومت اور "زمیندار" کے نزدیک وہ "ہم بے سمی" یعنی عالم اسلام اشہر الحرم میں اور حدود حرم میں اس کشت و خون کو کڑوے گھونٹ کی طرح تو نہ پیتے بلکہ "جلالۃ الملک" اور "نجدی حکومت حجاز" کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکتا تب بھی لکھنؤ کی حجاز کانفرنس کو التوائے حج کا قبل از وقت اعلان کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مذہبی تنگ نظری اور تعصب کی اس بے مثل نمائش کے بعد کوئی مسلمان بھی سوائے اُن معدودے چند حضرات کے آیندہ حج کو جانے کی جرأت نہ کرتا جن کی حرکات اس حج کے موقع پر اس عبادت کا ایک خاکہ سا پیش کر رہی تھیں جس کا ذکر وما کان صلوٰتھم عند البیت الامکاءً وتصدیہ کی آیہ کریمہ میں آیا ہے کیونکہ ان میں ہر ایک فرد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل ہی دل میں تالیاں بجا رہا ہے اور گنگنا رہا ہے۔ سیاں بھئے کوتوال، اب ڈر کاہے کا"؟

سلطان نجد نے اس وادی غیر ذی زرع کو اس لئے نہیں فتح کیا تھا کہ حج بند ہو جائے اور حکومت حجاز بھوکوں مرنے لگے۔ انہوں نے عبداللہ شیبی (مکی) اور شیخ وشیشہ (مدنی) کے ذریعے سے موتمر میں اپنے سن مانے رئیس موتمر کی

اجازت سے۔ مگر بالکل خلاف قاعدہ۔ مصر کے تبرکات کی کمی پر ایک احتجاج تو
کرایا جس پر وفد مصری اور ہمارے دونوں وفود بھی جلسے کو چھوڑ کر چلدئے
اور موتمر کا اجلاس بھی اس کے بعد ہی بند کر دیا گیا۔ مگر جلد ہی سلطان نے محسوس
کرلیا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ نجدی حکومت حجاز مصر سے لڑائی مول نہ لے چنانچہ
نجدیوں کے دل میں خواہ کیسی قدر غبار مصریوں کے خلاف بھرا ہوا کیوں نہ ہو، نجدی
حکومت نے اُسی دن سے اپنی مونچھیں نیچی کرلی ہیں۔

یہ تو ایک طول طویل " جملہ معترضہ " بیچ میں آگیا۔ گو یہ بھی سید رشید رضا
صاحب " مصری " کے ذکر خیر سے غیر متعلق نہیں ہے۔ مگر ذکر حقیقت میں سید صاحب
موصوف ہی کا تھا۔ جن کی اہل مصر سے مخالفت کی طرف اس مضمون میں اشارہ
کیا گیا ہے پر آگے دیا جا رہا ہے۔ میں نے حرب عقاید کے متعلق تو مجبور ہو کر موتمر
میں وضاحت کر دی۔ اور سید صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ مگر اس کے بعد وہ مجھے
دوران تقریر میں اور بھی ٹوکنے لگے۔ اور گو لوگ جانتے ہیں کہ میں اسطرح ٹوکے جانے پر
زیادہ پریشان نہیں ہوتا ہوں۔ مگر سید صاحب کی اس بار بار کی دخل در معقولات پر اور
مجھ سے یہ کہنے پر کہ تم تو موتمر پر قبضہ کئے لیتے ہو میں نے انہیں ایک بار پھر یاد دلایا کہ
وہ موتمر کے نہ رئیس ہی منتخب ہو سکے نہ نائب رئیس ہی اس لئے انکو فرائض صدارت
انجام دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اور پھر انہیں مجبور ہو کر وہ وقت بھی یاد دلایا
جبکہ خانہ کعبہ کو عبد القادر شیبی صاحب اور انکی دعوت پر وہ اور میں اندر سے غسل دے رہے
تھے اور انہوں نے بظاہر خلوص سے اور درد بھری آواز میں مجھ سے رب بیت کا واسطہ
دیکر خاص خلوص کی خواہش ظاہر کی اور میں نے خلوص کا وعدہ کیا۔ اور ان سے بھی خلوص کا

وعدہ لیا۔ اس کے بعد سید صاحب نے بار بار ٹوکنا چھوڑ دیا۔ مگر افسوس کہ ہماری مخالفت
اُن سے نہ چھوٹ سکی۔ مولینا ثناء اللہ صاحب نے میرے، اور میرے بھائی کی شکایتوں
کا بھی کھاتہ "زمیندار" میں تاریخ وار پیش فرمایا۔ اور اس کھاتے میں جہاں
نجدیوں کے اور حمائتیوں کی جھوٹی سچی چغلیاں درج ہیں وہاں سید رشید صاحب کی
بھی شکایت درج ہے۔ میں نے ایک دن تو بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں مولوی ثناء اللہ
صاحب کی دروغبافیوں اور غلط استدلال کی پہلی قسط کا زبانی جواب دیا تھا جس پر ایک
دو اہلحدیث حضرات سخت پریشان ہوئے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ یہ سلسلہ شروع ہی
نہ کیا جائے۔ یا جلد از جلد بند کر دیا جائے۔ اسی کو کافی سمجھ کر میں نے پھر اس طرف توجہ
نہ کی۔ لیکن سید رشید صاحب کی شکایت کے متعلق جو کچھ مولانا ثناء اللہ صاحب نے
ارقام فرمایا ہے۔ آج اسکی حقیقت بھی بغیر میرے کچھ کہے ہوئے ظاہر ہو ہی جاتی ہے
الاہرام میں سید رشید رضا صاحب کا اپنی کارگزاریوں پر تبصرہ چھپ رہا ہے۔ اسکی
دوسری فصل پر محمد علی حسن بے مصر کے مشہور نامہ نگار نے الاہرام ہی میں سید صاحب
کی موتمر کی اصلی کارگزاریوں کی پردہ دری کی ہے۔

اس مضمون میں مولانا شوکت علی کی اس تحریک کی طرف بھی اشارہ ہے جو مقابر و
مآثر کے بارے میں موتمر کے آخری اجلاس میں منظور ہوئی تھی۔ ام القریٰ نجدی کی حکومت
حجاز کا ایک آلہ ہے۔ اور اسکے اڈیٹر یوسف یٰسین صاحب جو ڈاکٹر عبداللہ دلوجی
صاحب کی جگہ اسوقت تک وزیر خارجہ رہیں گے جب تک ڈاکٹر صاحب امیر فیصل
نائب جلالۃ الملک کی معیت میں سفر انگلستان سے واپس آئیں وہی بزرگ ہیں جو
آخری اجلاس میں بھی اس تحریک کے پیش ہونے کے روادار نہ تھے حالانکہ وہ آٹھ

دس دن پیشتر ہی سبجکٹ کمیٹی کے غور کرنے کے لئے پیش کی جا چکی تھی۔ ان کی مخالفتوں اور ٹال مٹول کی داستان بہت لمبی ہے۔ مگر یہاں اتنا سمجھا دینا بھی کافی ہوگا کہ یہ حضرت تحریف تک سے احتراز کرنے والے نہیں۔ ام القریٰ میں انہی حضرت نے مولینا شوکت علی صاحب کی تحریک اور اسکی بلا کسی مخالفت کے منظوری کو بالکل غلط طریقہ پر شایع کیا ہے۔ اور "زمیندار"، اور بعض پنجاب کے اہلحدیث حضرات نے اسی غلط بیانی کی تبلیغ و نشر کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ اس لئے یہاں یہ بیان کر دینا نا مناسب نہ ہوگا کہ جو تجویز موتمر میں منظور ہوئی ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ ماثر و مقابر کے کل مسئلہ کو علماء کے فیصلے پر چھوڑ دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ

(۱) "جو قبریں ابتک کہیں محفوظ رہ گئی ہیں انکو اسی طرح محفوظ رکھا جائے۔

(۲) جو مآثر (مثلاً مولد رسولؐ، مولد فاطمہؓ وغیرہ) توڑ دیئے گئے ہیں انکو فوراً دوبارہ تعمیر کرا دیا جائے اور

(۳) جو قبے اور مقابر توڑ دئے گئے ان کے دوبارہ تعمیر کرانے اور ان کے تحفظ و شکل تعمیر کا فیصلہ سنی اور شیعہ علماء عالم اسلام پر چھوڑا جائے"

امین بے الرافعی اور محمد علی حسن بے مصری جرائد کے نامہ نگار بن کر آئے تھے اور گو اول الذکر کی طرح تو مؤخر الذکر دنیائے صحافت و سیاست میں مشہور نہیں ہیں مگر وہ بھی ایک نہایت قابل اور ذی فہم سیاست داں اور جریدہ نگار ہیں جب موتمر کی روز کی کارروائی اور بالخصوص اسکا ملخص جو دوسرے دن موتمر میں

پڑھا جاتا تھا۔ اچھے طریقے سے مندرج ہوتا ہوا معلوم نہ ہوا تو انہیں صاحب نے موتمر کو اپنی خدمات پیش کیں جو نہایت شکر گزاری کے ساتھ قبول کی گئیں۔ اور اپنے جریدہ کے لئے نامہ نگاری اور موتمر کی کارروائی کا اندراج یہ دوہرا کام انکو کرنا پڑا۔ توفیق شریف بے جنہوں نے شاید عسیر کو آج تک دیکھا بھی نہیں اور جو خود مہینے ہندوستان میں گزار کر عین حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ پہنچے تھے سلطان نجد کے حکم سے عسیر کے وفد کے رئیس بنائے گئے۔ اور نامزدگان سلطان کی رائے سے موتمر کے ناموس عام یا سکریٹری بنائے گئے۔ مگر ان حضرت نے موتمر کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں کیا کہ سید سلیمان ندوی صاحب کو (جو دو تین بار موتمر اور اسکی سبجکٹ کمیٹی میں رئیس موتمر کی غیر حاضری میں بحیثیت نائب رئیس صدارت کر رہے تھے) ان کے احکام کو اسطرح نیچے ڈالا کہ سید صاحب رو ہانسے ہو گئے۔ اور ان سے کسی کام کو کہتے ہوئے ڈرتے تھے اور اگر ہم اصرار نہ کرتے تو مولانا شوکت علی صاحب کی تجویز دوبارۂ تعمیر مقابر و آثار، رئیس موتمر اور ناموس عام ہی کے درمیان غائب ہو جاتی۔

ناموس عام صاحب نے آخر میں تو موتمر کے اجلاس میں بھی اپنی جگہ پر بیٹھنا ترک کر دیا۔ اور ترکی اور افغانی وفود کو ورغلانے کے لئے ان کے پاس جا کر بیٹھنے لگے۔ حالانکہ اس کے متعلق موتمر میں کئی بار سوال بھی کیا گیا (جس کا رئیس موتمر نے کوئی جواب سوائے اسکے نہ دیا کہ وہ ایک اور ضروری کام میں مشغول ہیں) اور سکریٹری کے سارے فرائض انہیں محمد علی حسن بے مصری کو انجام دینا پڑے آخری اجلاس میں جو نہایت مختصر مگر جامع رپورٹ موتمر کی کارروائی کی انہوں نے پیش فرمائی

تھی۔ اس نے سب سے داد تحسین وصول کی۔ اور یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ناموس عام توفیق شریف بے صاحب کا جو آپ ہندوستان میں نجدی پروپاگنڈہ کر رہے ہیں کسی نے شکریہ ادا نہیں کیا۔ مگر ان کے ان قائم مقام کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ تمام اراکین موتمر نے شکریہ ادا کیا۔ یہی نہیں بلکہ جبتک شیخ عبدالعزیز شاویش، یا امیر شکیب ارسلان صاحب (شامی) ناموس عام کے عہدے کو قبول نہ کریں۔ اور مستقل لجنۃ تنفیذیہ یا اگزیکٹو کمیٹی کے چھ دیگر اراکین ترکی۔ مصر فلسطین، ہندوستان، نجد و حجاز کی طرف سے نامزد نہ ہو جائیں۔

عارضی لجنۃ تنفیذیہ نے ہمیں صاحب کا انتخاب بحیثیت عارضی سکریٹری کے کیا۔ مگر جب یہ اسی جہاز میں جس میں امیر سعود ولیعہد نجد مصر جا رہے تھے۔ اپنے وطن کو لوٹ رہے تھے اور ہمیں ینبع میں ملے تو معلوم ہوا کہ توفیق شریف بے صاحب نے کاغذات موتمر انہیں سپرد کرنے سے انکار کیا۔ اور خود سلطان کے حکم کو بھی اس بارے میں نہ مانا سلطان کے انداز حکومت کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس توفیق شریفی "بغاوت"، کا یہ نتیجہ ہوا کہ سلطان نے موتمر کی عارضی اگزیکٹو کمیٹی اور نیز اپنے حکم سے اس سرتابی پر سابق ناموس عام صاحب کو کچھ نہ کہا اور کاغذات اُن سے لیکر محمد علی حسن بے کو نہ دلوائے، بلکہ اس موتمر کے کاغذات کو جسے وہ خود ہی آزاد قبول کر چکے تھے اپنے حکم سے اور اس کمیٹی کے حکم کے خلاف کسی اور کو یہ کہہ کر دلوا دیئے کہ توفیق شریف بے صاحب سے کاغذ نکلوانے کے لیئے یہی مصلحت ہے اس پر میں توفیق شریف بے صاحب کی طرح یا لطیف کے سوا کیا کہوں؟

زمیندار اور اسکی طرح کے اور نجدیوں کے حامی اس افترائے عظیم کو زبان اور زبانِ قلم پر لاتے نہیں شرماتے کہ ہم دونوں بھائیوں اور حاجی شعیب قریشی صاحب نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے موتمر کی کارروائیوں سے سخت ذلیل کرایا۔ یہ حضرات جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کو وفد حجاز کا ایک رکن منتخب کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے شاید اب بھی حکیم صاحب موصوف پر انہیں اعتبار و اعتماد ہو۔ حکیم صاحب نے مجھ سے ملتے ہی فرمایا تھا کہ تم لوگوں نے عالم اسلام پر بہت اچھا نقش بٹھایا ہے۔ جسکے لئے میں مبارکباد اور مسلمانانِ ہند کی طرف سے شکریہ پیش کرتا ہوں۔

میری عربی ڈاک جس میں خطوط و جرائد دونوں شامل ہیں مجھے تمہاری کارگزاریوں سے ہفتہ وار مطلع کرتے رہے افسوس کہ ہندوستان میں ان مصری شامی اور فلسطینی جرائد کے مضامین اور ان کے نامہ نگاروں کے خطوط کا ابتک ترجمہ نہیں چھپا۔ لیکن آج مشتے نمونہ از خروارے میں "الاہرام" میں سے اس کھلی چٹھی کے ترجمہ کو شایع کرتا ہوں جو "نی صاحب المنار" کی سرخی سے محمد علی حسن بے نے شایع کرائی ہے۔ اُمید ہے کہ ہمدرد کے پڑھنے والے اس پروپاگنڈا کی حقیقت سے اب واقف ہو جائیں گے جس پر وہ روپیہ جو حجاج سے خلاف و عدہ زیادہ محاصل عاید کرکے وصول کیا تھا۔ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔

سید رشید رضا صاحب کو جس طرح چلتے وقت بھی دو ہزار گنیاں زر سرخ مکہ مکرمہ میں اور ایک ہزار کا ڈرافٹ جدّہ میں ملا وہ تو ایک زبان زدِ خلایق داستان ہے۔ اس لئے کہ جس بیگ میں گنیاں بند کی گئی تھیں وہ پانی

پیتے وقت نوکر کی سپرد کیا گیا۔ بعد کو جب اسٹیم لانچ میں، جدہ کی گودی سے مصری جہاز پر سوار ہونے کے لئے روانہ ہو چکے تو بیگ یاد آیا۔ اور گھبراہٹ میں اسے نہ پایا۔ حالانکہ وہ "بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورہ" کی صحیح مصداق ان کے نیچے ہی رکھا تھا۔ تو لانچ کو پھر گودی کی طرف پھرایا گیا اور جب گودی پہنچنے سے پہلے ہی بیگ مل گیا تو اس بے صبری کے صدقے جائیے لانچ ہی میں بیگ کھول کر گنیاں گنوائی گئیں۔

جب یہ گنیاں پوری دو ہزار نکلیں تو سید صاحب داعی اصلاح مذہبی۔ تمدنی وسیاسی کے دم میں دم آیا۔

خدیو مصر عباس حلمی کے آپ دوست تھے۔ لارڈ کچنر کے آپ دوست تھے۔ حسین کے آپ دوست تھے۔ فیصل کے آپ دوست تھے، اور اب ماشاءاللہ سلطان ابن سعود کے دوست ہیں۔ بظاہر

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو؟

آپ کی جدید روایت "حجاز کا دوسرا سفر" کی دوسری فصل میں نے جریدہ "الاہرام" میں پڑھی جس میں آپ نے اپنے اس دعوے کو دوہرایا ہے کہ آپ ایک مذہبی تمدنی، سیاسی، اصلاح کے داعی ہیں۔ اور یہ کہ آپ آیندہ رجب میں مصر کو اپنا وطن بنانے کی تیسری کڑی مکمل کر دیں گے

مکہ کی موتمر اسلامی میں آپ کی شہرت آپکی خوبیاں شمار کرا دیتی ہے، اور یاد دلاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہندوستان اور غیر ہندوستان میں آپ نے کیا کیا کیا ہے۔ اور یہ کہ آپ نے اپنے اسلامی جہاد اور مذہبی۔ تمدنی۔ سیاسی اصلاح میں پورے تیس سال گزارے ہیں جسکی انتہا رجب پر ہوتی ہے۔ فیا للعجب اور آج فصل ثانی کا بیشتر حصہ جسکو محترم الاہرام نے آپ کی طرف سے شایع کیا ہے آپ خود تحریر کرتے ہیں۔ اور شاید اس خیال سے کہ تیس سال کے مذہبی۔ تمدنی اور سیاسی جہاد کے بعد بھی ابتک برابر آپ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ آپ کو اپنے ان حسنات کے اعادہ کی ضرورت ہے جن کے آپ دعویدار ہیں اور قارئین کو یاد دلاتے ہیں تاکہ مسلمان جان لیں کہ آپ نے ان کے لیے کیا کیا خدمات و فتوحات سر انجام دی ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور لوگ گواہ ہیں کہ آپ اپنی زندگی میں کسی وقت مذہبی۔ تمدنی اور سیاسی اصلاح کے داعی نہ تھے۔ آپ صرف شیخ رشید رضا المعروف بہ مستبد ہیں۔

کیا آپ مذہبی مصلح ہیں؟ سبحان اللہ! اور کب آپ دینی مصلح تھے؟ کیا آپ اسوقت مذہبی مصلح تھے جبکہ آپ حسین کی نصرت و امداد کرتے تھے اور حکومت کے خلاف بغاوت کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش میں تھے، تاکہ حسین

امیر الحجاز ملک الحجاز یہانتک کہ خلیفۃ المسلمین بن جائے ؟ اور کیا مذہبی اصلاح آپ کی اصطلاح میں مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرانے کا نام ہے ؟

کیا آپ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ مستعمرین جن کے سرغنہ انگریز ہیں دن رات آل عثمان کی خلافت کو منہدم کرنے کے درپے تھے ؟ اور یہ کہ حسین اور اولاد حسین مستعمرین کے ہاتھوں میں آلہ کار براری تھے مستعمرین جس طرح دیگر لوگوں کے ذریعے اقوام اسلام کے اتحاد کو برباد کرتے تھے اسی طرح ان لوگوں سے بھی کام لیتے تھے۔

آپ نے حسین کی اسوقت امداد و اعانت کی جبکہ انگریز اسکے ساتھ تھے اور اسکو اسی روز چھوڑ دیا۔ اور جنگ کی جس روز انگریزوں نے اسکو چھوڑ دیا۔ اور انکی اس سے کوئی حاجت وابستہ نہ رہی۔ آپ ہی ایک ایسے نہیں ہیں جو حسین اور اولاد حسین سے پھرے ہوں اور دوسروں کی طرف چلے گئے ہوں ہم نے حسین کے خواص و مددگاروں میں سے بہتوں کو دیکھا ہے جنہوں نے حسین کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے منہ، موجودہ ملک الحجاز کی طرف پھیر لئے ہیں۔ اسکے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ اور اس سے اخلاص کا اظہار کرتے ہیں۔

جن لوگوں کو ابن سعود کی تقویت کے ساتھ ارض حجاز کی سلامتی مرغوب ہے انکو جلالۃ الملک الحجاز کے ساتھ اصلاح مذہبی، سیاسی۔ تمدنی کے داعی کی دوستی سے خوف ہے اور جو لوگ اس دوستی کی حقیقت سے واقف ہیں وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مکاروں کے مکر اور مستعمرین کے دم چھلوں سے حرمین کو محفوظ رکھے اور آرزو کرتے ہیں کہ جلالۃ ملک الحجاز اور اہل حجاز سے بلاؤں کو دور رکھے۔

مسلمان آپ کی مذہبی، تمدنی اسیاسی اصلاح کو خوب جانتے ہیں کہ جسوقت

فیصل فرانس کے حکم سے شاہ شام تھا تو آپ مجلس حکومت کے صدر نہ تھے؟
آپ کی فیصل کے ساتھ دوستی کا پھر کیا نتیجہ نکلا؟ اور شاید آپ کو بھی انکار
نہ ہوگا کہ آپ فیصل کو برابر نصیحت کرتے رہے اور وہ راستہ بتاتے رہے جس کو
آپ نے بہتر سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی حکومت جاتی رہی، ملک جاتا رہا، تو کیا یہ رنج
دہ نتیجہ اسلئے ہوا کہ وہ آپ کی رائے کا اتباع کرتا تھا۔ آپ کی نصیحت سنتا تھا
آپ کی رہنمائی پر کاربند تھا۔ یا اسلئے کہ وہ آپ کی رائے سے مخالفت کرتا تھا
اور آپ کی نصیحت کو کوئی وقعت نہ دیتا تھا؟ اب اگر پہلی صورت تھی تو میں
پوچھتا ہوں کہ پھر یہی آپ کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی اصلاح ہے؟ اور اگر
دوسری صورت تھی تو پھر آپ کی رائے سے مخالفت کی کیا وجہ تھی؟ کیا وہ مستعمرین
کی مصالح کو مصالح اہل شام پر مقدم رکھتا تھا؟ تو پھر مستعمرین کیوں کیوں
ناراض ہوئے؟ اور کیوں اسکو تخت شام سے علیحدہ کر دیا؟ یا وہ قوم کی خدمت
کرنا چاہتا تھا۔ اور آپ وحی استعمار کے مطابق کرنا چاہتے تھے اور آپکی مخالفت سے
جو کچھ ہونا تھا ہوا؟ چلئے اس ذکر کو چھوڑیئے۔ ہمکو یہ بتائیے کہ موتمر اسلامی میں
آپ نے اصلاح مذہبی کے متعلق کیا کیا ہے؟ کیا واقعی آپ رئیس موتمر بننا چاہتے
تھے؟ اور جب آپ نے ناکامی دیکھی تو بیمار پڑ گئے۔ اور کیا ہندوستانی وفود
کے سامنے موتمر کے آپ کے کارنامے آپ کی اصلاح دینی کے دعوی کو ثابت
کرتے ہیں؟ کیا انعقاد موتمر کی اصلی غرض حجاز کو جس اصلاح کی ضرورت ہے اس کے
لئے مسلمانوں کا قیام نہ تھا؟ اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اصلاح مطلوب مسلمانوں کے
اتفاق اور اس امر پر موقوف ہے کہ مسلمان اصلاح کے لئے جس مادی قوت کی ضرورت

ہے اسکے لئے امداد کا ہاتھ اُٹھائیں ؟ اور کیا یہ امر آپ سے پوشیدہ ہے کہ
قبوں اور قبور کا مسئلہ ایک ایسی کثیر جماعت کو ناگوار ہوا ہے جسکو نظر انداز نہیں
کیا جاسکتا۔ اور کیا آپ سے فوت ہوگیا کہ اسی فریق میں سے ہمارے برادران
ہندوستانی بھی ہیں ؟ اور کیا اس سب کے بعد سوء تفاہم اور ان اسباب کا ازالہ
اصلاح دینی تھا جن سے یہ سوئے تفاہم اس جماعت عظیم کو پیدا ہوا۔ یا آپ کی نظر
میں اصلاح دینی اختلاف کی زیادتی اور نفرت کی کثرت، تاکہ مسلمانوں کی جماعتیں
مختلف پارٹیوں اور جماعتوں پر تقسیم ہوجائیں اگر آپ کی اور آپ کے متبعین کی
یہ دوسری مشہور کارروائیاں موتمر میں حائل نہ ہوتیں تو ہندوستانی ناراض
نہ ہوتے۔ اور اگر وہ ان تجاویز کے پیش کرنے میں جو انہوں نے پیش کیں،
آزاد ہوتے اور موتمر ان پر نظر ڈالتی اور ان تجاویز کو جماعت علماء کے سامنے
شرعی حیثیت سے نظر ڈالنے کے لئے پیش کرتی تو نتیجہ انکی دوستی اور امداد کا
حصول ہوتا۔ اور ملک الحجاز کے لئے یہ بہتر ہے کہ ہندوستانی اسکے موئد و
مددگار ہوں۔ خود ملک الحجاز کی تمام ترگفتگو یہ تھی کہ معتقدات کے اختلافی مسائل
پر گفتگو کرنا علماء کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ ایک ایسی رائے تھی جس پر
ہندوستانی بلاشک اچھی طرح مطمئن ہوجاتے اور اس تجویز پر ان کا اطمینان اسوقت
ظاہر بھی ہوگیا۔ جبکہ موتمر نے ایک ایسی تجویز منظور بھی کی جسکو آخری جلسے میں مولانا
شوکت علی نے پیش کیا تھا۔

آپ کی عقل وحکمت سے ایسی بات کیوں پوشیدہ رہ گئی، اور آپ ان کے
مقابل موتمر میں جبکہ وہ کوئی رائے ظاہر کرتے تھے یا کوئی تجویز پیش کرتے تھے تو

کیوں کھڑے ہوتے تھے ؟

قباب و قبور کا ذکر جانے دیجئے، اور اس پہلی تجویز کو لیجئے جو مولانا محمد علی نے تمام جزیرۃ العرب کی آزادی کے متعلق نبی کریم کی وصیت کے مطابق جبکہ آپ بستر مرگ پر تھے پیش کی تھی۔ کیا آپ نے اس تجویز کی اس بناء پر مخالفت نہیں کی تھی ؟ کہ یہ سیاست میں مداخلت ہے اور موتمر کو سیاست میں کوئی دخل نہیں ہے اور یہ کہ حکمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بستر مرگ کی وصیت کا ذکر مناسب نہیں۔

آپ نے اور آپ کے متبعین نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اسکی ترمیم چاہی اور ترمیم کے بعد بھی اسکو ڈال رکھا حتیٰ کہ صاحب تجویز جب انتظار سے گھبرا گیا۔ اور تم پر حجت قایم کی تو تم کو حجت کا حجت سے جواب دیتے نہ بن پڑا۔ اور آخر میں آپ نے خود جلسہ میں تجویز پر گفتگو ہونے سے بچنے کی ترکیب نکالی جس سے آپ نے بلا وجہ ہندوستانی برادران کو ناراض کر دیا۔

پھر اسکے بعد کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اسے مصلح دینی اور حکیم سیاسی! ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ ایک خاص تجویز عقبہ و معان کی واپسی کے متعلق بعینہٖ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وصیت پر قایم کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں تو کیا آپ کی یہ تجویز غیر سیاسی تھی اور وہ چیز جو آپ نے دوسرے کے لئے حرام کر دی تھی، وہ اپنے لئے کس طرح جائز کر لی ؟

لیکن اسی کے ساتھ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپ کی اس تجویز کی ہندوستانیوں سے زیادہ کسی نے تائید نہیں کی۔ یہ وہ عمل ہے جسکو آپ کے متعلق یاد کرنے والے ہمیشہ یاد کرینگے

آپ کے لئے تو بہتر یہ تھا کہ آپ اپنی تمام تر کوشش اپنے رسالے اور فقہی مباحث پر صرف کر دیتے۔ لیکن اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ مذہبی، تمدنی اور سیاسی داعی ہیں تو آپ کا ماضی و حال اسکی مخالفت کرتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں محسوس ہو جائیگا کہ مذہبی صورت کو آپ نے مسلمانوں کے خلاف کارروائی کا ایک ذریعہ بنایا ہے اور گو آپ کی دعوت ظاہر میں اصلاح ہے لیکن اسکا باطن ظاہر سے مختلف ہے اور قول و عمل میں بہت بڑا فرق ہے اور خدا کے نزدیک بہت سخت گناہ ہے کہ تم وہ کہو جو نہ کرو۔

وہ شخص جو آپ کو مستعمرین کا سیاسی داعی سمجھتا ہے وہ معذور ہے مسئلہ خلافت میں جو کچھ آپ نے کیا ہے۔ بلکہ ہر کام میں خواہ وہ جزیرۃ العرب میں ہو یا ہندوستان میں، ترکی میں اور مصر میں وہ مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف، اور مستعمرین کی مصلحت کے مطابق تھا تو کیا آپ کی قدرت میں ہے کہ آپ میرے سامنے ایک حقیر ہی سی دلیل کسی ایسے کام کی پیش کر دیں جس میں مسلمانوں کو کم از کم فائدہ ہوا ہو؟

جناب والا! میں آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آپ ملک الحجاز سے علیحدہ ہو جائیں اور لوگوں کو دھوکہ نہ دیں۔ اور مسلمانوں کی جماعتوں کے معاملہ میں جنہیں تفرق و اختلاف نے ان لوگوں کے کاموں کی وجہ سے جو اصلاح کا دعویٰ کرتے ہیں، پہلے ہی سے خراب کر رکھا ہے اخوف کریں۔ بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ آپ جیسے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ڈاکٹر طہٰ حسین جیسے سیکڑوں سے زیادہ نقصان رساں ہیں۔ لہذا حق کہیئے اور امر پر عمل کیجئے۔ اور نہیں تو خاموش رہئے۔

آپ کے دوسرے مقالہ میں آپ کے وسائل جس کا بیشتر حصہ فضیلۃ الاستاد حافظ وہبہ کے متعلق ہے تو اسکی غرض معلوم ہے۔ اور مصری قوم جان لے کہ استاذ شیخ رشید رضا جس نے تیس ہجری سال سے مصر کو اپنا وطن بنالیا ہے مصریوں سے حجاز میں لڑتا ہے۔ چنانچہ عزمی پاشا کے خلاف اسکے وسائل تم روز پڑھتے ہو، اور یہ ان کے وسائل ہیں۔ اس یکتا مصری کے مقابل جو ملک الحجاز کی تائید و اعانت اور ان کے مرکز کو اخلاص و قابلیت کے ساتھ قایم کرنے میں کوشاں ہے شیخ رشید نے حجاز کو اپنے وسائل کا گھونسلا بنا لیا ہے۔ اور اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ تم دیکھو گے کہ وہ مصریوں سے حجاز میں پردہ کے پیچھے سے ایک نہایت کمینی جنگ کرتا ہے، اگر ان لوگوں کا ملازمت کے لئے انتخاب قابلیت اور اخلاص کی بنا پر ہوتا تو بات آسان تھی۔ لیکن غرض تو متبعین کی ایک ایسی جماعت کا قیام ہے۔ جس کے کاندھوں پر چڑھکر اس منصب کو حاصل کیا جائے جسکو شیخ نے شام میں کھو دیا ہے۔

اور میں فضیلۃ الاستاذ بیطار جیسے حضرات کی توجہ مبذول کراتا ہوں کیونکہ ان میں اصلاح اور حسن نیت محسوس کرتا ہوں کہ وہ اصلاح مذہبی، تمدنی، اور سیاسی کے داعی شیخ رشید رضا صاحب المنار کے ہاتھوں میں ایک کھلونہ نہ بن جائیں جو مسلمانوں کی جماعتوں میں تفریق ڈلواتے ہیں۔ اور اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوط پکڑو۔ اور متفرق نہ ہو۔ مگر جو شخص برائی کرے گا اسکا بدلہ پائیگا۔ اور انجام خیر متقیوں کے لئے ہے۔

محمد علی حسین

(الاہرام)

فصل فیصل

(ہمدرد ۲۲- اکتوبر ۱۹۲۶ء)

سلطان ابن سعود نے اگر ملوکیت قبول کی ہوتی لیکن شعائر اسلام پر پوری شدت سے عمل کیا ہوتا تو ممکن تھا علی برادران کا جذبۂ مخالفت سرد پڑ جاتا لیکن یہ بھی نہ ہوا۔

سلطان کے فرزند دلبند شہزادہ فیصل انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں جو کچھ ہوا۔ اسے محمد علی کی زبان سے سنئے۔ (مولف)

جو لوگ یورپ جا چکے ہیں اور وہاں کے حالات سے واقف ہیں انکو یہ دیکھ کر تعجب نہ ہوگا کہ اس ہفتہ کی ولایتی ڈاک کے تمام اخبارات میں شاہ زادہ فیصل پسر سلطان ابن سعود کے ورود کی خبر، ان کے حالات، ان کی تصویریں شایع ہوئی ہیں۔ وہ تو ایک شاہزادے ہیں لیکن ہم جیسے حقیر انسان بھی جب مشرق سے چل کر وارد لندن ہوتے ہیں تو اخبارات کے نامہ نگار، اور فوٹو گرافر گھیر لیا کرتے ہیں۔

انگلستان کی معمولی زندگی کے حالات، سڑکوں کے حادثے۔ جرایم کی تفصیلات۔ عدالتِ طلاق کی گندگی۔ ان سب کو روز روز پڑھتے پڑھتے اخبار بین پبلک کو جو ایک مساوات سی ہو جاتی ہے اسکے بعد کسی مشرقی کا ورود بھی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ مشرقی لباس میں وارد ہو۔ لیکن شاہزادہ فیصل کا ورود چند وجوہ سے اور بھی زیادہ دلچسپی کا باعث ہے۔

ان کے والد نے انگریزی حکومت کے آوردہ شریف حسین اور اس کے بیٹے کو حجاز سے نکال باہر کیا۔ اور مکہ مکرمہ میں پہلی بار ایک موتمر مسلمانان عالم کے نمایندوں کی منعقد ہوئی جس سے یورپ کے کان کھڑے ہوئے یہ دو امور شاہزادہ فیصل کو اور بھی ممتاز بنانے کے لئے کافی تھے۔ مگر دنیا میں سنجیدگی اور تمسخر توام ہوتے ہیں۔ کہاں تو شاہزادہ فیصل کی یہ شان امتیاز اور کہاں سینما کے نقال روڈالف ویلینٹینو کے "اصل" ہونیکا شرف۔ سینما کے تماشہ کرنیوالوں نے جب یورپ کی نقالی ختم کر دی تو ایک نئی دنیا کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور مشرق کی نقالی شروع کی۔ البتہ رہی وہی یورپ کی داستان حسن وعشق اور وہی چوماچاٹی جسے سینما جانے والے روز دیکھا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یورپ پر مشرق اور بالخصوص مسلمانوں کی قوت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ اور عام خیال ہے کہ ہر مسلمان کا گھر سو دو سو بیویوں اور باندیوں کی حرم سرا ہے۔ اسلئے یورپ کی شوقین لڑکیاں جنکی طبیعت یورپ کے بوس و کنار کو سینما میں دیکھتے دیکھتے بھر گئی ہے۔ اس نئی دنیا کے حسن وعشق کی کولمبس بننا چاہتی ہیں جس کا نام مشرق ہے اور اس نئے راستہ کی واسکوڈاگاما ہونیکی

خواہشمند ہیں جو دوراس امید، سے ہو کر ایک مسافر کو مشرق تک پہنچاتا ہے۔
جس طرح چارلی چپلن نے اپنی ہیئت کذائی سے لوگوں کو ہنسا ہنسا کر کروڑوں
کمائے۔ اسی طرح روڈالف نے مشرقی "شیخ" بنکر نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں
کو بیھایا اور ٹکے علیحدہ وصول کئے۔ یہ بیچارہ ابھی مرا ہے اور علاوہ اپنی مطلقہ
بیوی اور منگیتر کے ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کو داغ مفارقت دیکر روتا چھوڑ
گیا۔ مگر شاہزادہ فیصل کے ورود پر اخبارات لکھ رہے ہیں کہ ہزاروں ان کے
دیکھنے کے شایق ہیں۔ اس لئے کہ جس شخصیت کی نقل متوفی ویلنٹینو اتارا کرتا
تھا یہ خود اسکی اصل ہیں۔ اور یقیناً تسخیر حجاز اور انعقاد موتمر اسلامی سے کہیں زیادہ
عوام کی دلچسپی کا باعث شاہزادہ فیصل کی یہ شان امتیاز ہے۔

اخبارات اسکا بھی ذکر کرتے ہیں کہ شاہزادہ موصوف کا یہ پہلا سفر
انگلستان نہیں ہے۔ بلکہ وہ ۱۹۱۹ء میں جبکہ وہ بچے ہی تھے گو وہ اسوقت بھی
اتحادیوں کی طرف سے ترکوں کے خلاف لڑ چکے تھے۔ مسٹر فلبی، برطانوی پولیٹکل
افسر کے ساتھ بادشاہ انگلستان کے سامنے اپنی اطاعت شعاری کے اظہار اور
اتحادیوں کی فتح پر مبارک باد دینے کے لئے آئے تھے۔ اُسوقت وہ ایک نہایت
ہی خوبصورت لڑکے تھے اور اب ایک نہایت خوبصورت نوجوان ہیں"

ان میں ایک اعلیٰ درجے کے شیخ کی تمام صفات موجود ہیں اور ان
لڑکیوں کو جو اتنک مجبوراً اسی پر قانع تھیں کہ سینما کی فلموں کے ذریعے سے
ابطال بادیہ کی نقل دیکھ لیں۔ معذور سمجھنا چاہیئے اگر وہ اسوقت فرط مسرت
سے بیقرار ہو جائیں جبکہ وہ ایک حسین، خوبصورت اور زرق برق لباس

میں ملبوس، اور جواہرات سے مرصع نوجوان کو دیکھیں جس نے اپنی تشریف آوری سے ہم کو عزت بخشی۔ لیکن اخبارات کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ دملوجی یا ان کے اور ساتھی جو شاہزادہ فیصل کے ہمرکاب ہیں اس بات کا کافی لحاظ رکھتے ہیں کہ اخبارات میں کوئی ایسی بات شایع نہ ہونے پائے جو تمسک بالکتاب والسنتہ کے دعوے کے صریحاً خلاف ہو۔ چنانچہ آگے اسکا ذکر آئیگا۔ یہاں اتنا ہی لکھدینا کافی ہوگا کہ جس اخبار نے شہزادہ فیصل جیسے حسین شیخ کے دیکھنے پر انگلستان کی لڑکیوں کے فرط انبساط اور بیقراری کا ذکر کیا ہے وہی یہ بھی لکھتا ہے کہ یاد رہے شہزادہ فیصل اس قسم کے "شیخ" نہیں ہیں جس سے کہ ویلنٹینو نے ہمیں آشنا کرایا تھا۔ اور خود اپنے ملک عرب میں بھی وہ کسی عورت پر آنکھ نہ ڈالیں گے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ جو خود ان کے ملک اور مذہب کی نہ ہو۔ یہ ملک اور مذہب کی شرط اگر نہ ہوتی تو اچھا تھا اسلئے کہ مکہ معظمہ میں تو کوئی غیر مذہب کا شخص آ ہی نہیں سکتا۔ اور ریاض کا راستہ اتنا دشوار گذار ہے کہ وہاں غیر ملک والے بھی نہیں آسکتے اِلّا یہ کہ فلبی صاحب کی طرح کوئی غرضمند جا پہنچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن عورتوں پر شہزادہ صاحب کی نظر پڑ سکتی ہے وہ انہی کے ملک و مذہب کی ہیں اور بہتر ہوتا کہ مضمون نگار نے یہ شرط بھی نہ رکھی ہوتی کہ وہ صرف اپنے ہم مذہب اور ہموطن عورتوں پر آنکھ ڈالتے ہیں، اور صاف لکھدیا ہوتا کہ شہزادہ فیصل عشق الہٰی میں ایسے مشغول ہیں کہ وہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا ⁂ سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

جن صاحب نے اخبارات کو اسکی بھی اطلاع دیدی تھی کہ جہاز پر سے اُترنے
سے قبل صبح کا بہت سا حصہ شہزادہ فیصل نے عبادت الٰہی میں گذارا۔ کاش
انہوں نے اخبار والوں سے یہ بھی کہدیا ہوتا کہ شہزادہ فیصل کے مذہب میں غضِّ
بصر کا سخت حکم موجود ہے اور وہ اس پر پوری پابندی سے عامل ہیں۔ لیکن
وہ وہاں تھیٹر میں نیم برہنہ عورتوں کا تماشہ دیکھنے جانا اور ہالینڈ کی ملکہ سے ملاقات
کرنا اور پھر تمسک بالکتاب وسنتہ کا ادّعا یہ چیزیں کچھ زیادہ میل نہیں کھاتیں
اس سفر کا مقصد کہیں ساؤتھ فیلڈ کی قادیانی مسجد کا افتتاح بتایا گیا ہے
حالانکہ بالآخر اس سے انکار کر دیا گیا۔ اور کہیں معمولی سیاحت اور انگلستان
کی عام زندگی اور وہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کرنا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ
تمام اخبارات نے لکھا ہے کہ گو یہ سفر ظاہراً "غیر رسمی" ہے لیکن صرف مسجد کے
افتتاح کے لئے اختیار نہیں کیا گیا بلکہ سیاست کو بھی اسمیں دخل ہے اور "غیر رسمی" کے
سیاسی لغت میں ایک خاص معنی ہوتے ہیں۔ "اس سفر سے یہ فائدہ اُٹھایا جائیگا
کہ جو خوشگوار تعلقات برطانیہ عظمیٰ اور ابن سعود کے درمیان قایم ہیں ان پر
مہر توثیق و تصدیق کی جائے۔"

یہ مضمون جہاں ایڈنبرا کے مشہور اخبار اسکاٹسمین میں ۲۳ ستمبر کو شایع ہوا
ہے وہیں برمینگھم کے مشہور اخبار برمینگھم پوسٹ میں بھی اسی تاریخ اور انہی
الفاظ میں شایع ہوا ہے۔ جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ سرکاری تحریک پر مختلف
اخباروں میں شایع کرا دیا گیا ہے اور یقیناً حکومت برطانیہ اور شہزادہ فیصل دونوں
نہ صرف اس کے مضمون سے آگاہ ہیں بلکہ اس سے متفق ہیں لیکن لندن کے "سنڈے

ٹائمز،، نے تو اس حقیقت کو اور بھی آشکارا کر دیا۔ اس لئے کہ اس میں درج ہے کہ اخبار کے نامہ نگار نے شہزادہ فیصل سے ملاقات کی اور مسٹر جارڈن برٹش ایجنٹ و قونصل مقیم جدہ کے توسط سے جو شہزادہ موصوف کے اسوقت پرائیویٹ سکریٹری ہیں گفتگو کی تو شہزادہ نے فرمایا کہ میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ شاہ انگلستان کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے میرے والد کو رسمی طور سے تسلیم کر لیا اور نیز اس لئے کہ میں برسوں سے آپ کے ملک کی زیارت کرنیکا خواہشمند تھا،،

ایک اور اخبار نے لکھا ہے کہ وہابیوں کے سردار سلطان ابن سعود نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی ہے کہ وہ انگلستان میں اس طرح رہیں کہ برطانیہ کی گورنمنٹ کو راضی کرنے کی حقیقی خواہش ظاہر ہو،،

اور اخبار مذکور کا بیان ہے کہ گو نوجوان شہزادہ ابھی لڑکا ہے، مگر اپنے باپ کی خواہش کو بڑی ہوشیاری سے پورا کر رہا ہے۔ حقیقتاً شہزادہ فیصل اس ہوشیاری اور چالاکی کا ثبوت دے رہے ہیں جسکی توقع ان کے سن سے نہیں کی جا سکتی تھی۔

،، سنڈے ٹائمز،، نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے اور اسکی سرخی یہ دی ہے کہ ہماری قوم کو ایک ،،لطیف اعزاز،، بخشا گیا ہے۔ وہ لطیف اعزاز یہ ہے کہ شہزادہ فیصل کا جہاز چند گھنٹوں کے لئے مارسیلز میں رکا۔ اول تو اکثر مسافر یہیں اتر تے ہیں اور خشکی کے راستے سے فرانس ہو کر انگلستان جاتے ہیں۔ مگر شہزادہ موصوف براہ سمندر سیدھے انگلستان گئے۔ اور پلیمتھ کے بندرگاہ پر اترے لیکن جو لوگ سمندر کے راستے سے بھی انگلستان جاتے ہیں وہ بھی اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے

کے لئے جو جہاز کے سفر میں رہ جاتی ہیں راستے کی بندرگاہوں پر چند گھنٹوں کے لئے ضرور اُترنے ہیں۔ شہزادہ موصوف کو بھی دعوت پہنچی۔ مگر آپ نے فرمایا کہ میں اس دعوت کا مشکور ہوں مگر معذور ہوں۔ انگلستان ہی پہلا ملک ہے جہاں میں جا رہا ہوں اور انگلستان ہی کی زمین پر پہلی بار میرا قدم پڑنا چاہیئے۔"

سلطان ابن سعود فرمایا کرتے تھے کہ انا بادو (میں تو ایک بدو ہوں) مجھے یورپ کی سیاست نہیں آتی۔ میں تو صرف کتاب اور سنت کو جانتا ہوں۔ ان کے صاحبزادے نے اپنے اس سفر میں کتاب و سنت پر عمل کا تو کچھ ایسا زیادہ ثبوت نہیں دیا ہے۔ مگر یہ ضرور ثابت کر دیا ہے کہ یورپ کی سیاست کا انہیں کافی علم ہے۔

"سنڈے ٹائمز" کے نامہ نگار کی ملاقات کے دوران میں انگلستان کی تعریفیں کرتے کرتے ان کی زبان سوکھی جاتی تھی۔ اور واقعی ایک بادیہ نشین کے لئے لندن جیسے شہر میں عجائبات ہی عجائبات ہیں۔ انکو دیکھ کر جو قلب کی کیفیت ہوئی ہوگی اسکا اظہار کچھ جرم نہیں۔ مگر باریک بین سیاسی نگاہیں اسکو بھی تاڑ جائیں گے کہ گویہ سب اظہار حقیقت ہی سہی لیکن کم از کم "غیر رسمی" خوشامد سے بھی خالی نہیں۔

شاہزادہ فیصل کا ارادہ اکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کی سیر کا بھی تھا چونکہ وہ انگلستان کی پوری زندگی سے واقف ہونا چاہتے تھے اسلئے گھڑ دوڑوں میں بھی شرکت کا ارادہ تھا۔ فٹ بال میچ اور تھیٹر بھی دیکھتے تھے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر عبداللہ دملوجی یا مسٹر جارڈن نے شہزادہ کو لندن کے دو چار نایٹ کلب (شبینہ کلب) بھی دکھائے یا نہیں جن کے دیکھے بغیر گو دن کی زندگی کا پتہ چل سکتا ہے۔ مگر رات کی زندگی

سے واقفیت ممکن نہیں۔

گھڑ دوڑوں میں سوائے جوئے اور سیر کے کیا ہوتا ہے۔ مگر بتایا گیا ہے کہ شہزادہ موصوف کو گھوڑوں سے عشق ہے۔ اور ایک نجدی کو گھوڑوں سے عشق ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اسلئے کہ نجد سے بہتر گھوڑا دنیا میں نہیں۔

شاہزادہ فیصل پر سب سے گہرا اثر زبردست ریل کے انجنوں کا پڑا۔ جو نہایت تیز رو ہیں۔ واقعی جو لوگ اونٹوں کی سواری کے خوگر ہیں ان کے لئے وہ ریلیں عجائبات میں سے ہیں جو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک زائرین کو پانچ چھ گھنٹے میں پہنچا سکتی ہیں۔ امید ہے کہ شہزادہ فیصل حجاج و زائرین سے وصول کردہ محاصل گراں کو حجاز میں ریل بنوانے میں صرف کرائیں گے۔

مگر جب ہم اسی اخبار میں یہ پڑھتے ہیں کہ آپ کو موٹروں کے ساتھ بھی عشق ہے اور موٹروں کی دوڑ بھی ملاحظہ فرمائیں گے تو ریلوں کے جلد بننے کی امید کم ہو جاتی ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ حجاز میں سڑکیں بھی نہ بننے پائینگی مگر تیز رو موٹریں ضرور خریدی جائینگی۔ فٹ بال اخلاقاً ایک بے ضرر کھیل ہے۔ گو انگلستان کی قمار بازی نے اسکو بھی خراب کر دیا۔ شہزادہ فیصل کا فٹ بال کی ایک میچ دیکھنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ مگر جو گفتگو آپ کی فٹ بال کے میدان میں کھیل کے ایک اعلیٰ عہدہ دار سے ہوئی وہ بھی ایک خاص دلچسپی سے خالی نہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کھیل پسند آیا یا نہیں؟ تو آپ نے بیحد تعریف کی اور اپنے سکرٹری غالباً ڈاکٹر عبداللہ دملوجی وزیر خارجہ حجاز سے کہا کہ اسکو حجاز میں رائج کرنا چاہیئے۔ اس پر کھیل کے عہدیدار نے کہا کہ ہم خوشی سے ایک ٹیم حجاز کو آپ کے ساتھ کھیلنے کیلئے

بھیجدیں گے۔ شہزادہ نے اسے قبول کیا۔ سر ہلایا۔ اور پھر فرمایا کہ "حجاز میں آیندہ آپ کی ٹیم کی تشریف آوری سے بھی زیادہ عجیب چیزوں کے ہونیکا امکان ہے واقعی اگر یہی لیل و نہار رہے تو حجاز میں ناٹنہم کی فٹ بال کی ٹیم کے ورود سے بھی عجیب تر باتوں کے وقوع پذیر ہونیکا امکان ہے۔ مگر خدا حجاز کو ان عجیب تر چیزوں سے محفوظ رکھے۔

شہزادہ فیصل نے تو یہیں تک تقریر فرمائی، مگر بعد کو آپ کے ہمراہیوں میں سے ایک نے جو غالباً ڈاکٹر دملوجی ہی ہوں گے۔ بگڑی بات کو کسی قدر بنا لیا اور ولیسٹ منسٹر گزٹ کے نامہ نگار سے کہا کہ اگر فٹ بال ٹیم حجاز میں آئی تب بھی مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں داخل نہ ہوسکیگی۔ وہاں کوئی عیسائی اور غیر مسلم نہیں جاسکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ مسلمان ہوجائے یا مار ڈالا جائے۔

شہزادہ فیصل حکومت برطانیہ کے مہمان تھے۔ اور ہائڈ پارک ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ حسب دستور عام یہ خیال تھا کہ ہوٹل کی جس منزل کو آپ کے لئے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ آپ اسی میں کھانا تناول فرمائیں گے اور اسی کا انتظام کیا گیا تھا۔ مگر آپ نے آتے ہی خود درخواست کی کہ مجھے عام لوگوں کے ساتھ ہوٹل کے کھانے کے کمرے میں کھانا کھانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ آپ ہر وقت کا کھانا وہیں سب کے ساتھ کھاتے رہے۔ اور معمولی فہرست طعام میں سے کھانا چن لیا کرتے تھے۔ ممنوعات شرعی سے اجتناب کرتے رہے۔ خیر اس طرز عمل نے انگریزوں کے ذبیحہ وغیرہ کے متعلق تو کتاب و سنت کے مطابق فیصلہ کردیا اب علماء کرام ہم نیچریوں پر شاید اعتراض نہ کرسکیں۔

حکومت کی طرف سے اس مہمانداری کے علاوہ اور بھی اعزازات شاہزادہ فیصل کو ملنے والے تھے لیکن سب سے بڑا اعزاز خود شہنشاہ برطانیہ سے ملاقات کرنا تھا۔ جسکے بعد معلوم ہوا کہ شہزادہ فیصل اب "سر فیصل" ہو گئے۔ اور ان کے سینۂ مبارک پر سینٹ مائیکل اور سینٹ جارج کی صلیب آویزاں کی گئی۔

یہ نشان ۱۸۱۸ء میں پہلی بار قایم کیا گیا تھا۔ اور جزیرہ مالٹا اور اس کے ملحقات اور ارد گرد کے چند جزائر جو بحر ابیض میں واقع ہیں ان کے باشندوں اور دیگر برطانوی رعایا کے لئے جو بحر ابیض میں اعلیٰ اور راز داری کے منصب پر قایم ہوں، یہ نشان مخصوص تھا۔ لیکن بعد میں جب کہ بعض جزائر پر سے برطانوی سیادت اٹھا دی گئی اس نشان کے لئے نئے احکام جاری کئے گئے۔ اور ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۷ء کے احکام کی بناء پر اب یہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو تاج برطانیہ کی پیدائشی رعایا ہوں اور او نچے اور راز داری کے منصبوں پر اعلیٰ حضرت شہنشاہ کے استعماری مقبوضات میں مقرر رہے ہوں۔ یا آیندہ مقرر کئے جائیں۔ اور یا یہ نشان تاج برطانیہ کی اُن خدمات کے صلہ میں دیا جا سکتا ہے جو مستعمرات برطانیہ کے خارجی تعلقات کے متعلق وہ بجا لائیں۔

نہ معلوم شہزادہ فیصل کب سے پیدائشی برطانوی رعایا بنے اور اعلیحضرت شہنشاہ کے استعماری مقبوضات میں وہ کس او نچے اور راز داری کے منصب پر فایز ہوئے۔ اور تاج برطانیہ کی وہ کونسی خدمات ہیں جو اسکی استعماری پالیسی کی تائید میں وہ بجا لائے ہیں۔

اس نشان امتیازی کا "ماٹو"، جو لاطینی زبان میں ہے۔ اس کے معنے

"ایک آنے والے بہتر زمانہ کی فال نیک" کے ہیں۔

یہ صلیبی نشان، یہ استعماری پالیسی کی تائید کا صلہ۔ یہ برطانیہ کی رعایا بننا وغیرہ وغیرہ یقیناً ایک نئے آنے والے زمانہ کی فال ہیں۔ مگر وہ زمانہ حقیقتاً بہتر نہ ہوگا۔ نہ یہ کوئی فال نیک ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ جب ڈاکٹر حاکم دین جو جدہ میں برطانوی وائس قونصل ہیں اپنے شفاخانے کے لئے ادویات کے چند بکس اپنے ہمراہ لائے اور ان پر ریڈ کراس یعنی صلیب احمر کا نشان تھا تو اسی حکومت حجاز نے ان بکسوں کے اتارے جانیکی اجازت نہ دی۔ اور کہا کہ یہ صلیب کے نشان والے بکس مرکز اسلام میں نہیں اتارے جاسکتے۔ لیکن خدا کی شان ہے کہ وہی صلیب کا نشان بکسوں کی جگہ جلالۃ الملک الحجاز کے سینے پر آویزاں ہے۔

نکالا پیر سے، پھر دل میں رکھا دست وحشت نے

خدا کی شان ہے رتبہ ہو یہ خار مغیلاں کا (جوہر)

دعویداران تمسک بالکتاب والسنتہ سے پوچھا جائے کہ یہ کیا ہورہا ہے ایک طرف فرانس سے پینگ بڑھائی جارہی ہے تاکہ امیر علی فرانس کی کٹھ پتلی کی طور پر شام کا بادشاہ نہ بنایا جائے بلکہ یہ شرف شہزادہ سعودہی کو نصیب ہوجائے۔ اور اسطرح ثورہ شام کا خاتمہ کردیا جائے۔ اور مسلمانوں کو ایک غیر مسلم جابر اور ظالم حکومت کی غلامی میں بیچ دیا جائے۔

دوسری طرف ہالینڈ جاکر ایک ملکہ کے نرم نرم ہاتھوں سے اریج اور نیساؤ کی صلیب کا نشان سینے پر لٹکوایا جاتا ہے تاکہ جاوے سے حاجی برابر آتے

رہیں۔ اور حکومت حجاز اور شہزادگان آل سعود کے لئے روپیہ فراہم کرتے رہیں مصر تو البتہ جانا ضروری تھا۔ اس لئے کہ محمل پر جھگڑا ہو چکا تھا۔ اور مصر والے کہہ رہے تھے کہ اب محمل نہ جایا کرے۔ اور مصری صدقات بھی بھیجنا بند کر دیا جائے۔ لیکن اور کسی اسلامی ملک کا دورہ کسی ایک شہزادۂ نجد نے نہیں کیا۔ ہمارے لئے صرف توفیق شریف صاحب کافی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ برطانیہ، ہالینڈ، اور فرانس سے سمجھوتہ کر کے لوگوں سے زبردستی حج نہیں کرایا جا سکتا۔ اسکے لئے ہمارے قلوب کو مسخر کرنا شرط اول ہے۔ اور کاش سلطان نجد سمجھتے ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

لیکن ان کو تو پیر پرستوں کی دل آزاری منظور ہے گو ساتھ ہی ساتھ ان کے صاحبزادے انگلستان کے دو پیروں کا نشان اپنے سینہ پر آویزاں کرتے ہیں جس میں سینٹ جارج کی صلیب سرخ شامل ہے۔ اور سینٹ مائکل کی پوری شبیہ و تمثیل موجود ہے۔

کتاب اور سنت تو بس وہی ہے جو سلطان نجد اور شیخ نجد، قاضی عبد اللہ بن بلیھد، فرماویں۔ ان کا فرمانا قول فیصل ہے۔ مگر شہزادہ فیصل کی سنت سونے پر سہاگہ ہے اور فعل فیصل۔

غازی امان اللہ خان

(ہمدرد ۲۵- دسمبر ۱۹۲۷ء)



تاجدار افغانستان غازی امان اللہ خان یورپ جاتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے اسوقت تک وہ علی برادران اور مسلمانان ہند کی نظر میں انور پاشا وغیرہ کی طرح معزز و محترم و مکرم تھے۔ ان کے شاندار استقبال میں محمد علی کا بھی بڑا حصہ تھا۔ محمد علی غازی موصوف کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔

بمبئی کرانیکل کے نمایندے کو انہوں نے حسب ذیل بیان دیا۔ بیان اگرچہ طویل ہے لیکن حد درجہ دلچسپ اور ایک یادگار تقریب کا تاریخی بیان ہے اسلئے اسے درج کیا جاتا ہے۔

یورپ کے دوران قیام میں غازی موصوف اور ملکہ ثریا کی جو روش رہی اسے محمد علی نے پسند نہیں کیا۔ اسی لئے انقلاب افغانستان کے سلسلہ میں نادر خاں کے حامی رہے۔

مؤلف



اعلیٰ حضرت تاجدار افغانستان خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کا سفر اس سے بدرجہا زیادہ

تعجب خیز و حیرت انگیز ثابت ہوا جتنی کہ مجھے توقع تھی۔ میں نے اعلیٰ حضرت کی شخصیت کے متعلق اتنی باتیں سنی تھیں کہ میں کسی حد تک اسکو مبالغہ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن جس شخصیت کو ہم نے دیکھا ہے وہ اس شخصیت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ و ارفع ثابت ہوئی جسکی نسبت ہم نے محض سنا تھا۔ لیکن بہرصورت یہ چیزیں اعلیحضرت کے سفر کو تعجب خیز بنانے والی تھیں۔ اعلیحضرت کے سفر کا جو حصہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے وہ وہ ہے جس کا تعلق احمق عمال برطانوی حکومت سے ہے۔ برطانوی اخبارات نے اعلیٰ حضرت کو پراسرار بادشاہ لکھا ہے۔ لیکن میری رائے میں تو یہ دفتری حکومت دراصل "پراسرار حکومت" ہے۔

غازی امان اللہ خاں کو تخت نشین ہونے کے چند ہفتہ بعد ہی برطانوی حکومت کے خلاف جو تقریباً ایک صدی سے افغانستان پر مسلط تھی۔ افغانستان کی آزادی کے لئے جنگ چھیڑنی پڑی۔ اور سر ہملٹن گرانٹ چیف کمشنر صوبۂ سرحد کے الفاظ میں جو صلح کی گفت و شنید میں برطانیہ کے مختار و معتمد نمایندے بھی تھے۔ اس مختصر مگر پریشان کن جنگ کا خاتمہ برطانوی اقتدار کے خاتمہ کی صورت میں ہوا۔ اور برطانیہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایسے ہنگامہ خیز خیالات کے اظہار کے بعد ہر شخص کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ برطانیہ اپنے آزاد و خود مختار ہمسایہ کو دوست بنانے کی کوشش کریگی۔ خصوصاً اس بنا پر کہ برطانوی سرمایہ داری اور شہنشاہیت پرستی کا جانی دشمن جمہوریہ روس برطانیہ کا افغانستان میں اتنا ہی رقیب ہے جتنا کہ پہلے زار روس تھا۔

ہر شخص اس کا متوقع ہوگا کہ برطانیہ اپنے دوست امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے جواں بخت فرزند ارجمند کو مدعو کرنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہوگا۔ اور انکی مہمان نوازی نہایت فراخ دلی کے ساتھ کریگا۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی انہوں نے اُن کو مدعو کیا ہو،

لیکن مجھکو اس کا قطعاً علم نہیں۔

بہرصورت اب جبکہ اعلیٰ حضرت یورپ تشریف لے جارہے ہیں اور سلطنت افغانستان جو ہر طرف سے سلسلۂ کوہ اور خشکی سے گھری ہوئی ہے۔ اور اس اعتبار سے ایشیا کا سوئٹزرلینڈ ہے سمندر تک رسائی کا کوئی راستہ نہیں رکھتی۔ سوائے اس کے کہ ہندوستان کا راستہ اختیار کریں۔ اس لئے برطانوی دفتری حکومت کے لئے یہ بہترین موقع تھا کہ افغانستان کے جدید تاجدار کے دل پر جس نے اپنی حکمرانی کی ابتداء جنگ آزادی کے آغاز اور اپنے ملک کو برطانیہ کی غلامی سے نجات دلانے سے کی تھی اپنی محبت و دوستی کا سکّہ جما دیتی ہے

مجھے یقین ہے کہ حکومتِ ہند نے اعلیٰ حضرت شاہ علیا حضرت ملکہ افغانستان اور ان کے ہمراہیوں کے خیر مقدم اور مہمان نوازی میں کافی مالی فیاضی سے کام لیا ہوگا جس کا علم عنقریب محصول دہندگان سے ہوجائیگا۔ ریلوے گاڑی کے دو سیلونوں (ڈبوں) کی تعمیر جن پر تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ صرف ہوا اور شب و روز کی متواتر محنت و کوشش سے ایک ماہ میں بن کر تیار ہوئے فی الحقیقت اسراف بیجا تھا اور یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ برطانوی شاہی خاندان کے ارکان کے لئے جو سیلون تیار ہوئے تھے اور جنکو کچھ ایسا زیادہ زمانہ بھی نہیں گذرا خفیف سے ردّ و بدل کے بعد افغانستان کے شاہی مہمانوں کے لئے کیوں استعمال نہیں کئے گئے۔ لیکن خیر یہ فضول خرچی اس بنا پر قابل معافی ہوسکتی ہے کہ شاید حکومت ہند اپنے ایسے مہمان کے تالیف قلب کی آرزومند ہوگی جسکی شخصیت سے نہایت اہم اور دور رس اچھے یا بُرے نتائج وابستہ ہیں۔ بہرحال میں نے اعلیٰ حضرت شاہ اور علیا حضرت ملکہ افغانستان کے ورود مسعود سے صرف ایک روز قبل

بمبئی پہنچکر جو کچھ دیکھا اس نے مجھکو محو حیرت کر دیا کیونکہ وہ دفتری حکومت جو ہندوستان کے ٹیکس دہندگان کی جیبیں خالی کرا کر افغانستان کے شاہی مہمانوں کی مہمان نوازی میں انتہائی فیاضی کا ثبوت دیتی نظر آتی تھی۔ دیگر امور میں اسکا رویہ صریح طور پر معاندانہ اور حریفانہ تھا۔

اعلیٰ حضرت شاہ امان اللہ خان غازی ہندوستان کے ایسے راستہ سے گذر کر یورپ تشریف لے جا رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حتی الامکان ہندوستان سے باہر باہر تشریف لیجانا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت اسی راستہ سے پشاور سے بمبئی نہیں پہنچے جو عام ہے اور جس راستہ سے ہر شخص جاتا ہے۔ بلکہ آپ چمن سے کراچی تشریف لیگئے اور وہاں سے ہندوستان چھوڑ کر براہ سمندر بمبئی میں رونق افروز ہوئے اور یہاں بمشکل اتنے عرصہ قیام کیا ہوگا جتنے عرصہ ایک ایسا یورپین سرکاری ملازم ٹھہر سکتا ہے جو اپنے استحقاقی تین ماہ کی رخصت ولایت میں گذارنے کے لئے بیچین ہو۔

اس صورت میں ظاہر ہے کہ شاہ امان اللہ خاں ہندوستان کا کچھ مطالعہ نہ فرما سکے ہوں گے لیکن جو کچھ بھی اعلیٰ حضرت نے معائنہ فرمایا اسکے وہ یقیناً مستحق تھے اور برطانوی میزبانوں سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس مختصر سے قیام کے دوران میں حتی الامکان یہ کوشش کریں گے کہ اپنے شاہی مہمان کو ہندوستان کے متعلق زیادہ سے زیادہ واقفیت بہم پہنچائیں۔ لیکن جب میں نے سنا کہ برطانوی دفتری حکومت نے اہالیان بمبئی کی اس درخواست کو سرپائے استحقار سے ٹھکرا دیا کہ اعلیحضرت شہریار افغانستان کی آمد پر اعلیٰ حضرت کا جلوس ہندوستانی آبادی سے نکالا جائے تاکہ پردہ نشین خواتین بھی اس مسلمان بادشاہ اور بادشاہ بیگم کے دیدار سے مشرف ہوں تو میں حیران رہ گیا۔

میں اسکی وجہ صرف یہی سمجھ سکا کہ دفتری حکومت کی یہ آرزو ہے کہ آزاد و
خود مختار مسلمان بادشاہ اور بادشاہ بیگم کی تشریف آوری ہند کے موقعہ پر بمبئی کے مسلمانوں
کو خصوصاً اپنے جذباتِ محبت و خلوص کے اظہار کا موقعہ نہ دیا جائے لیکن مجھ جیسے شخص کے
لئے جو اس دفتری حکومت اور اسکے آقایان ولی نعمت کے ہاتھوں اس چیز کے سلسلہ میں
ہمیشہ تکالیف اُٹھاتا رہا ہے جسکو وہ اتحاد اسلامی کے نام سے موسوم کرتے تھے اور میں
بحیثیت مسلمان کے اسکو صرف اسلام کہتا ہوں۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن جب میں نے اس گاڑی میں جس سے کہ بمبئی آرہا
تھا یہ پڑھا کہ دفتری حکومت نے بمبئی کارپوریشن کے ارکان کو جن میں اکثریت غیر مسلموں
کی ہے اس امر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان کی بارگاہ
معلیٰ میں اسوقت سپاسنامہ خیر مقدم پیش کیا جائے جبکہ اعلیٰ حضرت باب الہند میں
داخل ہوں تو اس اعلانیہ اور احمقانہ دشمنی پر میں بیحد متعجب ہوا۔

جس زمانہ میں ہز ایکسلنسی وائسرائے نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں
کے لیڈروں کو اس غرض سے دعوت دی تھی کہ آئینی کمیشن کے متعلق لارڈ برکن ہیڈ کے
آخری اور قطعی احکامات کو سنیں اور ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں تو ان دنوں اخبار
"اسٹیٹسمین" کا نامہ نگار خصوصی دہلی میں موجود تھا۔ اس نے نہایت صحیح طور پر کہا
تھا کہ بظاہر قدرت نے برطانیہ کی قسمت میں لکھدیا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی حماقت سے
ہندوستان کے مضمحل اور افسردہ جذباتِ قوم پروری کو اُبھارتی اور زندہ کرتی رہے
اگر یہ خیال ڈائرآرکی (جنرل ڈائر کے افعال) اور سائمن کمیشن کے متعلق درست ہے، تو
دفتری حکومت کی اس حرکت کی نسبت بھی درست ہے کہ اس نے بمبئی کارپوریشن کو اعلیٰحضرت

شاہ افغانستان کی بارگاہ عالی میں سوائے گورنمنٹ ہاؤس کے اور کسی دوسرے مقام پر سپاسنامہ پیش کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ممکن ہے کہ اس رواج میں کچھ صداقت ہو کہ ایک اجنبی خود مختار بادشاہ کی خدمت میں برطانوی بادشاہ کے نمایندہ کی موجودگی میں بھی کوئی سپاسنامہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بمبئی کی تیرہ لاکھ آبادی میں سے ایک فرد بشر بھی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ان وجوہ میں ذرہ بھر بھی معقولیت اور صداقت ہے جو دفتری حکومت کی طرف سے گورنمنٹ ہاؤس کو سپاسنامے کے لئے مخصوص کرنے کی بنا پر پیش کی گئی تھیں۔

آجکل جبکہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ عناد اور کشیدگی کی حالت اس درجہ پر پہنچ گئی کہ کوئی شخص اپنا صبح کا اخبار اس اندیشہ اور خطرہ کے بغیر نہیں کھولتا کہ مجھے ضرور دو چار مقامات پر ہندو مسلم فسادات کی خبر پڑھنی ہوگی اس امر کا امکان تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں بھی جہاں ہر رنگ و نسل اور ہر مذہب و ملت کے لوگ آباد ہیں کسی نہ کسی گوشہ میں یہ خیال ہوگا کہ ایک مسلمان بادشاہ کا خیر مقدم ہو رہا ہے۔ اگرچہ وہ بادشاہ اپنی بے مثال رواداری اور ہندوستان کو متحدہ دیکھنے کی آرزو کے لئے مشہور ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ برطانوی دفتری حکومت نے ایسے خیال کے امکان ہی کو نیست و نابود کر دیا اور ہندو، مسلمان، پارسی، جینی اور ہر خیال کے لوگ اعلیحضرات شاہ افغانستان اور علیا حضرت ملکہ کی خدمت اقدس میں خلوص دل سے نہایت پرجوش خیر مقدم پیش کرنے کے لئے متحد ہو گئے۔ برطانوی دفتری حکومت نے مہمان نوازی کی بجائے اپنے احمقانہ اور علانیہ عناد سے بلاشک و شبہ ایک مرتبہ پھر ہماری پژمردہ اور مضمحل قومیت میں روح پھونک دی اور ہم نے اپنے ہمسایہ اسلامی ملک

سے جواں بخت تاجدار کا مسلمانوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستان کی متحدہ قوم کی حیثیت سے خیر مقدم کیا۔

علیا حضرت ملکہ افغانستان کی بارگاہ عالیہ میں جو خواتین بمبئی سپاسنامہ خیر مقدم پیش کرنا چاہتی تھیں اسکے سلسلے میں دفتری حکومت کی حماقت کے متعلق کیا عرض کروں یہ اتفاق سے میرا ہی مشورہ تھا۔ اور جب بمبئی آتے ہوئے ریل میں مجھکو معلوم ہوا کہ بمبئی کی خواتین نے میرے مشورہ کو قبول کر لیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے شاید چند ہی کو یہ خیال ہوگا کہ اس کا اصلی محرک کون ہے۔ تو مجھے مسرت ہوئی۔ ایک کیٹی بھی مقرر ہو گئی تھی۔ جس میں تمام ملتوں اور فرقوں کی نمایندہ خواتین شریک تھیں اور سپاسنامہ پیش کرنے کے لئے تمام انتظامات نہایت سرعت سے ہو رہے تھے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین بمبئی نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ لیڈی اروِن کو ایک گارڈن پارٹی دی جائے وہ خوشی سے ایسا کرنیکی مجاز تھیں لیکن یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ اور مختلف تھیں۔ اور ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

بہر حال جب میں ۱۳ دسمبر کو بمبئی پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ خواتین بمبئی کو اطلاع دی گئی ہے کہ علیا حضرت ملکۂ افغانستان کا ارادہ ہے کہ صبح سے شام تک سامان کی خریداری میں مصروف رہیں اس لئے انکو اتنی فرصت نہ ہوگی کہ خواتین بمبئی کا سپاسنامۂ خیر مقدم سوائے اس سہ پہر کے جبکہ لیڈی اروِن کے اعزاز میں گارڈن پارٹی دی جائیگی، اور کسی وقت قبول فرمائیں۔

ممکن ہے کہ یہ برطانوی رسم ہو کہ برطانوی ملک معظم کی رعایا برطانوی ملک معظم کی موجودگی میں کسی اجنبی آزاد، خود مختار بادشاہ کی خدمت میں سپاسنامۂ خیر مقدم

پیش نہیں کر سکتی اور شاید یہ بھی ہو کہ اس رسم کے مفہوم کے مطابق وایسرائے ملک معظم شاہ برطانیہ کے ہم پایہ ہو، اگرچہ مجھے شبہ ہے کہ صوبوں کے گورنر بھی اس رواج کے مفہوم کے مطابق برطانیہ کے بادشاہ ہوں گے، جیساکہ سرلیسلی ولسن گورنر بمبئی کی نسبت کہا گیا تھا جنہوں نے اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان کا باب الہند پر خیر مقدم کیا تھا (مجھکو معلوم ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان کو بھی گورنر بمبئی کی نیابت کے متعلق شکوک تھے اور اسی وجہ سے شاہی ضیافت میں اعلیٰ حضرت کی طرف سے ایک گھنٹہ کی تاخیر کر دی گئی تھی جس سے گورنر کو یقین ہو گیا تھا کہ اعلیٰ حضرت کے شکوک بالکل صحیح اور درست ہیں۔) بہر حال کچھ بھی ہو لیکن وایسرائے کی بیوی کی کوئی آئینی اور سرکاری حیثیت نہیں۔ دہلی میں جو ۳-۱۹۰۲ء شاہی دربار ہوا تھا تو اس میں لارڈ کرزن نے ڈیوک آف کناٹ برادر خورد ملک معظم شاہ برطانیہ پر سبقت کی تھی۔ اور اگرچہ بعض لوگوں نے اسکو بجد ناپسند کیا تھا مگر جبراً قہراً سب کو برداشت کرنا پڑا تھا لیکن اس بات کی سب نے شکایت کی تھی کہ اگر وایسرائے بادشاہ کے بھائی پر سبقت کر بھی سکتا ہے تو وایسرائے کی بیوی کو ڈچس آف کناٹ پر سبقت نہ کرنی چاہئے تھی۔

مجھکو تو خوشی ہے کہ برطانوی دفتری حکومت نے بھی اس امر پر اصرار نہیں کیا کہ علیا حضرت ملکہ افغانستان کی خدمت میں ہندوستان کی خواتین ہر اکسیلنسی وایسرائن کی موجودگی میں اسی طرح سپاسنامہ پیش نہیں کر سکتیں جسطرح کہ علیا حضرت ملکہ کے محترم شوہر کی بارگاہ عالی میں ہز اکسیلنسی وائسرائن کے شوہر کی موجودگی میں کوئی سپاسنامہ پیش نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا یہ بات کچھ کم مذموم تھی کہ برطانوی دفتری حکومت نے

اس امر پر اصرار کیا کہ اس سپاسنامۂ خیر مقدم میں جو علیا حضرت ملکۂ افغانستان کی بارگاہ عالیہ میں پیش ہونیوالا تھا۔ علیہ حضرت کے اسم گرامی کے ساتھ ہز ایکسلنسی وایسرائن کا نام بھی شامل کر دیا جائے؟

یہ ظاہر ہے کہ خواتین بمبئی کا کوئی ارادہ ہز ایکسلنسی وایسرائن کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنیکا نہ تھا۔ اور اگر ان کا ارادہ ہوتا بھی تو ان کو اسی طرح کوئی شخص سپاسنامہ بھی پیش کرنے سے نہ روکتا جس طرح کہ ہز ایکسلنسی وائسرائن کو گارڈن پارٹی دینے کے معاملہ میں کسی نے بھی انکو نہ روکا تھا۔

(۲)

ایسے اشخاص سے جو اسدرجہ تنگ دلی اور حماقت کا اظہار کر سکے ہوں جیسا کہ عمال حکومت کی جانب سے خواتین کے سپاسنامے کے سلسلے میں ظہور میں آیا۔ یقیناً یہی توقع ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش و آرزو کی بھی مخالفت کریں گے کہ اعلیٰحضرت شاہ افغانستان کا پبلک طور سے خیر مقدم کیا جائے۔ چنانچہ جسکی توقع تھی وہی وقوع میں آیا۔

انجمن اسلام بمبئی کی یہ خواہش بالکل قدرتی تھی کہ وہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کرے یا اعلیٰحضرت کی خدمت میں ایک گارڈن پارٹی پر مدعو کرے گو اس غرض کے لئے اسکا قطعہ سبزہ زار بہت ہی کم تھا۔ لیکن اس واقعہ کو بہانہ بنا کر بمبئی کے تمام مسلمانوں کو اس سعادت سے محروم کرنا کہ وہ اعلیٰ حضرت کا عظیم الشان استقبال پبلک طور سے نہ کر سکیں۔ ایک ایسا فعل تھا کہ جو علانیہ اور احمقانہ دشمنی کے مرادف تھا بمبئی میں جہاں دس ہزار مسلمانوں کے جلسے میں ایک استقبالیہ کمیٹی پہلے

سے قایم ہو چکی تھی، وہاں کی مسلم پبلک سے یہ کہنا کہ وہ اپنے میں سے صرف ایک درجن اشخاص کو سپاسنامہ پیش کرنے کے لئے یا انجمن اسلام کے گارڈن پارٹی کے موقع پر بھیجدیں، یا پھر عمال حکومت کے مقدس مقام یعنی مالابار پوائنٹ حقیقتاً گورنمنٹ ہاؤس میں دیوانگی کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔

اس سلسلہ میں جو کچھ میرے علم میں ہے میں اسکو طشت از بام نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا یہ عرض کرنا ہی کافی ہوگا کہ جو لوگ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جلسوں کی تنظیم کے روح رواں تھے وہ آخر تک ثابت قدم رہے اور انہوں نے اپنے مقام سے ایک انچ بھی ہٹنے سے صاف انکار کر دیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ٹھیک اسی دن جو اس عظیم الشان استقبال کے لئے مقرر ہو چکا تھا عمال حکومت کو اسی طرح گھٹنوں کے بل جھکنا پڑا جس طرح کہ اسکو کارپوریشن کے سپاسنامہ کے معاملہ میں جھکنا پڑا تھا۔

ہمارے صوبہ میں ایک مثل مشہور ہے کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی بھلی، جب عمال حکومت اسکو نہ روک سکے کہ اعلیٰ حضرت کا پبلک طور سے استقبال نہ ہو سکے تو کہا جاتا ہے کہ پولیس کمشنر نے یہ چال چلی کہ استقبالیہ کمیٹی کے دو ارکان کو کمیٹی کے دیگر ارکان کی لاعلمی میں اس بات پر راضی کر لیا کہ جلسہ کا وقت ۱۵ تاریخ کی شب کے بجائے ۱۶ کی صبح کے وقت میں تبدیل کر دیا جائے کیونکہ بقول انکے ایک اسلامی تاجدار کا شب کے وقت خیر مقدم کرنا مسلمانوں کے لئے محفوظ وقت نہیں ہے!

مسلمانوں نے تو اس راستہ پر جو استقبالیہ کمیٹی نے منتخب کیا تھا نہایت ہی قلیل وقت میں چراغاں اور روشنی کا انتظام بھی کر لیا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ڈونگری

کے میدان میں جمع ہو رہے تھے۔

اگرچہ ٹکٹوں کی تقسیم استقبالیہ کمیٹی کے ان ہی دو ارکین نے جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، عمال حکومت کی ہدایت پر ملتوی بھی کر دی تھی! لیکن لوگوں کا یہ سب اشتیاق بیکار تھا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی تو عمال حکومت نے پہلے ہی گھسیٹ لی تھی۔ اور اسطرح ہزارہا اشخاص کو مایوس ہو کر لوٹ جانا پڑا تھا کیونکہ اعلےٰ حضرت شاہ افغانستان مسلمانوں کے ان محلوں سے گذر کر جہاں چراغاں کیا گیا تھا ڈونگری کے وسیع میدان میں جہاں روشنی کی گئی تھی خیر مقدم کے لئے تشریف نہ لا سکے تھے۔

جو لوگ ہندوستانی پبلک کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کے استقبال اور خیر مقدم کے جلسوں کے لئے رات ہی کا وقت مناسب ہوتا ہے۔ غریب سے غریب شخص بھی دن کے کام سے فارغ ہو کر آسکتا ہے علاوہ ازیں بمبئی کے لوگ یوں بھی سو کر دیر سے اُٹھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ حضرت جب بعد دس بجے دن کے تشریف لائے تب بھی تقریباً دو لاکھ اشخاص کے ہجوم نے استقبال کیا اور اعلیٰ حضرت کے بعد تک لوگوں کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔

اعلیٰ حضرت ہمارے نظم وسلیقہ کا کوئی بہت اچھا اثر لیکر نہیں گئے ہوں گے لیکن جیسا کہ ممدوح نے انجمن اسلام کے ہال میں خود اقرار فرمایا تھا ہمارے جوش اور ہماری الفت ومحبت کا زبردست اثر لے کر گئے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب اثر خود ہمارے قلوب پر اعلیحضرت نے اپنی صفات عالیہ کا قایم کیا کہ رسمی

آداب سے کلیتہً بے پرواہی، عوام کے ساتھ خلا ملا میں دلی انبساط کا حاصل ہونا اور پھر آپ کا اس حالت میں بھی تحمل و رواداری کا دامن ہاتھ سے نہ دینا۔

ان حالات میں، جنکو پولیس کمشنر اسی وقت سے جانتے تھے جبکہ انہوں نے جلسہ کا وقت بجائے رات کے وقت کے تبدیل کر کے دن کا وقت رکھا تھا اعلیٰ حضرت کوئی طویل تقریر نہ کر سکے۔ لیکن سہ پہر کو جب اعلیٰ حضرت نے انجمن اسلام ہال میں تقریر فرمائی تو گورنر اور مسلمانان بمبئی کے اکابرین کے سامنے اس کا اظہار فرمادیا کہ صبح کے استقبال کا حضور ممدوح پر کیا اثر ہوا تھا۔

صبح کے جلسہ میں اعلیٰ حضرت نے پہلے ہی ہم پر اسکا اظہار کیا تھا کہ حضور ممدوح کی شخصیت وہ شخصیت ہے جس پر رسمی استقبال، خواہ وہ کیسا ہی شاندار کیوں نہ ہو کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتا۔ لیکن عوام کے اس غیر رسمی جوش و خروش نے جیسا کہ خود حضور ممدوح نے صاف دلی سے فرمادیا تھا۔ ان کے دل پر قبضہ کر لیا تھا۔ پس انجمن اسلام کے سامعین کو دیکھ کر جو بہت حسن و زیبائش اور صرف کثیر کے ساتھ آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا نیز ان لوگوں کو بہت قیمتی اور اعلیٰ درجہ کی تراش کے ملبوسات زیب بدن کئے ہوئے دیکھ کر اور رسمی آداب کے لحاظ سے سرد مہر پا کر اعلیحضرت نے تمام آداب کو بالائے طاق رکھدیا۔ اور ارشاد فرمایا:۔

" اس سے قبل کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں میں چاہتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ کے نام سے کلام شروع کروں اور آپ کے جذبات کو تحریک دوں پس جب میں اللہ اکبر کا نعرۂ تکبیر لگاؤں تو آپ بھی اس میں شرکت کیجئے "

چنانچہ اسطرح انجمن اسلام کا ہال بھی صبح کے جلسۂ عام میں تبدیل ہو گیا۔ اور

گورنر بمبئی اور سر فرانسس ہمفریز نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جس بات سے بادشاہ کو محروم رکھنے کے لئے شاہ کے استقبال کو انجمن ہال یا گورنمنٹ ہاؤس ہی تک محدود رکھا جاتا تھا وہ کیا تھا اور یہ ہستی جو انسانوں کے اندر ایک بادشاہ کی اور بادشاہوں کے زمرہ میں ایک انسان کی حیثیت رکھتی ہے کس طرح مودب اور مخصوص استقبالی مجالس کو نہایت پرجوش عوام کے ان جلسوں کی ہئیت میں تبدیل کرسکتی ہے۔ جہاں جذبات انسانی کی لہریں ان قیود سے بالاتر ہو جاتی ہیں جو پولیس کے ذریعہ سے قایم کی جائیں۔

امان اللہ خان نے اپنے ان سامعین سے جن کا شمار طبقۂ اعلیٰ میں تھا صاف صاف کہدیا کہ انکو "عمومیت" سے کیا شغف اور عوام کے ساتھ کس درجہ الفت ہے اور ان کے قلب میں عوام کی کیا وقعت ہے۔ انہوں نے، ان لوگوں کے منہ پر کہدیا کہ آپ نے تعلیم کے بارے میں اپنی جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے وہ صحیح ہے لیکن تعلیم صرف اعلیٰ طبقات ہی تک محدود نہیں ہونا چاہئے، بلکہ یہ تعلیم عامۃ الناس کی تعلیم ہونی چاہئے۔ انہوں نے ان لوگوں سے فرمایا کہ آپ لوگ نہایت زینت اور بہترین تراش کے لباس زیب بدن کئے ہوئے ہیں لیکن میں نے آج ہی صبح کے جلسہ میں آپ ہی لوگوں کے ہم مذہبوں کو نہایت خراب لباس میں اور بعض حالات میں بہت ہی کم لباس میں ملبوس دیکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بجائے اسکے کہ غریب اور امیروں کے لباسوں میں اس درجہ نمایاں فرق ظاہر ہو آپ بھی جہانتک ممکن ہو ان جیسا ہی لباس پہنیں۔

بادشاہ نے بتلایا کہ کس طرح افغانستان میں اسکی کوشش کیجاتی ہے

کہ عام لوگوں کو بھی مناسب لباس میسر آئے۔ اور اگر عوام کو پورا لباس میسر نہ آئے تو اعلیٰ طبقہ کے پاس تو کپڑوں کی افراط نہ ہو۔

اس وعظ و پند سے زیادہ کوئی وعظ و پند نہ تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ جس منتخب جماعت نے اسکو سنا وہ جلد اسکو فراموش نہ کریں گے۔ تمتمائے ہوئے چہرے اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ جب اعلیٰ حضرت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ میں اس دن کی آمد کا مشتاق ہوں جب میں اپنی جان اپنے ملک اور اپنے مذہب کے لئے نثار کرسکوں تو سامعین میں سے کٹر سے کٹر خوشامدی و جی حضوری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا ہوگا۔

اس سے زیادہ اور کیا موزوں مشورہ اعیان و اکابرین ملی کے لئے ہوگا۔ جیسا کہ بادشاہ نے کہا کہ مجھے جو اختیار اور جو رتبہ حاصل ہے یہ اختیار اور یہ رتبہ وہ ہے جو میری قوم نے مجھے عطا کیا ہے ورنہ میں ایک فرد واحد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ میں صرف معمولی بے حیثیت "امان اللہ" ہوں۔

میں کہاں تک اعلیحضرت کے متعلق اپنے ان تاثرات کو بیان کئے چلا جاؤں کہ میں نے ان میں کیا دیکھا۔ میں اس مبحث پر کالم لکھ کالم پُر کرسکتا ہوں۔ لیکن میرے پاس وقت کم ہے اور آپکے اخبار کے ناظرین بھی اُکتا جائینگے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے برتر نے افغانستان کو اسکے فرمانروائے کی ذات میں ایک ہستی ایسی عطا کی ہے جو ان کروڑوں انسانوں کے اندر جو اس خاکدان عالم پر بستے ہیں ایک ایسی شخصیت ہے جسکے پاس ایک سچے دل کے ساتھ ایک ہوشمند دماغ بھی ہے اور دل و دماغ کا یہ اشتراک افسوس ہے کہ اس دنیا میں شاذ و نادر ہی ہوا کرتا ہے لیکن جب

کبھی ایسا اشتراک پایا جاتا ہے تو یہ ایسے شخص کے اندر موجود پایا جاتا ہے جو تاریخ کو بناتا اور انسانوں کا مصلح ہوتا ہے۔

افغانستان بہرحال ایک چھوٹا سا خطۂ ملک ہے گو اسکے باشندے تمام دنیا میں اپنی شجاعت اور قوت و بسالت کے لئے شہرت رکھتے ہیں لیکن افغانستان کا یہ بادشاہ بلا شک و شبہ افغانستان ہی کے لئے نہیں پیدا ہوا بلکہ اس دنیا کے بہت بڑے حصے کی اصلاح اسکی ذات سے مطلوب ہے۔

میں نہ بادشاہ پرست ہوں نہ بادشاہوں کا مدّاح ہوں لیکن شاہ امان اللہ خان کی شخصیت ایسی ہے کہ کسی جمہوریت کا جسکے لئے وہ کام کرنا پسند کریں ان کو نہایت سہولت سے صدر منتخب کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں نہ ذاتی تشخص و اقتدار کی خواہش معلوم ہوتی ہے اور نہ اپنے نسل کے لئے کسی حکمراں خاندان کی بنیاد ڈالنے کی تمنا اور نہ غیر ممالک کے فتح کی کوئی آرزو بلکہ انکی فتح ہر جگہ جہاں کہیں کوئی ایک ہم جنس ان کو ملے انساں کے دلوں کو تسخیر کرنا ہو گی

(۳)

اس مختصر سے عرصہ میں جس میں شاہ امان اللہ ہم لوگوں کے پاس رہے ان سے بہت سی ایسی باتیں سرزد ہوئیں کہ لوگ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے لیکن میں یہاں صرف ایک واقعہ ہی کا تذکرہ کروں گا۔

مہاتما گاندھی علالت کی وجہ سے بمبئی آنے کے قابل نہ تھے لیکن ہماری "پیاری با" (یعنی اہلیہ مہاتما گاندھی) دیویداس کی تیمار داری کے لئے یہاں موجود تھیں۔ وہ بمبئی سے اسی شب میں جا رہی تھیں جس شب میں ڈونگری پر جلسہ

استقبال کا ابتدائً انتظام کیا گیا تھا۔ دیو یداس نے مجھے اسکی نہایت افسردگی سے اطلاع دی تھی۔ کہ وہ دوسرے دن صبح تک جبکہ استقبال ملتوی کیا گیا تھا وہ نہیں ٹھہر سکی

لیکن دوسری صبح کو میں دیو یداس اور راماداس دونوں کو دیکھ کر اور ان کے ساتھ اپنی پیاری با کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا۔ اور ان سب کے بیٹھنے کے لئے اچھی جگہ تلاش کر لی۔ تاہم ایسی جگہ نہ تھی جیسی میں چاہتا تھا۔

حکیم اجمل خان صاحب اپنی جامعہ ملیہ کا سپاسنامہ پڑھ رہے تھے تو بھائی منی لال کوٹھاری نے مجھ سے آہستہ سے کہا کہ اگر "با" کو اوپر ڈائیس پر بلا لیا جائے تاکہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ جو سپاسنامہ پیش کر رہے تھے بیٹھ جائیں تو شاید بہتر ہوگا۔ یہ مشورہ مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے انہی سے کہا کہ وہ جا کر انہیں لے آئیں اور ان کے ساتھ ہی مسز بسنٹ، مسز نائیڈو، اور دادا بھائی نوروزجی کی سب سے چھوٹی پوتی کو بھی۔

جب یہ سب ڈائیس پر آ گئے تو میں نے اعلیٰ حضرت کو مطلع کیا کہ "با" مہاتما گاندھی کی زوجہ ہیں۔ ان الفاظ کو سنکر شاہ امان اللہ فوراً اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ اور با سے خواہش کی کہ وہ اس اونچے چبوترے پر آ کر بیٹھیں جہاں انکی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ اور اپنے ایک افسر سے دوسری کرسی لانے کے لئے کہا۔ لیکن با نے صرف اونچے چبوترہ پر ہی بیٹھ جانا پسند کیا۔ اور مسز بسنٹ مسز نائیڈو اور دادا بھائی نوروزجی کی پوتی بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئیں اور صوفے کو جو ان کے وزراء کے لئے آئے تھے واپس کر دیا۔

جس طرح اعلیٰ حضرت نے ان خواتین کا استقبال کیا وہ بالکل عجیب تھا اس سے

نہ صرف احترام کا اظہار ہوتا تھا بلکہ محبت کا بھی لیکن اس واقعہ سے بھی کسی شخص کو اس کا تو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے بعد پیش آیا۔

جامع مسجد میں اسی دن جس دن ڈونگری میں پبلک استقبال ہوا نماز جمعہ پڑھنے اور اعلیٰ درجہ کا خطبہ دینے اور خدائے تعالیٰ سے خود اپنے اور تمام نمازیوں کے لئے نہایت متاثر کن اور رو رو کر دعا مانگنے کے بعد جب انکو اپنی موٹر تک پہنچنے میں بہت زیادہ خوش مزاجی لیکن زور کے ساتھ اس عام رو میں اپنا راستہ بنانا اور اسکے بعد کاریوریشن ہال، اور پھر انجمن اسلام ہال جانا پڑا ہر شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اس سخت مصروفیت کے بعد ان کو باوجود ان کے زبردست قوتِ جسمانی کے کیا کچھ نہ برداشت کرنا پڑا ہوگا۔

چنانچہ جب وہ گورنمنٹ ہاؤس پہنچے، وہ اپنے میزبان سر لیسلی ولسن اور دوسرے لوگوں سے رخصت ہو کر اور اپنی ملکہ کو ساتھ لیکر تازہ ہوا کھانے کے لئے باہر اکیلے ٹہلنے کو نکلے۔ آپ اسکو محض ایک واقعہ سمجھئے یا ایک امر اتفاقی سے منسوب کیجئے یا اسکو مصلحت خداوندی کہئے یا جو کچھ ایسے معاملات میں آپ محسوس کیا کرتے ہوں وہ سمجھئے مگر یہ ضرور ہے کہ جو بھی اس حال سے واقف ہوگا اُسے یہ معلوم کر کے حد درجہ دلچسپی ہوگی کہ "با" ہماری پیاری "با" مہاتما گاندھی کی اہلیہ بھی اسوقت دیو یداس اور جمنا بن اور کچھ اور بچوں اور دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ تازہ ہوا کھانے کے لئے نکلیں اور یہ لوگ بھی ورلی کی جانب چلے۔ ان لوگوں نے اپنی موٹر سات یا ساڑھے سات

بجے چھوڑ دی تھی۔ اور آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ دیویداس اور اور بچے تو آگے نکل گئے اور با، اور جمنا بن ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے کہ اتنے میں ایک پارسی صاحب نے دیویداس کے پاس آکر پوچھا کہ کیا وہ خواتین جو تمہارے پیچھے پیچھے آ رہی ہیں تمہاری پارٹی کی ہیں؟ دیویداس کے تسلیم کرنے پر ان پارسی صاحب نے دیویداس کو مبارکباد دی اور کہا کہ اعلیٰحضرت شاہ افغانستان اور ملکہ افغانستان نے ابھی ابھی ان کو روک لیا ہے اور وہ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔

دیویداس کی قدرتی خواہش یہ تھی کہ وہ بھی واپس جاکر دیکھیں لیکن ان پارسی بزرگ نے دور اندیشی سے یہ کہا کہ شاید ایسا کرنا ہمارے شاہی مہمان کے حق میں جو خاموشی سے ٹہلنے کے لئے نکلے ہیں مناسب نہ ہوگا۔ اسلئے دیویداس تو وہیں رہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد افغانستان کے بادشاہ اور ان کی ملکہ ان کے پاس سے گذرے اور اس ٹولی کو دیکھ کر کچھ کہتے ہوئے سنائی دئیے جس کا مطلب ان پارسی صاحب نے یہ بتایا کہ ہمارے متعلق فرمایا ہے کہ ان میں سے دو سودیشی کپڑے پہنے ہوئے ہیں (یعنی دیویداس اور ان کے ساتھی) اور تیسرا (یعنی پارسی) بدیشی۔

جب اعلیٰحضرت گذر کر چلے گئے تو دیویداس دوڑ کر با اور جمنا بن کے پاس پہنچے اور ان سے پوچھا کہ اعلیٰحضرت کی ان سے کیا گفتگو ہوئی تب انہیں معلوم ہوا کہ جب اعلیٰحضرت ہمارے قریب پہنچے تو انہوں نے نہایت خوش خلقی سے دریافت کیا کہ تم کون لوگ ہو؟ جمنا بن نے ہندستانی

میں جواب دیا کہ ہم گجراتی ہیں اور میری ساتھی خاتون مہاتما گاندھی کی اہلیہ ہیں۔ اس پر امان اللہ خان نے فوراً صبح کی ملاقات کا ذکر کیا اور اشارہ سے بتایا کہ ڈائس پر با بیٹھی تھیں۔ پھر پوچھا کہ مہاتما جی کیسے ہیں اور کہاں ہیں انہوں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اور پھر ذرا بہتر ہندوستانی میں وہ الفاظ کہے جنکو انہوں نے با سے چاہا کہ بطور پیغام کے مہاتما گاندھی تک پہنچادیں۔

شاہ افغانستان نے تب کہا کہ "مہاتما جی کو بولو میں ان کا بھائی ہوں۔ میں ان کا دوست ہوں۔ میں ان کا بہت بڑا دوست ہوں"

اسکے بعد انہوں نے با سے کہا کہ ہمارا نام یاد رکھنا لیکن بچاری با صحیح طور سے امان اللہ کے نام کو ادا نہیں کرسکتی تھیں اس لیے "امان اللہ" کو دو مرتبہ اپنا نام دہرانا پڑا اور اسوقت تک وہ با کے پاس سے نہیں ہٹے جب تک کہ با نے صحیح طور سے ان کے نام کو ادا نہیں کیا اور یاد نہیں کرلیا اسکے بعد انہوں نے اپنی ملکہ کی طرف رخ کیا اور با سے کہا کہ "یہ ہماری عورت ہے" مجھے یقین ہے کہ با امان اللہ کا نام کبھی فراموش نہیں کریں گی جنہوں نے ہندوستان میں کم از کم ایک دل پر تو قبضہ کرلیا ہے، اور کیا میں ان واقعات سے شبہہ کرسکتا ہوں کہ اور دلوں کا بھی یہی حال ہوگا؟

فکر و نظر

فہرست مضامین

(۱) تلخ تجربے ۲۸۷

(۲) اسمبلی میں ایک حادثہ ۲۹۹

تلخ تجربے!

ہمدرد ۱۴ اگست سنہ ۲۷ء

ذیل کا مضمون بالکل ذاتی ہے، لیکن اسے اس لئے درج کیا جارہا ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ محمد علی کو کیسے کیسے تلخ تجربوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ کیسی کیسی کٹھنائیاں انہیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ کس کس طرح لوگ جھوٹی جھوٹی افواہیں اُڑا اُڑا کر پریشان کرتے تھے۔

محمد علی کے سینہ میں کیسا محبت کرنے والا دل تھا؟ پیارے بھتیجے کی خبر وفات سنکر وہ اپنی مفلسی، غریبی، سب بھول جاتے ہیں۔ خلافت کا بل اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں۔ شملہ کے افسروں کو ٹیلیفون کرتے ہیں۔ جنگ کرتے ہیں۔ اور اسوقت تک خاموش نہیں ہوتے، جب تک تھک نہ جائیں، یا کام نہ بنجائے۔

(مؤلف)

---

۱۰ اگست کو میں ایک نہایت اہم اور ضروری خط کا مسودہ کر رہا تھا کہ مولانا محمد عرفان صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ کیا آپ کے پاس آج کوئی اطلاع شوکت

صاحب کے لڑکے شاہد علی کی صحت کے متعلق ان کے پاس آئی ہے؟ میں نے کہا نہیں آج تو کوئی اطلاع نہیں آئی۔ زاہد علی کا خط اتوار کو ملا تھا کہ شاہد صاحب کی صحت جو عرصے تک شفاخانہ میں رہنے کے بعد بہتر ہو گئی تھی۔ وہاں سے آجانے کے بعد پھر بگڑ گئی ہے۔ اور روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ اس لئے میں نے عثمان صاحب سے کہدیا تھا کہ اتوار گذرتے ہی تار دیکر خیریت دریافت کرالیں لیکن چونکہ وہ بھول گئے تھے۔ اس لئے میں نے ابھی خود ہی ایک تار شوکت صاحب کو دیا ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کے پاس ان کا ایک خط آیا تھا جسے میں نے کل شب ہی کو سنا۔ اس میں لکھا تھا کہ خود ان کو بھی حرارت ہے۔ میں نے تحریک کی ہے کہ وہ خود بھی دہلی تشریف لے آئیں۔ ہم یہاں ۱۵۔ اگست کو جلسہ شوریٰ کر رہے ہیں۔ وہ بھی خلافت کمیٹی کی مجلس عاملہ کا جلسہ حسب تجویز اراکین دہلی اسی زمانے میں یہاں کر دیں اور کم از کم شاہد صاحب کو تو ڈاکٹر انصاری کے ہمراہ دہلی بھیجدیں اس پر مولانا عرفان نے فرمایا کہ ابھی ایک صاحب نے دفتر جمعیۃ العلما کے نیچے کھڑے ہو کر مجھے پکارا اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کو بھی اسکی خبر ہے یا نہیں۔ مجھے ایک نہایت ہی دردناک خبر ملی ہے کہ آج صبح کے چار بجے مولانا شوکت علی کے صاحبزادے شاہد علی صاحب کا انتقال ہو گیا! میں نے کہا کہ مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی، آپکو کہاں سے اطلاع ملی؟ اس پر ان صاحب نے فرمایا کہ خیر جانے دیجئے۔ اب اس کے دریافت کرنے سے کیا حاصل۔ خبر غلط ہو گی۔

مولانا محمد عرفان صاحب کا بیان ہے کہ اس پر میں نے اسکی طرف توجہ نہ کی کہ یہ صاحب کون ہیں اور کہاں گئے۔ سیدھا دفتر خلافت کے پاس

آیا اور آپ سے ٹیلیفون پر خیریت دریافت کی۔ نہ معلوم وہ صاحب کون تھے
کہاں سے انہیں یہ خبر ملی تھی اور وہ کہاں چلے گئے۔

اس کے بعد میں نے بمبئی کو ٹیلیفون کرنا چاہا۔ مگر معلوم ہوا کہ لائن خراب
ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک درست ہو جائیگی۔ مجبور ہو کر جو تار بمبئی
کو بھجوانے کے لئے تار گھر بھیج چکا تھا اسکو ایکسپرس یعنی فوری کرایا۔ اور اسوقت
سے جواب کے اشد انتظار کی تکلیف برداشت کرتا رہا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک صاحب نے جنہوں نے اپنا نام امین الدین
بتایا ٹیلیفون پر خود شوکت صاحب کی خیریت دریافت کی۔ اور میرے استفسار
پر فرمایا کہ یہاں مٹیا محل میں تو افواہ اڑ رہی ہے کہ مولانا شوکت علی نے انتقال
فرمایا۔"

میں نے جواب دیا کہ "مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی، البتہ ان کے صاحبزادے
شاہد صاحب کے متعلق ایک صاحب نے مولانا عرفان صاحب کو یہ اطلاع
دی تھی کہ آج صبح کو چار بجے ان کا انتقال ہو گیا۔"

میں یہ کہنا بھول گیا کہ میں نے عرفان صاحب کا ٹیلیفون ملنے کے بعد
ہی دہلی کے تار گھر سے ٹیلیفون پر دریافت کیا تھا کہ "میرے نام بمبئی سے کوئی
تار تو آج نہیں آیا ہے؟"، ممکن ہے کہ آیا ہو مگر تار کا چپراسی اب تک اُسے
یہاں نہ لا سکا ہو، اور تار گھر ہی سے شاہد صاحب کے انتقال کی خبر شہر میں
پھیل گئی ہو۔ مگر تار گھر سے اطلاع ملی کہ کوئی تار میرے نام نہیں آیا ہے۔
ہم میں سے کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ اگر یہ واقعہ آج ہی صبح کے

چار بجے کا ہے تو بمبئی سے کسی صاحب کو اتنی جلد اطلاع کیسے مل گئی۔

اسی شام کو میری بہن اور میری بھانجی اور خود شوکت صاحب کی صاحبزادی رامپور سے آگئیں۔ شاہد صاحب کی علالت کے متعلق وہاں بھی خطوط موصول ہوئے تھے۔ لیکن کوئی اطلاع ایسی نہیں ملی تھی جس سے قیاس کیا جاسکے کہ حالت بہت نازک ہے۔ تاہم اطمینان قلب اب بھی نصیب نہ ہوا۔

دن بھر رات بھر تار کے جواب کا انتظار کیا۔ مگر جب صبح تک کوئی جواب نہ ملا تو پھر ٹیلیفون والوں سے پوچھا کہ اب بھی بمبئی کی لائن صاف ہوئی یا نہیں؟ تو جواب ملا کہ ہاں اب لائن صاف ہے تو فوراً "ٹرنک کال"، کی گئی۔ کچھ عرصہ بعد جواب ملا کہ بمبئی سے بات کیجئے، لیکن بات کرنا چاہی تو کچھ جواب نہیں ملا۔ اور ٹیلیفون والوں نے کہا کہ ذرا صبر کیجئے ہم ابھی آپ کو پھر ٹیلیفون کریں گے

ع قہر درویش بجان درویش

اور صبر کیا گیا۔ مگر جب پھر ٹیلیفون آیا تو اطلاع ملی کہ چونکہ مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کے ذمہ "ٹرنک کال"، کا کچھ بقایا نکلتا ہے اس لئے آپ کا پیغام ان تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔

میں نے جواب میں عرض کیا کہ شاید قاعدہ یہ نہ ہو۔ بلکہ صرف اسی قدر ہو کہ جن صاحب پر "ٹرنک کال"، کا کچھ قرض ہو جب تک وہ اس رقم کو ادا نہ کردیں ان کے حساب میں اور کوئی پیغام ان کی طرف سے ارسال نہ ہوسکیگا یہ بیرنگ خط تو ہے نہیں، نہ محصول طلب پارسل ہے۔ پیغام تو وہ شخص بھیج رہا ہے جس کے ذمہ کوئی بقایا نہیں۔ جب وہ اپنے پیغام کے دام خود ادا کرتا ہے

تو مخاطب کا قرضدار ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ مگر جواب ملا کہ ہم مجبور ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ قرضدار نہ کوئی پیغام بھیج سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ "اس قاعدے کا بنانے والا کون ہے، اور کون اسکی اصلاح کرسکتا ہے؟" تو معلوم ہوا کہ ٹیلیفون کے چیف انجنیر صاحب ہی کا بنایا ہوا ہے اور وہی اسکی اصلاح کر سکتے ہیں۔"

اس پر میں نے شملہ پر چیف انجنیر صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ کل ماجرا سننے کے بعد ارشاد ہوا کہ "میں ایک بیحد مصروف آدمی ہوں جو کچھ کہنا ہے، اس کے بارے میں خط وکتابت کرو۔"

میں نے عرض کیا کہ مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا میں نے عرض کر دیا۔ اور اب سب کچھ آپ کے گوش گذار ہو چکا ہے، صرف اسکی ضرورت ہے کہ آپ حکم صادر فرمادیں۔ اگر ابھی کچھ اور غور کرنیکی ضرورت ہو تو فرصت کے وقت مزید غور فرمالیں اور جواب باصواب سے سرفراز فرمادیں۔"

میں نے ایکسپرس تار کا ۲۴ گھنٹے تک جواب نہ پاکر، اور اس عرصہ میں ٹیلیفون کی لائن درست ہو جانے کی خبر پاکر ٹیلیفون کرنا چاہا، یہ صرف کثیر صرف اپنے اطمینان قلب کے لئے برداشت کر رہا ہوں۔ خط وکتابت میں مدت گذر جائیگی۔ اس کا کچھ جواب نہ ملا۔ اور ٹیلیفون والوں سے اطلاع ملی کہ اس "بیحد مصروف آدمی" نے جواب دینا بھی گوارا نہ کیا اور ٹیلیفون کا سلسلہ خود ہی منقطع کر دیا۔

مجھے انگریزی عمال حکومت کا بہت کافی تجربہ ہے اور اس تلخ تجربہ کے

باعث ہمیشہ میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان سے نہایت احتیاط کے ساتھ گفتگو اور خط و کتابت کرنی چاہیئے، تاکہ غلطی ہو تو صاف اپنی ہی غلطی معلوم ہو، ذرا بھی خلط بحث نہ ہونا چاہیئے۔

اسلئے میں نے ایک بار پھر شملہ کو ٹیلیفون دینے کا خرچ برداشت کیا اور چیف انجنیر صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور گفتگو کا سلسلہ یونہی منقطع فرما دیا۔ مجھے خود آپ کا وقت لینا درکار نہیں ہے۔ میں تو نہایت اشد انتظار کا جلد سے جلد خاتمہ کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو بھی ٹیلیفون ہی پر تکلیف دی، لیکن اس بار بھی وہی خط و کتابت پر اصرار کیا گیا، میں نے عرض کیا کہ نہ معلوم آپ ٹیلیفون پر گفتگو کرنیکو کیوں اپنی ہتک عزت سمجھتے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے عمال حکومت سے ٹیلیفون پر گفتگو کی ہے۔ آپ ایک Public servant (پبلک خادم) ہیں۔"

یاد رہے کہ یہ لفظ خود سرکار انگلشیہ کا قبول کردہ ہی نہیں، ایجاد کردہ ہے اور عمال سلطنت میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تناسب انکی تنخواہوں، ترقیوں، پنشنوں، رخصتوں، جہاز کے کرایوں وغیرہ کے متعلق تحقیقات کرکے سفارش کرنے کے لئے بھی جو کمیشن ملک معظم کی طرف سے مقرر کئے گئے وہ بھی "پبلک سروس کمیشن" کہلائے۔ اور اب جو مستقل کمیشن اس کام کے لئے موجود ہے وہ بھی "پبلک کے خادموں" کے لئے ہے۔ ان الفاظ سے ہتک عزت نہیں ہوتی۔ چیف انجنیر صاحب تو حکومت کے ارکان میں بھی داخل نہیں ریل، اور "ڈاک" اور "تار" اور "ٹیلیفون" "حکومت" کے محکمے نہیں تو حکومت

ان "خدمتوں" کے لئے "اجارہ دار" بن گئی ہے۔ ان "خدمتوں" کو اگر "حکومت" بھی انجام دے تو از روئے قانون اس کے فرائض اور اس کے حقوق بالکل اسی قسم کے ہیں جس قسم کے فرائض و حقوق گاڑیوں اور تانگوں اور ٹیکسیوں کے چلانے والوں کے ہیں۔ یا ریل کے قلیوں کے۔ ولایت میں تو میسنجرز (پیغام رسانوں) کی کمپنیاں بھی ہیں جو اجرت پر خط اور پارسلیں لاتے اور لیجاتے ہیں۔ اور سامان ڈھونے والوں کی بھی کمپنیاں ہیں۔ اگر اجرت پر ایک اونٹ گاڑی چلانے والا۔ یا چھکڑا چلانیوالا، یا ٹھیلہ والا۔ یا سامان ڈھونے والا قلی یا مزدور اسوقت کے لئے جس وقت کے واسطے اُسے اُجرت دی جائے اُجرت دینے والے کا خدمت گذار ہے تو ریل۔ ڈاک، تار۔ اور ٹیلیفون کا ہر عہدہ دار بھی جسے ان کی آمدنی میں سے بڑی سے بڑی تنخواہ بھی ملے، اس پبلک کا جس کے ذریعہ سے یہ آمدنی ملتی ہے خدمت گذار ہے۔ مگر ہندوستان میں جو انڈین سول سروس ہے وہی حقیقتاً یہاں "قیصر ہند" ہے۔ فرانس کے مشہور ادیب والٹیر نے خوب کہا تھا کہ اب تو "ہولی رومن ایمپائر" (مقدس رومی سامراج) نہ "ہولی" (مقدس) رہا، نہ "رومن" (رومی) رہا نہ "ایمپائر" (سامراج) ہی رہا۔ میں نے بھی اسکی تقلید کر کے ایک بار لکھا تھا کہ انڈین سول سرونٹس نہ تو "انڈین" (ہندوستانی) ہیں نہ "سول" ہیں ("فوجی" کے خلاف "ملکی" اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آنے والے کے خلاف، خوش اخلاقی سے پیش آنے والے" دونوں کا ہم معنی) نہ سرونٹس (ملازم) ہی ہیں (یعنی آقا بن بیٹھے ہیں۔ انہیں کے اسوۂ سیئہ کا اتباع ان سے کم درجہ کی

ملازمتوں والے کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے چیف انجنیر صاحب کو جب یاد دلایا گیا کہ وہ بھی پبلک کے ایک خادم ہیں تو انہوں نے جواب دیئے بغیر ٹیلیفون پھر بند کر دیا۔

اب میرے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے اسی وقت ٹرنک کال کے ذریعے سے ڈائرکٹر جنرل ڈاک و تار سے جو شملہ پر تھے گفتگو کی اور ان کو سارا ماجرا سنایا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تھوڑی ہی دیر میں حالات دریافت کرکے آپ سے گفتگو کروں گا۔

بعض ان حضرات سے جو اس منصب جلیلہ پر فایز رہ چکے ہیں میرے نہایت ہی قریبی اور عمدہ تعلقات رہ چکے ہیں۔ لیکن جو صاحب آج اس منصب پر ہیں افسوس ہے کہ ان سے میں بالکل واقف نہیں۔ تاہم ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے ماتحت چیف انجنیر کی طرح نہیں فرمایا کہ میں ایک "بیحد مصروف آدمی" ہوں۔ بلکہ ضرورت کا احساس فرما کے اسیوقت تحقیقات کی اور پھر مجھے ٹیلیفون دیکے فرمایا کہ قاعدہ وہی ہے جو ٹیلیفون والوں نے مجھے بتلایا تھا لیکن اگر میں مرکزی خلافت کمیٹی کی طرف سے وہ رقم ادا کر دوں جو ان کے ذمہ نکلتی ہے تو فوراً ٹیلیفون پر بات کر سکتا ہوں۔ میں اس پر بھی راضی تھا اور میں نے یہی کیا۔ مگر میں نے ان سے عرض کیا کہ یہ قاعدہ نہایت غیر معقول ہے اسکی اس طرح اصلاح ہونی چاہئے کہ اگر کسی ٹیلیفون رکھنے والے کے ذمہ "ٹرنک کال" کی بقایا نکلے جو مدت مقررہ کے اندر اندر ادا نہ ہو تو اس کو پھر اپنے حساب میں "ٹرنک کال" کرنے کی اجازت نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی

دوسرا شخص جو "ٹرنک کال" کی رقم بیباک کر چکا ہو کسی شخص سے بات کرنا چاہے تو اسکو اجازت ہونی چاہیے"

مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے عمال حکومت کے انداز سے اس تجویز اصلاح کو فوراً رد فرما دیا۔ اور کہا کہ آپ کے کہنے سے ہم قاعدہ نہیں بدل سکتے۔ ہمارے نزدیک یہ قاعدہ بہت اچھا ہے۔ لوگوں کو اپنی ٹرنک کا بل جلد ادا کرنا چاہیے" میں نے عرض کیا کہ جو اپنی ٹرنک کا بل ادا کر چکا ہو آج اسکو تکلیف ہو رہی ہے نہ کہ اسکو جس نے اپنا بل ادا نہ کیا ہو، اور پھر بھی آپ اس قاعدے کو معقول کہتے ہیں۔ خیر اگر آپ میری اس گزارش پر قاعدے کو نہیں بدل سکتے تو پھر شاید اسمبلی کے ذریعہ سے یہ بدلا جائے۔ میں تو ایک غریب نان کوآپریٹر ہوں۔ حکومت کے ساتھ تعاون کو سات برس ہوئے کہ ترک کر دیا تھا۔ مگر ریل۔ ڈاک، تار۔ ٹیلیفون حکومت کے محکمے نہیں۔ پبلک کی خدمت کرنیوالی کمپنیاں ہیں۔ دام دیتا ہوں خدمت کراتا ہوں۔ مگر آپ چاہتے ہیں کہ ان کا بھی مقاطعہ کیا جائے" نئے ڈائرکٹر جنرل صاحب اس سے ذرا پسیجے۔ اور میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ سے چلتے چلتے فرمایا کہ اچھا مجھے اس قاعدے کے بارے میں ایک خط ضرور لکھ دیجئے گا۔ اور نہایت تپاک سے رخصت ہوئے۔

میں انشاءاللہ جلد اس غیر معقول قاعدے کی ترمیم کے متعلق ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں گا۔ اور امید ہے کہ وہ جلد بدل دیا جائیگا۔ لیکن ضرورت اسکی ہے کہ جناب چیف انجنیر صاحب بہادر کو بھی سمجھا دیا جائے

کہ وہ پبلک کے ملازم اور خادم ہیں، ضرورت سے زیادہ مخدوم بننے کی کوشش نہ فرمائیں۔ جو لوگ ان سے ٹیلیفون پر بات کرتے ہیں ممکن ہے کہ اُن سے بھی زیادہ "مصروف آدمی" ہوں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب وفد خلافت ۱۹۲۰ء میں یورپ گیا تھا تو مجھے ایک بار لندن میں ضرورت ہوئی کہ وزیر ہند سے وفد کی ملاقات کے بارے میں کچھ دریافت کروں۔ چنانچہ میری طرف سے میرے عزیز دوست مسٹر ہارنیمن نے مسٹر براؤن وزیر ہند کے پرائیویٹ سکریٹری صاحب کو ٹیلیفون دیکر وہ بات دریافت کرنا چاہی مگر براؤن صاحب نے ٹیلیفون پر بات کرنے سے انکار کر دیا۔

اسیوقت مسٹر ہارنیمن نے ان کو اسقدر جھڑکا کہ بیچارہ بوکھلا گیا اور اسی وقت معافی مانگی۔ اور اس کا پوری طرح اعتراف کیا کہ وہ پبلک خادم ہیں اور پبلک کو حق ہے کہ ان سے ٹیلیفون پر گفتگو کرے۔ یقیناً پبلک کو یہ حق نہیں ہے کہ مصروف عمّال کا وقت بار بار اور فضول باتوں کے لئے یا ان باتوں کے لئے ٹیلیفون کرکے ضائع کرے جو خط و کتابت سے بھی طے ہو سکتی ہیں۔ اور جن کے جلد طے کرنے کی کوئی اشد ضرورت نہ ہو۔ چنانچہ ساری عمر میں میں نے ان عمّال کے ساتھ ٹیلیفون پر دس پندرہ بار سے زیادہ باتیں نہ کی ہوں گی اور گو ان میں سے بڑے بڑے عہدہ داروں کے ساتھ باتیں کرنے کی ضرورت پڑی لیکن اسیوقت ان کو ٹیلیفون کیا گیا جب کوئی اشد ضرورت واقع ہوئی اور زیادہ تر تو مساجد کی شکست و ریخت، فتنہ انگیز پمفلٹوں کی اشاعت

اور دل آزار سینما فلموں کی نمایش وغیرہ ہی کے متعلق اسکی ضرورت پیش آئی
اور بحمداللہ فتنہ وفساد کے روکنے میں چند منٹوں کی ٹیلیفون پر گفتگو کے ذریعے سے
پوری پوری کامیابی حاصل ہو گئی۔ اس بار کوئی پبلک خدمت مقصود نہ تھی۔ لیکن
جس ذاتی پریشانی میں میں گرفتار تھا اسکا بھی تقاضا تھا کہ چیف انجینیر صاحب سے
ٹیلیفون والوں کو اجازت دلوا دی جائے کہ میرا پیغام مولینا شوکت علی تک پہنچنے دیں
اور جس تشویشناک خبر کی تصدیق کرنا تھی وہ اس گفتگو کے لئے جو دہلی کے ایک
ہندوستانی باشندے نے شملہ کے ایک انگریز پبلک کے نوکر سے کی بہت معقول
کافی وجہ تھی۔ اور جب تک چیف انجینیر صاحب کے دفتر میں ٹیلیفون لگا رہیگا
ہر ایسے موقعہ پر ان سے برابر گفتگو کی جایا کرے گی اگر وہ اس قدر مصروف آدمی
ہیں کہ کسی کی بات ٹیلیفون پر سننا نہیں چاہتے تو یا تو ٹیلیفون کو اپنے دفتر سے
خارج فرمادیں، یا بحد مصروفیت کے وقت "ریسیور" کو اتار کر رکھدیا کریں۔

بہرحال جب ٹیلیفون والوں کو ڈائرکٹر جنرل صاحب کے حکم کی اطلاع
دی گئی تو تھوڑی دیر کے بعد بمبئی سے اطلاع ملی کہ ۱۹۲۷ء میں تو مرکزی خلافت کمیٹی
کے ذمہ [illegible] کی رقم نکلتی ہے۔ مگر ۱۹۲۶ء کی بھی کچھ بقایا ہے۔ میں یہ سنکر جل گیا
اور میں نے کہا کہ جب یہ نامعقول قاعدہ تمہارے محکمہ میں جاری ہے تو جن لوگوں
نے ۱۹۲۶ء کی رقم بیباق نہ کی تھی انکو ۱۹۲۷ء میں ٹیلیفون لینے ہی کی
اجازت کیسے دی گئی؟ بہرحال اگر تم لوگ چاہتے ہو جیسے کہ تمہارے
افسر اعلی ڈائرکٹر جنرل صاحب فرماتے ہیں کہ لوگ اپنے بلوں کا روپیہ جلدی جلدی
ادا کر دیا کریں۔ تو بل کی رقم بتانے میں کیوں گھنٹے لگا رہے ہو، تم بتاؤ میں ابھی ادا

دیتا ہوں۔ اس پر وہ بھی قائل ہوئے اور کہا کہ آپ ہی دید یجئے اور بات کر لیجئے۔

چنانچہ تین بار شملہ سے گفتگو کرنے کا خرچ اپنے حساب میں لکھوانے اور پھر بمبئی سے گفتگو کا خرچ بھی اسی طرح اپنے حساب میں لکھوانے اور جمعیت خلافت کی بقایا ادا کرنے اور اپنا ایک بیحد "مصروف آدمی" کا اور پھر ڈائرکٹر جنرل کا نہایت قیمتی وقت ضایع کرنے اور گھنٹوں کے انتظار کے بعد مرکزی خلافت کمیٹی کے دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اور بالآخر شوکت صاحب ٹیلیفون پر بلائے گئے۔ اور ان سے معلوم ہوا کہ وہ خود بھی بحمد اللہ زندہ سلامت ہیں اور ان کے صاحبزادے عزیزی شاہد علی بھی اور خدا کے فضل سے دونوں کی طبیعت رو باصلاح ہے۔

شاہد صاحب کو خدا سلامت رکھے اور آیندہ فروری میں ان کی شادی خانہ آبادی ہو۔ اور اگر اتنی جلد نہ ہو سکے تو بقول انہیں کے آیندہ اکتوبر یا نومبر میں ہو جائے۔ بہت سے لوگوں کی طبیعت ناساز ہوتی رہتی ہے اور ان کے اعزا و اقربا خط لکھ کر یا تار دیکر ان کی خیریت خاص ڈائرکٹر جنرل صاحب محکمہ ڈاک و تار کی وساطت سے ٹیلیفون پر بھی دریافت نہ کی گئی ہو گی۔ اب تو شاید انکی برات بھی محکمہ طیارات کے حکم سے ہوائی جہازوں پر آئے۔

اسمبلی میں ایک حادثہ

(ہمدرد۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۲۸ء)

سائمن کمیشن پر عدم اعتماد کی ایک تجویز لالہ لاجپت رائے نے مرکزی اسمبلی میں پیش کی۔ موافقت میں ۶۸ رائیں اور مخالفت میں ۶۲ رائیں شمار ہوئیں اسطرح قوم پروروں کو فتح نصیب ہوئی۔

اسمبلی میں اس حادثہ کے اختتام پر مسٹر چمن لال (نمائندہ ہندوستان ٹائمز) نے اپنا اٹیچی کیس سر بازل بلیکٹ پر پھینک مارا جو حکومت ہند کے ممبر تھے۔ انہیں اسمبلی کی پریس گیلری میں گرفتار کرلیا گیا۔ محمد علی کو یہ بات ناگوار گذری۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پرمغز مقالہ لکھا جس میں انکی قانونی موشگافیاں قابل غور ہیں۔

چمن لال نے بعد میں سر بازل بلیکٹ سے معافی مانگ لی اور اعتراف خطا کرلیا۔

۱۸۔ فروری کو پانچ بجے کے بعد سائمن کمیشن کے مقاطعہ پر اسمبلی کا مباحثہ ختم ہوا

میں اس مباحثہ کے سننے کے لئے پریس گیلری میں ۱۶ فروری کو بھی حاضر رہا۔ اور ۱۷ کو بھی۔ ۱۸ کو میری نشست پریس گیلری کے اس حصہ میں رہی جو پریزیڈنٹ صاحب کے مہمانوں کی مخصوص نشست گاہ سے جہاں مسز بیسنٹ اور مسز نائیڈو بیٹھی تھیں۔ بالکل متصل ہے لیکن بعض اوقات میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر پریس گیلری کے کسی اور حصے کی طرف بھی جا کھڑا ہو جاتا تھا۔ تاکہ کسی ایسے مقرر کو بآسانی سُن سکوں جو مجھ سے زیادہ فاصلے پر ہوتا تھا۔ اور مجھے اپنی نشستگاہ سے نظر نہیں آتا تھا۔

چنانچہ جب مسٹر کربراہوم ممبر نے لالہ لاجپت رائے کی جوابی تقریر کا جواب الجواب دیا تو میں اُٹھ کر پریس گیلری کے وسط میں چلا گیا۔ جب مباحثہ ختم ہو چکا۔ اور ووٹ لئے جانے لگے تو میں اسمبلی کے فیصلے کا وہیں کھڑا ہوا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر پریزیڈنٹ صاحب نے اعلان کیا کہ مقاطعہ کے موافق ۶۸ رائیں دی گئی ہیں۔ اور تعاون اور خیر مقدم کے موافق ۶۲ رائیں۔

اس پر اسمبلی کے اُن ممبروں کی طرف سے جو فتحیاب ہوئے تھے جوشِ مسرت کا اظہار کیا گیا لیکن ایک حد تک اس جوشِ مسرت کا اظہار کو بہت دبے طور پر درزیٹروں اور پریس کی گیلری میں بھی کیا گیا۔ اس خوف سے کہ جن ممبرانِ اسمبلی سے مجھے آل پارٹیز کانفرنس کی ایک قرارداد کے مسودہ پر گفتگو کرنا تھی کہیں وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اپنے اپنے قیام گاہ پر نہ چلے جائیں میں پریس گیلری کے وسط سے اپنی نشستگاہ کی طرف گیا جو دروازے سے بالکل قریب تھی تاکہ اپنے کاغذات کا تھیلہ وہاں سے اُٹھا کر جلد سے جلد نیچے چلا جاؤں۔ میں نے ابھی اپنا تھیلہ اُٹھایا بھی نہ تھا کہ اسمبلی کے ہال میں سے شور و غل کی آواز سنائی دی

اور میں نے مڑ کر دیکھا تو گورنمنٹ کی بنچوں کی طرف سے مختلف آوازیں آرہی تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ He has fainted (اسے غش آگیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ پریس گیلری کے بارچہ میں جہاں میں پہلے کھڑا تھا اس سے کوئی گز دوگز کے فاصلے پر بہت سے لوگ جمع ہیں جس سے مجھے خیال ہوا کہ کسی شخص کو پریس گیلری میں غش آگیا ہے۔ اس خیال سے میں ادھر جھپٹنے ہی والا تھا کہ میں نے اسمبلی کے ہال میں گورنمنٹ بنچوں کے پاس سے محمد یامین خان صاحب نامزد شدہ ممبر کی آواز سنی کہ He is the man. I have seen him.

Arrest him arrest him

(یہی آدمی ہے۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اسے گرفتار کر لو اسے گرفتار کر لو) اور اسی طرح گرفتاری کرانے کے متعلق اور آوازیں بھی اس جانب سے آئیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ دو انگریز اور ایک پولیس کا ہندوستانی افسر ایک شخص کو پکڑ رہے ہیں اور گھسیٹ رہے ہیں۔ جب اس کا چہرہ مجھے نظر آیا تو میں نے پہچانا کہ وہ ہندوستان ٹائمز کے رپورٹر چمن لال صاحب ہیں۔ اگر کوئی اجنبی ہوتا تو مجھے شبہ ہوتا کہ شاید اس نے کوئی خطرناک چیز نیچے پھینکی ہے۔ گو مجھے تعجب ضرور ہوتا کہ کسی نے ایسی کارروائی اسوقت کیوں کی جبکہ ہندوستانی قوم پروروں کو فتح نصیب ہوئی یہ کارروائی تو اسوقت قرین قیاس ہو سکتی تھی جبکہ قوم پروروں کو شکست ہوئی ہوتی۔ اور کوئی جوشیلا قوم پرور اپنی شکست پر جھنجلا کر ایسی نازیبا حرکت کر بیٹھتا لیکن مجھے یہ دیکھ کر تو اور بھی سخت تعجب ہوا کہ جو شخص پکڑا گیا وہ چمن لال صاحب ہیں۔ جن کے متعلق بعض لوگوں کو تو سی۔ آئی۔ ڈی میں ہونے تک کا شبہ تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ پریس گیلری میں اس طرح پکڑ دھکڑ ہوئی اور میں واقعات معلوم کرنے کی غرض سے فوراً اس دروازے سے نکلا جو میری نشست گاہ سے چند ہی قدم پر تھا۔

مجھے خیال تھا کہ اس کے قریب ہی وہ دروازہ بھی ہوگا، جہاں سے لوگ چمن لال صاحب کو پکڑ کر لے گئے۔ لیکن مجھے وہ دروازہ نہ ملا۔ اور جب میں برآمدے کی طرف سے ہو کر اس دروازے پر پہنچا جہاں سے لیڈیز گیلری اور ممتاز اشخاص وزیٹروں کی گیلری میں داخل ہوتے ہیں۔ تو میں نے بہت سی لیڈیز کو وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ مگر چمن لال صاحب اور ان کے پکڑنے والے وہاں نظر نہ آئے

چونکہ میرے پاس ان گیلریوں کا ٹکٹ نہ تھا اس لئے میں نے اس دروازے سے اندر داخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اور بالخصوص اسوقت جب کہ بیسیوں لیڈیاں وہاں سے نکل رہی تھیں۔ مجھے اپنے لئے راستہ نکالنا بھی مشکل ہوتا۔ اس لئے میں پریس گیلری میں واپس آیا۔ اور اپنی نشستگاہ سے اپنے کاغذوں کا تھیلا اٹھا کر نیچے اترا جہاں مسٹر ساہنی اڈیٹر اور مسٹر کوہلی منیجر ہندوستان ٹائمز ملے جن میں نے ان کے اخبار کے رپورٹر کی گرفتاری کے متعلق کہا۔ اور میں خود اسمبلی کے ایک ممبر صاحب کو لیکر پریزیڈنٹ صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا تاکہ اس طریقے پر پکڑ دھکڑ کی ان سے شکایت کروں اور درخواست کروں کہ وہ اس کے متعلق تحقیقات فرمائیں۔ پریزیڈنٹ صاحب کے سکریٹری نے مجھے اطلاع دی کہ وہ اس وقت مسٹر گریہم محکمۂ قانون ساز کے سکریٹری سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اتنے میں پنڈت مدنموہن مالوی صاحب بھی تشریف لے آئے اور جب مسٹر گریہم پریزیڈنٹ

صاحب کے کمرے سے نکل آئے، تو پہلے پنڈت جی اور پھر میں اندر بلائے گئے وہاں مجھے معلوم ہوا کہ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جرم کا ارتکاب ہوا ہے جسکی تحقیقات پولیس کر رہی ہے۔ لوگ تو باہر یہی کہہ رہے تھے کہ پریس گیلری میں سے کسی کے ہاتھ سے ایک نہایت ہی مختصر اٹیچی کیس جس میں کاغذات کے سوا کچھ نہ تھا اتفاقیہ نیچے گر پڑا ہے۔ اسکی تحقیقات تو پریزیڈنٹ صاحب کو ہی کرنی چاہئے۔ تب معلوم ہوا کہ پریزیڈنٹ صاحب کو اطلاع دی گئی ہے کہ دو گواہ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ چمن لال صاحب نے اٹیچی کیس یہ کہہ کر عمداً پھینکا ہے کہ "This is reply to Burkenhead" (یہ ہے برکنہیڈ کو جواب)۔

مجھے یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوئی۔ بلکہ اس فقرہ کو سنکر مجھے تو گمان ہوا کہ شاید چمن لال صاحب نے اسمبلی کے فیصلے کو برکن ہیڈ کے جواب سے تعبیر کیا۔ اور اٹیچی کیس کے گرنے کا حادثہ محض اتفاقیہ تھا۔ اور فرط انبساط میں واقع ہوا تھا۔ لیکن مزید تحقیقات کے لئے میں لائبریری کی طرف چلا جہاں مجھے بتلایا گیا کہ چمن لال صاحب پولیس کی حراست میں اسوقت موجود ہیں لیکن نہ وہ نیچے لائبریری کے اندر ملے نہ اسکی گیلری میں، البتہ پولیس کے ایک سپاہی کے بتلانے پر میں اور یوسف امام صاحب ممبر اسمبلی جو میرے رہنما تھے۔ ہندو لنچ روم میں گئے۔ جہاں متعدد افسران پولیس و سپاہیان پولیس کی حراست میں چمن لال صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پولیس کے سارجنٹ صاحب سے پوچھا کہ چمن لال

صاحب کو کس جرم کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے تو انہوں نے نیز دوسرے ہندوستانی
افسران پولیس نے کہا کہ ہم نہیں بتلا سکتے۔ ہم اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ میں نے
ان سے کہا کہ میں بھی اپنا فرض منصبی ہی ادا کرنے آیا ہوں۔ معلوم کرنا چاہتا ہوں
کہ مسٹر چمن لال کو کس نے گرفتار کیا ہے اور کس قانون کی رو سے گرفتار کیا ہے۔
اس کے جواب میں بھی وہ یہی کہتے رہے کہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم اپنے افسر کے
حکم کی پابندی کر رہے ہیں۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ ایک یورپین سارجنٹ
گھوڑوں کی نمائش سے مسٹر اوڈ سپرنٹنڈنٹ کو بلانے گیا ہے۔ ان کا انتظار ہے

اس عرصہ میں مسٹر ساہنی ایڈیٹر [illegible] ہندوستان ٹائمز، مسٹر رفیع
قدوائی، اور چند دیگر حضرات بھی اسی کمرے میں آ گئے۔ جہاں میں اور مسٹر
یوسف امام صاحب، چمن لال صاحب اور افسران وسپاہیان پولیس کے پاس
بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری موجودگی ہی میں چمن لال صاحب نے اپنی اچکن کی جیب سے
ایک بڑا سا چاقو نکال کر دکھایا اور کہا کہ اگر مجھے کسی پر حملہ کرنا منظور ہوتا تو میں یہ چاقو
کھول کر اس پر نہ پھینکتا۔ یہ تو محض ایک اتفاقیہ امر تھا۔ اور [illegible]
نہ تھا۔ ایک اسمبلی کے ممبر کے سکرٹری کا تھا جس کے پاس میں کھڑا تھا۔ اس پر وہ
چاقو یورپین سارجنٹ نے چمن لال صاحب سے لے لیا اور ان کی جامہ تلاشی لی
اور چاقو کے علاوہ جو چیزیں بھی ملیں وہ ان کو واپس کر دیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ
انتظار کے بعد مسٹر اوڈ آئے اور انہوں نے چمن لال صاحب سے ان کا نام دریافت
کیا۔ مگر اس کے سوا ان سے ایک حرف بھی نہ پوچھا۔ اور باہر برآمدے کے [illegible]
چلے گئے تاکہ دو یورپین گواہوں سے حالات دریافت کریں۔ ہم لوگ ان کی

واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ مگر جب تقریباً پون گھنٹہ گذر گیا اور وہ واپس نہ آئے تو میں نے مسٹر یوسف امام صاحب سے کہا کہ آپ جاکر کچھ خبر لائیے کہ کیا ہو رہا ہے وہ کچھ عرصے بعد آئے اور انہوں نے کہا کہ پریس گیلری میں ان گواہوں کے بیانات قلم بند کرائے جا رہے ہیں۔ اور مسٹر اوڈ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تحقیقات کس وقت ختم ہو گی اور چمن لال صاحب کے متعلق وہ کس وقت فیصلہ کر سکیں گے۔ تب میں بھی پریس گیلری کی طرف گیا۔ اور وہاں دیکھا کہ تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری منگوائے گئے ہیں۔

کچھ دیر بعد مسٹر اوڈ پریس گیلری سے نکلے تو میں نے بھی ان سے دریافت کیا کہ تحقیقات کب تک جاری رہیگی۔ چمن لال صاحب کے متعلق کب بتلایا جائیگا کہ ان کو کس جرم میں ماخوذ کیا ہے؟

اس پر یہ جواب ملا کہ تحقیقات دو ایک دن اور جاری رہیگی، اور وہ نہیں کہہ سکتے کہ چمن لال صاحب کے متعلق کیا کارروائی کی جائے گی۔ تب جو کچھ میں اس واقعہ کے متعلق اوپر لکھ آیا ہوں وہ میں نے ان سے بیان کیا تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ بھی شاہد ہیں؟ جس کے جواب میں میں نے کہا کہ صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں جو میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے اٹیچی کیس کے گرنے یا پھینکنے کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ اس گفتگو کے کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد جس میں مسٹر اوڈ، سردار جیت سنگھ رائے بہادر ایف کے سب انسپکٹر اور غالباً مسٹر ایسار مجسٹریٹ اور مسٹر کوٹ (دفتر لیجسلیٹو ڈیپارٹمنٹ) سے گفتگو کرتے رہے۔ مسٹر اوڈ تو چلے گئے اور ہمارے استفسار کرنے پر سردار جیت سنگھ نے

کہا کہ چمن لال صاحب پر دفعہ ۳۵۳ تعزیرات بلند لگائی گئی ہے۔ وہ دو ہزار روپیہ کی ضمانت پر رہا کئے جا سکتے ہیں، چنانچہ مسٹر ساہنی اڈیٹر ہندوستان ٹائمز نے ضمانت دینے کا وعدہ کیا۔ اور انہیں کی موٹر میں چمن لال صاحب سردار جیت سنگھ رائے سینا کے تھانہ کو روانہ ہوئے۔ ضمانت کے فارم پر ضامن کے علاوہ دو گواہوں کے دستخطوں کی بھی ضرورت تھی اس لئے مسٹر یوسف امام اور مسٹر رفیع قدوائی ممبران اسمبلی بھی اسی موٹر میں تھانہ کو روانہ ہو گئے۔ میں آل پارٹیز کانفرنس کی شرکت کی غرض سے جس کے لئے ساڑھے چھ بجے کا وقت مقرر تھا آٹھ بجے اسمبلی سے روانہ ہوا۔

میں ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر تھا۔ اور یہ تمام واقعات انکو سنا رہا تھا کہ مسٹر ساہنی کی موٹر میں وہ اور چمن لال صاحب نیز مسٹر یوسف امام اور مسٹر رفیع قدوائی تھانہ رائے سینا سے واپس آئے۔

میں یہ کہنا بھول گیا کہ جب سردار جیت سنگھ، چمن لال صاحب کو تھانہ لیجا رہے تھے تو میں نے پوچھا کہ دو یورپین گواہوں کی گواہی بھی لی گئی۔ مجسٹریٹ سے بھی مشورہ کر لیا گیا۔ جرم کی دفعہ بھی لگا دی گئی۔ اور ضمانت کی رقم بھی مقرر کر دی گئی۔ لیکن چمن لال صاحب کا اب تک کسی نے بیان نہیں لیا کیا ان کا بیان بھی لیا جائیگا یا نہیں؟ جس پر سردار صاحب نے کہا کہ ضمانت لیتے وقت ان کا بیان بھی لیا جائیگا۔

دفعہ ۳۵۳ مجموعہ قوانین تعزیرات ہند حسب ذیل ہے:۔

"جو کوئی شخص کسی شخص پر، جو سرکاری ملازم ہے۔ جبکہ وہ

ملازم بحیثیت اپنی سرکاری ملازمی کے اپنی خدمت منصبی انجام
دے رہا ہو، حملہ یا جبر مجرمانہ کرے یا اس نیت سے کہ اُس
ملازم کو اسکی ملازمی کی حیثیت سے اسکی خدمت منصبی کی انجام
دہی سے روکے، یا ڈرائے، حملہ، یا جبر مجرمانہ کرے، یا بہ سبب
کسی امر کے جو اس شخص نے اپنی سرکاری ملازمی کی حیثیت سے
خدمت منصبی کی انجام دہی جائز میں کیا ہو، یا کرنیکا اقدام
کیا ہو، حملہ یا جبر مجرمانہ کرے تو شخص مذکور کو دونوں قسموں میں
سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائیگی۔ جسکی میعاد دو برس تک ہو سکتی
ہے۔ یا جرمانہ کی سزا، یا دونوں سزائیں دی جائینگی۔ ،،

ضابطہ فوجداری کی رو سے اس جرم کا ملزم بلا وارنٹ کے بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے،
ملزم کے نام سمن نہیں نکالا جاتا۔ بلکہ وارنٹ جاری کیا جاتا ہے لیکن ضمانت لی جاتی
ہے۔ باہمی سمجھوتہ سے معاملہ طے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مقدمہ ضرور چلایا جاتا ہے اور
مجسٹریٹ درجہ اول یا دوم کی عدالت میں چلایا جاتا ہے۔

قارئین کرام غور فرمائیں کہ اگر اینٹ کیس اتفاقیہ نہ بھی گرا ہوتا، بلکہ
عمداً پھینکا جاتا۔ اور کسی ایسے اسمبلی کے ممبر کے سر پر گرتا جو سرکاری ملازم نہیں ہے
تو ملزم پر دفعہ ۳۵۲ لگائی جاتی۔ اور ملزم کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کرنیکا حق
نہ ہوتا۔ وہ محض سمن کے ذریعے عدالت میں طلب کیا جاتا۔ باہمی رضامندی سے
معاملہ طے ہو سکتا۔ اور اگر عدالت میں مقدمہ چلایا بھی جاتا تو تین ماہ سے زیادہ
کی قید یا پانچسو روپے سے زیادہ جرمانہ کی سزا نہ دی جا سکتی۔ لیکن چونکہ اینٹ کیس

سر بازل بلیکٹ فنانس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا پر گرا اس لیے بجائے دفعہ ۳۵۲ کے دفعہ ۳۵۳ لگائی گئی جسکی سزا دفعہ ۳۵۲ کی سزا سے آٹھ گنی ہے اور بلا وارنٹ بھی ملزم کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ ملزم کی گرفتاری کا حکم محمد یامین خاں صاحب غیر سرکاری، مگر سرکار کی طرف سے نامزد شدہ ممبر اسمبلی نے دیا یا ان کے اور ہمنواؤں نے جن میں سے ایک بھی اس حکم کے دینے کا مجاز نہ تھا۔ اور چمن لال صاحب کو سب سے پہلے کسی پولیس افسر نے گرفتار نہیں کیا بلکہ پریس گیلری میں بیٹھنے والے دو یورپینوں نے کیا جن میں سے ایک غالباً کلارک تھے اور دوسرے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ انسپکٹر صاحب نے ان کے بعد دست اندازی کی دفعہ ۵۴ (الف) (ایک) کی رو سے ایک پولیس آفیسر کسی مجسٹریٹ کے حکم یا وارنٹ کے بغیر بھی صرف اسی شخص کو گرفتار کر سکتا ہے جو کسی ایسے جرم میں ملوث ہو جو جدول ۲ میں ان جرائم میں شامل ہو جن کے ملزم کو بلا وارنٹ گرفتار کیا جا سکتا ہے اور دفعہ ۵۹ کی رو سے پرائیویٹ اشخاص صرف اسی شخص کو گرفتار کر سکتے ہیں جو ان کے دیکھتے ہوئے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کرے جو ناقابل ضمانت ہو۔ اور جس میں بلا وارنٹ کے بھی پولیس ملزم کو گرفتار کر سکتی ہو۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ دفعہ ۳۵۳ کا جرم بھی ناقابل ضمانت نہیں لیکن پریس گیلری میں دو یورپینوں نے ایک ہندوستانی کو اسی وقت گرفتار کر لیا حالانکہ دفعہ ۵۹ کی رو سے ان کو اس کا مطلق اختیار نہ تھا۔ لیکن چونکہ بعد میں ایک پولیس کے افسر نے بھی دست اندازی کی اس لئے شاید پرائیویٹ اشخاص

کی ناجایز دست اندازی بھی اس غیر آئینی ملک میں جائز قرار دے دی جائے لیکن کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ پولیس کو کس طرح یہ علم غیب حاصل ہو گیا کہ اگر ملزم نے اٹیچی کیس عمداً بھی پھینکا تھا تو کسی سرکاری ملازم ہی پر حملہ کرنے کی نیت سے پھینکا تھا؟

یاد رہے کہ نیت کا حال ملزم خود جانتا ہے یا علام الغیوب۔ البتہ لوگوں کے افعال سے بھی عدالتیں ان کی نیت کے متعلق قیاس کر کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرتی ہیں۔ لیکن یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ ایک نہایت مختصر سے اٹیچی کیس کے سر بازل بلیکٹ کے جسم سے چھوتے ہی اسمبلی کے نامزد شدہ غیر سرکاری اور سرکاری ممبروں نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ اٹیچی کیس محض اتفاقیہ نہیں گرا بلکہ پھینکا گیا۔ اسے چمن لال صاحب ہی نے پھینکا۔ اور ایک سرکاری ملازم ہی پر پھینکا۔ اور ٹھیک اسوقت پھینکا جبکہ وہ ملازم بحیثیت اپنی سرکاری ملازمی کے اپنی خدمت منصبی انجام دے رہا تھا۔ تاکہ اس پر حملہ یا جبر مجرمانہ کرے، یا اس نیت سے کہ اس ملازم کو اسکی ملازمی کی حیثیت سے اسکی خدمت منصبی کی انجام دہی سے روکے، یا ڈرائے، یا اس پر حملہ یا جبر مجرمانہ کرے یا بہ سبب کسی امر کے جو اس شخص نے اپنی سرکاری ملازمی کی حیثیت سے خدمت منصبی کی انجام دہی جائز میں کیا ہو یا کرنے کا اقدام کیا ہو، حملہ یا جبر مجرمانہ کرے

میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ ساری کارروائی محض خرافات سے زیادہ وقعت رکھتی ہے؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اگر اٹیچی کیس عمداً پھینکا گیا تب بھی اسکا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ کسی سرکاری ملازم پر پھینکا گیا یا کسی اور پر

کیا صرف سر بازل بلیکٹ کے جسم سے اٹیچی کیس کے چھو جانے سے یہ ثابت ہو جاتا
ہے کہ ایک سرکاری ملازم پر حملہ کیا گیا؟ اگر یہ بھی ثابت ہو جائے تب بھی یہ کس طرح
ثابت ہوتا ہے کہ سر بازل بلیکٹ اسوقت بحیثیت اپنی "سرکاری ملازمی" کے اپنی
خدمت منصبی انجام دے رہے تھے؟ اگر ان پر کوئی چیز اسوقت پھینکی جاتی جبکہ وہ
ایک سرکاری ممبر کی حیثیت سے تقریر فرما رہے تھے تو یہ گمان ہو بھی سکتا تھا کہ ان پر
اس نیت سے حملہ کیا گیا ہے کہ وہ خایف ہو کر اپنی تقریر بند کر دیں لیکن جب
وہ تمام مباحثہ ختم ہو چکا۔ رائے شماری کر لی گئی۔ گورنمنٹ کی شکست کا اعلان
بھی کر دیا گیا۔ اور اس کا بھی گمان باقی نہیں رہا کہ کسی قوم پرور نے شکست
کھا کر جھنجلاہٹ میں ایسا نازیبا فعل کیا ہو۔ اسوقت ایک اٹیچی کیس پریس
گیلری میں سے گر جانے اور گیلری کے نیچے اسمبلی ہال میں، اسمبلی کے سرکاری ممبر
کے لگ جانے پر یہ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ چمن لال صاحب نے سر بازل
بلیکٹ پر ٹھیک اسوقت حملہ کیا کہ وہ بحیثیت اپنی سرکاری ملازمی کے اپنی
خدمت منصبی انجام دے رہے تھے۔ یا اس نیت سے کہ انکو سرکاری ملازمی کی
حیثیت سے انکی خدمت منصبی کی انجام دہی سے روکا جائے، یا ڈرایا جائے،
یا بہ سبب کسی ایسے امر کے ان پر حملہ کیا ہو جسے انہوں نے اپنی "سرکاری ملازمی" کی
حیثیت سے خدمت منصبی کی انجام دہی جایز میں کیا ہو، یا کرنیکا اقدام کیا
ہو؟ کیا یہ قوم پروروں کی شکست پر قوم پرور کی جھنجلاہٹ کا اظہار ہے، یا
حکومت، یا حکومت پرستوں کی شکست پر ان کی جھنجلاہٹ کا اس طرح بات
کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ چمن لال صاحب کی گرفتاری بالکل خلاف قانون تھی۔ اگر وہ ۳۵۳ کے مجرم بھی ہیں تب بھی سوائے پولیس کے ان کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ کیونکہ دفعہ ۵۹ ضابطہ فوجداری کی رو سے پرائیویٹ اشخاص اسی وقت کسی کو گرفتار کر سکتے ہیں جب کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ناقابل ضمانت جرم کا ارتکاب ہوا ہو۔ اور دفعہ ۳۵۳ کا جرم ناقابل ضمانت نہیں بلکہ قابل ضمانت ہے اور ضمانت ہو بھی گئی۔

جن دو یورپین اشخاص نے انہیں گرفتار کیا وہ خود دفعہ ۳۴۹ کی رو سے جرم "مزاحمت بیجا" کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن پولیس بھی اس جرم سے نیز "حبس بیجا" کے جرم سے نہیں بچ سکتی۔ اس لئے کہ محض اس وجہ سے کہ اٹیچی کیس سر بازل بلیکٹ ایک سرکاری ملازم کے جسم پر لگا۔ پھر اس وقت لگا جبکہ وہ بحیثیت اپنی "سرکاری ملازمی" کے کوئی بھی خدمت منصبی انجام نہیں دے رہے تھے۔ ملزم پر دفعہ ۳۵۳ نہیں لگائی جا سکتی ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب اس "مزاحمت بیجا" اور "حبس بیجا" کی شکایت اسمبلی کے پریزیڈنٹ صاحب سے کی گئی تو پولیس کو سوائے اسکے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ چمن لال صاحب پر ایک ایسی دفعہ لگائی جائے جس میں پولیس کو بلا وارنٹ کے بھی گرفتار کرنیکا اختیار رہے۔ اور اسی لئے گھنٹوں کی تحقیقات کے بعد، اور مجسٹریٹ سے مشورہ کرکے، اور مجموعہ قوانین ضابطہ فوجداری کی جلدوں کو منگوا کر اور ان کی خوب ورق گردانی کے بعد دفعہ ۳۵۳ لگائی گئی۔

جائز کارروائی صرف اس قدر تھی کہ پولیس اسی وقت پریس گیلری میں واقعہ کی تحقیقات کرتی۔ اور چمن لال صاحب کا بیان اور ان کا پتہ لے کر انکو چھوڑ دیتی۔

لیکن لطف یہ ہے کہ جس بیان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی وہی اسمبلی کی عمارت میں رات کے ۹ بجے تک بھی نہیں لیا گیا۔ اور اسکے عوض گھنٹوں تک تمام کارروائیاں کیجاتی

رہیں جو چمن لال صاحب کی گرفتاری کو جرم "مزاحمت بیجا" اور جرم "حبس بیجا" کے حدود سے نکالنے کے لئے پولیس کو ضروری معلوم ہوئیں حقیقتاً یہ ایک ایسی ناجائز و ناشائستہ کارروائی ہے کہ اسمبلی کے پریزیڈنٹ کو خود بھی اسکے متعلق تحقیقات کرنی چاہیئے۔

آج چمن لال صاحب کو اس طرح گرفتار کیا گیا۔ کل کو یہی کارروائی مسٹر کے۔ سی۔ رائے یا اس خاکسار کے ساتھ کی جائیگی۔ اس طرح پکڑ دھکڑ کے لئے صرف اسی کی ضرورت ہے کہ پریس گیلری سے کسی سرکاری ممبر کے سر پر کسی صحیفہ نگار کا قلم یا پنسل یا اسکی کاپی یا اس کا بیگ گر پڑے۔ صرف یہی وجہ ہے کہ میں نے اس واقعہ میں اتنی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ میں خود ایک صحیفہ نگار ہوں اور نہیں چاہتا کہ میرے ہم پیشہ لوگوں کی اس طرح تذلیل کی جائے ورنہ میں اسے ایک نہایت ہی قبیح اور قابل نفرت فعل سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص کسی ممبر اسمبلی پر ایک تنکا بھی عمداً پھینکے۔

مجھے سر بازل بلیکٹ کے ساتھ پوری ہمدردی ہے اور مجھے یہ سنکر مسرت ہوئی کہ ان کے کوئی چوٹ نہیں آئی۔

اس حادثہ کے بعد جو سال گذشتہ میں پیش آیا تھا جب کہ کمانڈر انچیف صاحب کے قریب ہی اسمبلی کی چھت کی ایک اینٹ اوپر سے گری تھی۔ اور نیز تازہ ترین حادثہ کے بعد جبکہ چند روز ہوئے اسی چھت پر سے پلاسٹر کا ایک ٹکڑا کرنل گڈنی کی نشست کے پاس آ گرا تھا۔ سر بازل بلیکٹ کا اٹیچی کیس کے ان پر گر جانے سے متردد ہونا ایک فطرتی امر تھا لیکن انہیں غش ہرگز نہیں آیا تھا۔ اور انہوں نے اسی وقت سب کو مطمئن کر دیا تھا کہ انکی حالت قابل اطمینان ہے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ خود اس ذرا سے حادثہ کو ایک سنگین جرم نہ بننے دیں گے اور بات کا بتنگڑ نہ بنایا جائیگا۔